جماعت اسلامی کی خطرناک ڈکٹیٹر شپ پر طلوع اسلام
کا بے لاگ تبصرہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ ۲۵ بی، گلبرگ لاہور

نام کتاب	------	مزاج شناس رسول ﷺ
پبلشر	------	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	------	25-B گلبرگ II لاہور 54660
	------	فون 576 4484
طابع	------	دوست ایسوسی ایٹس
	------	الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 54000
	------	فون 712 2981
مطبع	------	عصمت اسلم پرنٹرز
ایڈیشن	------	دوم 1996ء (بلا ترمیم)

طلوع اسلام ٹرسٹ کی شائع کردہ کتب کی
جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

اس مجموعہ میں اگرچہ جماعتِ اسلامی کی حقیقت کو بے نقاب
کیا گیا ہے، لیکن چونکہ یہ جماعت دراصل عبارت ہے
ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے خیالات وعزائم سے،
اس لئے اُن کی رعایت سے اس مجموعہ کا نام
"مزاج شناسِ رسول" رکھا گیا ہے۔
یہ اصطلاح خود اُنہی کی وضع کردہ
ہے اور ان کے دستِ راست
امین احسن صاحب اصلاحی
کے بیان کیمطابق اس سے
مُراد خود مودودی
صاحب
ہیں۔

فہرستِ مشمولات

نمبر شمار — صفحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

انیسویں صدی کے آخر میں، ہندوستان میں مسلمانوں کی محکومیت اور مغلوبیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے مشنری پادریوں اور آریہ سماجی پنڈتوں نے اسلام اور رسول اکرم صلعم کے خلاف اعتراضات کا ایک طوفان اٹھا رکھا تھا اور مسلمان اُن کی ان منظم مناظرانہ کوششوں سے تنگ آچکے تھے۔ قادیان کے مرزا غلام احمد صاحب نے (جو اس سے پہلے سیالکوٹ کی کچہری میں ملازم تھے) اس صورتِ حالات سے فائدہ اٹھایا اور اعلان کیا کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھنا چاہتے ہیں جس میں ان مخالفین کے اعتراضات کا دندان شکن جواب دیا جائے گا۔ مسلمانوں نے چاروں طرف سے اس دعوت پر لبیک کہا اور اس طرح "نہایت معصومانہ انداز سے" ایک ایسی تنظیم کی بنیاد رکھی گئی جو بعد میں مسلمانوں کے لئے ایک عظیم خطرہ بن گئی۔ اس تنظیم کے ابتدائی مراحل میں لوگوں سے صرف اس امر کی بیعت لی جاتی تھی کہ میں دین کو دنیا پر ترجیح دوں گا۔ اس بیعت میں خالصتہً للّٰہیت اور جذبۂ دین کی سرشاری نظر آتی تھی اِس لئے اگر کسی نے اُس وقت یہ کہا کہ اِس جماعت سازی میں کچھ

خطرات نظر آتے ہیں تو لوگ عام طور پر اُس کے پیچھے پڑ گئے اور کسی نے نہ سوچا کہ اس بیج سے پیدا کیا ہونے والا ہے۔ اب مسلمان رو رہے ہیں کہ ہم نے اس بیج کی خود ہی آبیاری کیوں کی۔

(۲) ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ہندوستانی سیاست میں مسلمانانِ ہند کے لئے ایک دام ہمرنگِ زمین بچھایا گیا جس کا نام "مُتحدہ قومیت" تھا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے اربابِ شریعت اس فریب کا شکار ہو گئے اور ہندوؤں کی ہمنوائی میں مُتحدہ قومیت کا راگ الاپنے لگے۔ اقبالؒ کی قرآنی بصیرت نے اس سحرِ سامری کو توڑا اور اُس نے مسلمان کو بتایا کہ

بِنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

آہستہ آہستہ مسلمان اس آواز پر جمع ہونے لگے اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں جب قائدِ اعظم مرحوم نے فکرِ اقبالؒ کی رہنمائی میں اس نظریہ کو ایک عملی شکل دی تو مسلمانوں میں اس کا خاصا چرچا ہو گیا۔ اُس زمانہ میں حیدر آباد (دکن) سے ماہوار مجلّہ ترجمان القرآن شائع ہوتا تھا جس کے مدیر سیّد ابوالاعلیٰ صاحب مودودی تھے۔ اس رسالہ میں انہوں نے مُتحدہ قومیت کے خلاف مقالات لکھنے شروع کئے (حالانکہ اس سے پہلے یہ قومیت پرست علماؑ کے ترجمان، اخبار "الجمعیۃ" کے ایڈیٹر رہ چکے تھے) ان مقالات سے شمالی ہند (بالخصوص پنجاب) کے مسلمانوں میں ان کی مقبولیت بڑھ گئی۔ چونکہ حیدر آباد میں رسالہ کی حالت بڑی سقیم تھی اس لئے یہ وہاں سے منتقل ہو کر پنجاب آ گئے اور پٹھان کوٹ کے قریب دارالاسلام میں مقیم ہو گئے۔ دارالاسلام، علّامہ اقبالؒ کے تصوّرات کے مطابق ایک ایسی بستی بننے والا تھا جس میں صحیح اسلامی انداز کی زندگی بسر کی جاتی۔ لیکن علّامہ

اقبالؒ ابھی وہاں پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ مودودی صاحب متحدہ قومیت کے خلاف مقالات نگاری سے مسلمانوں میں مقبول ہوتے گئے تا آنکہ انہوں نے ۱۹۴۱ء میں نہایت معصومانہ انداز سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی جس میں کہا یہ گیا کہ مسلمانوں کو سچے معنوں میں مسلمان بننا چاہیئے۔ مخلص مسلمانوں نے اس آواز پر لبیک کہا اور اس طرح جماعتِ اسلامی وجود میں آگئی۔

(۳) اگرچہ مرزا صاحب کی طرح یہ سب کچھ بڑے معصوم انداز سے کیا گیا لیکن جو لوگ سطح سے اتر کر نیچے دیکھنے کے عادی تھے انہوں نے اسی وقت بھانپ لیا کہ اس معصومیت کے پیچھے کتنے بڑے خطرات پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کو اس خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے آوازیں اُٹھیں اور مقامِ فخر و مسرت ہے کہ اُس میں طلوعِ اسلام کی آواز بھی شامل تھی۔

(۴) ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی میں یہ دور بڑا نازک تھا۔ انگریز آہستہ آہستہ بساطِ سیاست سے پیچھے ہٹ رہا تھا اور زمامِ حکومت رفتہ رفتہ خود ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آرہی تھی۔ ہندوؤں کی یہ انتہائی خواہش تھی کہ وہ اپنی کثرتِ آبادی کی بناء پر مسلمانوں کو مستقلاً اپنا محکوم بنالیں۔ اس کے لئے وہ ہر قسم کی کوششیں کر رہے تھے اور اُن کوششوں میں بدقسمتی سے مسلمانوں کے "علماء" کا طبقہ بھی اُن کے ساتھ تھا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی یہ کوشش تھی کہ انہیں ایک الگ خطۂ زمین مل جائے جس میں وہ اپنے تصوّر کے مطابق آزادی کی زندگی بسر کرسکیں۔ اس تحریک کا نام حصولِ پاکستان کی تحریک تھا۔ ہندوؤں اور اُن کے ہمنوا قومیت پرست مولویوں کی طرف سے اس تحریک کی سخت مخالفت ہورہی تھی۔ لیکن مسلمانوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ اس تحریک کی مخالفت جماعتِ اسلامی کی طرف سے بھی ہورہی ہے۔ اس جماعت کی ٹکنیک

یہ تھی کہ عوام میں اُن لوگوں کو بدنام کیا جائے جو اس تحریک کے داعی تھے اور اپنے آپ کو صالحین کی جماعت قرار دیا جائے۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی سے ان کی یہ مذموم کوششیں ناکام رہیں اور پاکستان وجود میں آگیا۔ اُس پر اس جماعت نے چولا بدلا اور جھٹ سے پاکستان میں آ ڈیرا لگایا۔

(۵) ہم چاہتے تھے کہ اُس مقام پر مختصر الفاظ میں یہ بتا دیا جائے کہ اس جماعت کے اغراض و مقاصد کیا ہیں کہ اتنے میں ہمارے سامنے اُس کمیٹی کی رپورٹ آگئی جو فسادات پنجاب کے سلسلہ میں مقرر کی گئی تھی اور جسے عام طور پر "منیر کمیٹی" کہا جاتا ہے۔ اس رپورٹ میں اس جماعت کی تخریبی کارروائیوں کو اچھی طرح سے بے نقاب کیا گیا ہے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ ان کے عزائم و مقاصد کے متعلق اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے بجائے اس رپورٹ کے الفاظ پیش کر دیئے جائیں، اس میں لکھا ہے کہ:۔

"جماعتِ اسلامی کا نصب العین بالکل واضح ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو قائم کیا جائے جس کا بالفاظِ دیگر مطلب یہ ہے کہ ایک ایسا مذہبی اور سیاسی نظام قائم کیا جائے جسے یہ جماعت اسلام کے نام سے تعبیر کرتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے یہ جماعت صرف پروپیگنڈا تک ہی اکتفا نہیں کرنا چاہتی بلکہ یہ سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے ——— آئینی ذرائع سے اور جہاں ممکن ہو قوت کے زور پر۔ جو حکومت اس جماعت کے تصور کے مطابق قائم نہ ہو...... وہ مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک شیطانی حکومت ہے اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک کفر ہے۔ اس حکومت میں جو لوگ بھی حصہ لیں۔۔۔۔۔ یا جو لوگ بطیبِ خاطر اس نظام کی اطاعت اختیار کر لیں، معصیت کوش ہیں۔ ان وجوہات کی بناء پر یہ جماعت، مسلم لیگ کے تصورِ پاکستان کی کھلی کھلی

مخالف تھی اور پاکستان کے قیام کے بعد جسے یہ ناپاکستان کہتی ہے، یہ جماعت موجودہ نظامِ حکومت اور اس کے اربابِ حل وعقد کی مخالفت کرتی ہے۔ اس جماعت کی جتنی تحریریں بھی ہمارے سامنے پیش ہوئی ہیں اُن میں مطالبہ پاکستان کی تائید میں کوئی دور کا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ اس کے برعکس یہ تحریریں..... اُس شکل کی سخت مخالفت کرتی ہیں جس میں پاکستان وجود میں آیا اور جس صورت میں یہ آج موجود ہے۔ اس جماعت کے بانی کے ایک بیان کے مطابق جو اس نے فوجی عدالت کے سامنے دیا تھا اس جماعت کا مقصد یہ ہے کہ وہ مسلح بغاوت کے علاوہ، ہر ممکن طریقے سے موجودہ حکومت کی جگہ اپنے تصور کی حکومت قائم کرے۔ یہ اپنے صدر کو امیر کہتی ہے اور اگرچہ اس کے اراکین کی موجودہ تعداد صرف نوسوننانوے ہے، اس کے وسائل نشر واشاعت اور پروپیگنڈے کی مشینری بہت وسیع ہے" (رپورٹ انگریزی ص ۲۴۳)

(۶) یہ ہیں اس جماعت کے اغراض ومقاصد۔ مرزا غلام احمد صرف مذہبی رہنما بننا چاہتا تھا۔ لیکن اِس جماعت کے امیر کے پیشِ نظر مذہبی پیشوائیت کے علاوہ مملکت کا اقتدار حاصل کرنا بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے نزدیک مذہب مقصود بالذات نہیں۔ یہ ذریعہ ہے حکومت کی کرسیاں چھیننے کا۔ مسلمانوں کے عوام مذہب پرست ہیں اور اس باب میں بڑے جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ مذہب کے متعلق وہ اتنا ہی جانتے ہیں کہ یہ مجموعہ ہے اُس وضع قطع اور رسوم وشعائر کا جن کے متعلق انہیں مولوی صاحبان بتاتے ہیں کہ وہ اصل اسلام ہے اور جن کی پابندی سچے مسلمانوں کی نشانی ہے۔ چونکہ اس وقت پاکستان کے اربابِ بست وکشاد میں اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو اس وضع قطع اور ان آئین ورسوم کے پابند نہیں ہیں اس لئے اس جماعت کو ان کے خلاف عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کا نہایت عمدہ موقع ہاتھ آگیا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے ان کی تحریروں اور تقریروں میں ہر جگہ

اسی چیز کو بار بار دُہرا کر لوگوں کے دلوں میں نفرت اور حقارت کے جذبات کو ابھارا جاتا ہے اور ان کے برعکس اپنے آپ کو صالحین کی جماعت تصور کرایا جاتا ہے۔ ہم ان ۔۔۔۔ اربابِ حل و عقد کے وکیل نہیں، نہ ہی ہمیں ان کی مدافعت مقصود ہے۔ طلوعِ اسلام خود شروع ہی سے ان کی غیر اسلامی زندگی اور غیر دانشمندانہ حکمتِ عملی کے خلاف لکھتا چلا آیا ہے۔ جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس جماعت کے ہاتھ میں یہ بڑا عمدہ حربہ آ گیا ہے جسے یہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے بڑی چابک دستی سے استعمال کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی متعدد وجوہ کی بناء پر، جن میں ملک کے اربابِ حل و عقد کے عدم تدبر اور افلاسِ سیرت و کردار کا حصہ کچھ کم نہیں، پاکستان کے عوام کی معاشی اور معاشرتی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اس جماعت نے اس کا بھی فائدہ اٹھایا اور لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ اگر ملک کا نظم و نسق ان لوگوں کے بجائے "سچے مسلمانوں" کے ہاتھ میں ہو تو تمہاری تمام مصیبتیں ایک دن میں رفع ہو سکتی ہیں۔ اس طرح اس پانچ چھ سال کے عرصہ میں یہ لوگ موجودہ نظامِ حکومت کے خلاف نفرت اور مخالفت کے جذبات کو بھڑکانے اور اپنے آپ کو مقبول بنانے میں کامیاب ہوتے چلے گئے۔

(۷) اس جماعت کے تعارف میں ہم نے بار بار مرزائیت کا نام لیا ہے۔ یہ بات یونہی نہیں کہی گئی۔ مرزا غلام احمد اور مودودی صاحب نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے جو سیڑھی تیار کی ہے وہ ایک ہی قسم کی ہے۔ مرزا صاحب نے پہلے یہ اعلان کیا کہ مسلمان مذہب سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ ان کی فوز و فلاح صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ صحیح اسلام کے پیرو ہو جائیں۔ صحیح اسلام کے معنے ہیں ایک خدا کی اطاعت۔ لیکن خدا کی اطاعت ہو نہیں سکتی جب تک رسول کی اطاعت نہ کی جائے۔ رسول کی اطاعت کے معنی

ہیں سنّتِ رسولؐ کا اِتّباع۔ یہ سنّت احادیث کے اندر ملتی ہے۔ لیکن احادیث کے انبار میں رطب ویابس سب کچھ ملا ہوا ہے۔ جب تک جھوٹ کو سچ سے الگ نہ کیا جائے ہم رسول کی اطاعت کر ہی نہیں سکتے۔ احادیث کے انبار میں سے جھوٹ سے سچ کو الگ کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ یہ وہی شخص کرسکتا ہے جسے خدا کی طرف سے ایک نور عطا ہوا ہے۔ لہٰذا، جس بات کو میں کہوں کہ سچ ہے' اسے سچ سمجھو اور جسے میں جھوٹ کہدوں' اسے جھوٹ مانو۔

اس سے بات صاف ہو گئی کہ خدا کی اطاعت درحقیقت نام ہے مرزا صاحب کے فیصلوں کو ماننے کا۔ بعینہٖ یہی چیز مودودی صاحب فرماتے ہیں۔ وہ بھی اطاعتِ خدا کو سمٹا کر احادیث میں لے آتے ہیں اور احادیث کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا فیصلہ صرف "مزاج شناس رسولؐ" کی بصیرت کر سکتی ہے کہ کونسی حدیث سچّی ہے اور کونسی جھوٹی۔ اور وہ مزاج شناسِ رسولؐ' (ان کے دستِ راست، امین احسن صاحب اصلاحی کے بیان کے مطابق جو انہوں نے عدالت میں دیا تھا) خود مودودی صاحب ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مودودی صاحب یہ کہتے ہیں کہ خدا کی یہ اطاعت حکومت کی شکل میں ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اس حکومت میں وہی فیصلہ خدا کا فیصلہ قرار پائے گا جسے یہ مزاج شناسِ رسول، رسول کا فیصلہ قرار دیں گے۔ اس فیصلہ کے خلاف لب کشائی کرنے والا معصیتِ خدا و رسول کے جرم میں مُرتد قرار پاجاتا ہے اور مُرتد کی سزا اُن کے نزدیک قتل ہے۔

(۸) طلوعِ اسلام نے اس خطرہ کو شروع ہی سے بھانپ لیا تھا۔ اسی بناء پر وہ ۱۹۴۸ء سے لیکر آج تک اس جماعت کے عزائم ومقاصد کو مسلسل بے نقاب کرتا اور مسلمانوں کو ان کی تخریبی کارروائیوں سے آگاہ کرتا چلا آرہا ہے۔ اس مسئلہ سے دلچسپی لینے والے حلقہ کے پیہم اصرار پر اب اُن تمام مقالات کو یکجا کر دیا گیا ہے جو اس دوران میں طلوعِ اسلام میں

شائع ہوتے رہے ہیں تاکہ یہ سب کچھ آپ کے سامنے بیک وقت آسکے۔ اگر آپ ان مقالات کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ یہ جماعت فی الواقع پاکستان اور مسلمانوں کے لئے ایک عظیم خطرہ کا موجب ہے۔ عظیم اس لئے کہ جو ہوسِ اقتدار، مذہب کے نقاب میں مصروفِ تگ و تاز ہوتی ہے اس کے تخریبی نتائج بڑے دور رس اور تباہ کن ہوتے ہیں۔ منیر کمیٹی کے الفاظ میں

"اگر تم عوام کو یہ باور کرا دو کہ جو کچھ اُن سے کہا جا رہا ہے وہ مذہب کی رُو سے حق ہے یا مذہبی فریضہ ہے تو تم اُن سے جو جی میں آئے کرا سکتے ہو۔ اس میں یہ عوام کسی نظم و ضبط، وفاشعاری، متانت و سنجیدگی، اخلاقی یا تمدنی احساس کا کوئی پاس نہیں کریں گے۔"

آپ خود سمجھ لیجئے کہ جس ملک کے عوام کی یہ حالت ہو اُس میں اس قسم کی جماعت کو جس کے پیشِ نظر مذہب کے راستے حکومت حاصل کرنا ہو، اگر مقبولیت حاصل ہوتی جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ طلوعِ اسلام نے اس جماعت کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس کا جذبۂ محرکہ اسی خطرہ کا احساس ہے۔

واللہ علیٰ ما نقول شہید

بابِ اوّل

پاکستان اور جماعتِ اسلامی

پاکستان کے نقاب پوش دشمن
(میرزائیت کے پیچھے مودودیت)
(نومبر ۱۹۴۸ء)

دنیا میں بعض مصیبتیں انسان پر ہنگامی حوادث کی وجہ سے آتی ہیں جن پر انھیں قدرت نہیں ہوتی اس لئے اسے بسا اوقات ان کے نتائج و عواقب کو مجبوراً برداشت کرنا پڑتا ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا لیکن اکثر مصیبتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں انسان اپنے لئے آپ پیدا کرلیتا ہے اور اس طرح خواہ مخواہ اپنی خود ساختہ پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد جو مصائب دنوازل اس کے دشمنوں کے مشئوم عزائم کے پیدا کردہ تھے یا جو حوادثِ ارضی و سماوی کے ہاتھوں رونما ہوئے وہی کچھ کم نہ تھے لیکن اس سے کہیں زیادہ مہیب اور شدید تر ہیں خود ساختہ مشکلات ہیں جن میں ہم اس بُری طرح سے گھرے ہیں کہ ان سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ ان خود ساختہ مصائب میں سب سے بڑا "ہَوا" وہ ہے جو نظامِ شریعت کی شکل میں اعصابِ ملت پر سوار ہے اور جس سے کوئی راہ مفر نظر نہیں آتی ایک مسلمان کے لئے یہ سوال ہی مضحکہ انگیز ہے کہ وہ شریعت کے نظام پر چلنا چاہتا ہے یا غیر شرعی آئین کے تابع۔ انگریز کی غلامی میں دیوانی مقدمات میں فریقین میں سے جب کوئی یہ کہتا کہ میں اپنا فیصلہ شریعت کے مطابق نہیں

نظامِ شریعت

بلکہ رواج کی رو سے چاہتا ہوں، تو سینہ میں دل اور دل میں ایمان کی رمق رکھنے والے طبقہ میں اس کی یہ حرکت سخت مذموم قرار پاتی۔ اس وقت عام طور پر کہا جاتا تھا کہ جن معاملات میں ہمیں اختیار نہیں، ان میں تو خیر بے بسی ہے لیکن جن صورتوں میں فیصلہ ہمارے اختیار پر چھوڑا جاتا ہے اس میں رواج کو شریعت پر ترجیح دینا اپنے کلمۂ شہادت کی عملی تکذیب ہے چنانچہ مسلمانوں کی تحریکِ آزادی سے مقصود ہی یہ تھا کہ جن امور میں انہیں اختیار نہیں تھا کہ وہ شریعت کے مطابق اپنے معاملات کے فیصلے کرا سکیں، ان امور میں بھی انہیں یہ اختیار مل جائے وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔ چنانچہ یہ اختیار حصولِ پاکستان کے بعد مل گیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند

لہٰذا اس کے بعد یہ سوال ہی پیدا ہونا نہیں چاہیئے تھا کہ پاکستان کا نظامِ حکومت کیا ہونا چاہیئے یہی وہ حقیقت تھی کہ جس کی طرف قلب ملت محترم قائدِ اعظم مرحوم نے ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی کے ایک اجتماع میں ان الفاظ میں اشارہ فرمایا تھا کہ :۔

> میں تو سمجھ ہی نہیں سکا کہ لوگوں کو اس استفسار کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا یا نہیں اسلامی اصول تو ایسے ہیں جن کی نظیر دنیا میں کوئی بھی پیش نہیں کر سکتا۔ یہ اصول آج بھی اسی طرح کارآمد ہیں جس طرح آج سے تیرہ سو سال پیشتر تھے۔ (ڈان ۲۶/۱/۴۸)

اسی حقیقت کو محترم لیاقت علی خان نے پشاور کے ایک اجتماع کے سامنے ان الفاظ میں پیش کیا تھا:

> ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک قطعۂ زمین حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔ پاکستان صحیح معنوں میں ایک اسلامی اسٹیٹ ہوگی جس میں عدل و انصاف اور مساوات کے اسلامی اصولوں کا نفاذ ہوگا اور طبقاتی امتیاز ختم کر دیا جائے گا۔ پاکستان ہماری ایک تجربہ گاہ ہوگی اور

ہم دنیا کو دکھا سکیں گے کہ تیرہ سو سال پہلے کے اصول آج بھی کارآمد ہو سکتے ہیں۔ (ڈان ۱۴-۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء)

کرنے کا کام یہ تھا کہ اس اصول کو پاکستان کی مجلس آئین ساز کی وساطت سے ایک آئینی منشور کی شکل دے کر اعلان کر دیا جاتا کہ چونکہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے، اسلئے اس کا نظام حکومت بھی لامحالہ اسلامی ہوگا، اور اس کے بعد اس نظام کی تدوین و ترتیب کے لئے عملی قدم اٹھایا جاتا۔ لیکن ہمارے ارباب بست و کشاد نے ایسا نہ کیا اور اس طرح اپنے ہاتھوں ایک ایسی مصیبت پیدا کر لی جس سے اس قسم کی الجھنیں پیدا ہو گئیں اور ہو رہی ہیں کہ جوں جوں انہیں سلجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے، وہ پیچیدہ تر ہوتی جاتی ہیں۔ سب سے بڑی الجھن یہ کہ اس سے اُن تخریبی عناصر کے لئے جو شروع ہی سے پاکستان کے خلاف چلے آتے تھے اور تشکیل پاکستان کے بعد اس کی تخریب کے منحوس ارادے مقدس نقابوں میں چھپائے ہوئے تھے، عوام کے دلوں میں ظنون و وساوس پیدا کرنے

تخریبی عناصر

کا موقع بہم پہنچا دیا اور انہوں نے اس طرح امید اور یقین کی اُن مستحکم بنیادوں کو جن پر اس "اسلامی تجربہ گاہ" کا قصر رشید اور رفیع المنزلت استوار ہونا تھا، شک و تذبذب، بدظنی اور بداعتمادی اور یاس و ناامیدی کے مہلک جراثیم سے متزلزل کر دیا۔ اس سے پاکستان کو ایسا دُور رس اور مہلک نقصان پہنچا ہے جس کا سطحی نگاہوں سے اندازہ لگانا مشکل ہے۔ مذہب کا جذبہ عام مسلمانوں کے تحت الشعور میں جاگزین ہے۔ اس کی اصل اس کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔ اس گئے گزرے زمانہ اور افسردہ دور میں بھی اس کے عروق مردہ میں خون زندگی دوڑانے کا سب سے بڑا محرک یہی جذبہ ہے۔ دنیا نے اپنی اپنی قوموں کے لئے وطن، قوم، تاج،

مملکت کی محبت و عقیدت کے جذبات کو وجۂ گرمیٔ خون اور باعثِ تخلیق جنوں بنانے کی کوشش کی ہے لیکن مسلمانوں کے لئے ان میں سے کوئی جذبہ بھی ایسا مؤثر اور کارگر ثابت نہیں ہوا جس قدر ایک اللہ کا نام انقلاب آفریں ثابت ہوا ہے وہ اس نام کی بلندی کے استحکام اور اس کی آبرو کے قیام کے لئے اپنی عزیز ترین متاع ہنستے کھیلتے لٹا دیتا ہے۔ اس کے اس بے پناہ جذبۂ شوق و جنوں کو شکوک و ظنون کے دق کے جراثیم کے سپرد کر دینا قومی خودکشی نہیں تو اور کیا ہے!

مندرجہ صدر وجوہات کی بناء پر اس مسئلہ کے متعلق ایک واضح، بیّن اور غیر مبہم سرکاری اور آئینی اعلان کی ضرورت پہلے ہی کچھ کم نہ تھی، لیکن پچھلے دنوں سے ہندوؤں کی طرف سے جو خاص پروپیگنڈا شروع ہوا ہے اس کے پیش نظر یہ ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ اس موقع کے آخری لمحات آپہنچے ہیں جب اس باب میں حکومت پاکستان کے اربابِ حل و عقد کو بلا تاخیر مزید فیصلہ کرنا ہوگا۔ پچھلے دنوں ہندوستان کے

مخالف پروپگنڈا!

ہائی کمشنر مقیم پاکستان نے مشرقی بنگال کے حالات و کوائف کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بیان میں کہا کہ وہاں کے ہندو اس لئے ہندوستان آرہے ہیں کہ ارکانِ پاکستان نے کئی مرتبہ اعلان کیا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہو گی لہٰذا اس قسم کی اسٹیٹ میں غیر مسلم کس طرح اپنے آپ کو محفوظ سمجھ سکتے ہیں اس کے بعد پاکستان کے گورنر جنرل محترم خواجہ ناظم الدین نے جب ایک بیان کے سلسلے میں فرمایا کہ محترم قائدِ اعظمؒ کی وفات کے بعد ہمارے اندرونی اختلاف دور ہو چکے ہیں حتیٰ کہ وہ لوگ جو اس سے پہلے قدیم شریعت کی فوری تنفیذ کا مطالبہ کیا کرتے تھے انہوں نے بھی اپنی جدّ وجہد کو ملتوی کر دیا ہے تو اس پہ

ہندوستان ٹائمز نے "نسیمِ سحری" کے عنوان سے ایک مقالۂ افتتاحیہ لکھا جس میں کہا کہ:۔

پاکستان، بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے راہنماؤں نے متعدد بار اس کا اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں

اس کے بعد لکھا کہ:۔

اگر کشمیر کا تنازعہ پرامن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔ (۱۹ پرچہ ۴۸)

پھر جب لندن میں محترم لیاقت علی خان نے ایک اجتماع میں کہا کہ:۔

پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے اور ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ اُن اصولوں پر قائم کی جائے گی جو ہمیں اسلام نے سکھائے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز ۲۵ بابت)

تو اس پر اخبار نے پھر اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا کہ:۔

تقسیمِ ہند کے وقت سے ہندوستان کے نیتاؤں نے اس امر کا اعلان کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں مادی (SECULAR) مملکت ہو گی لیکن سرحد کے اُس پار کے لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اسلامی اسٹیٹ ہو گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں ہندوستان کی سیاسی جماعتوں اور ارکانِ حکومت کی تمام کوششیں اس امر میں صرف ہو رہی ہیں کہ

مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو یقین دلائیں کہ وہ یہاں بالکل محفوظ ہیں پاکستان
کی اقلیتوں کو یہ محسوس کرایا جا رہا ہے کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے لئے کوئی
جگہ نہیں اور اُن کی املاک کو قانوناً ضبط کیا جا سکتا ہے ابھی پچھلے دنوں
مسٹر لیاقت علی خاں نے کہا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے (ص۲۵)

یہ وہی پروپیگنڈا ہے جو اس سے بہت پہلے عیسائی حکومتوں اور مشنریوں نے مسلمانوں کے خلاف شروع کیا تھا اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مسلمان ساری دنیا کی نگاہوں میں سب سے زیادہ وحشی خونخوار انسانیت کا دشمن اور تہذیب و تمدن کا رہزن قرار پا چکا ہے جس کے ہاتھوں نہ کسی شریف آدمی کی عزت محفوظ ہے نہ آبرو، نہ جان سلامت ہے نہ ایمان اس کا مذہب دنیا میں فساد و خونریزی کا سب سے بڑا موجب اور اس کی شریعت ننگ و ناموسِ انسانیت کی سب سے مہیب دشمن سمجھی جاتی ہے چنانچہ آج بھی صورت یہ ہے کہ جب ہم اقوامِ عالم کے کسی اجتماع میں جاتے ہیں تو سب سے پہلے انہیں یہ باور کرانا پڑتا ہے کہ ہم سے ڈریئے نہیں، ہم انسان ہی ہیں، خونخوار درندے نہیں ہیں یہ تو رہی ہماری تصویر غیروں کی نگاہ میں اور خود اپنوں کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ بھی رفتہ رفتہ اس پروپیگنڈا سے مرعوب ہو کر محسوس (اور بعض اوقات اس امر کا کھلے بندوں اقرار) کرنے لگ گئے کہ اسلام کا نظام واقعی چودہ سو سال پیشتر کے اکھڑ بدوؤں کو درست کرنے کے لئے موزوں تھا آج کی مہذب دنیا میں اس سکہ کا چلن ناممکن ہے اس غلط پروپیگنڈے کا اثر خدا خدا کر کے زائل ہونے لگا تھا کہ اب ہندوؤں کی طرف سے اس کی تجدید شروع ہو گئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمارے اربابِ حل و عقد جو پہلے ہی کچھ بین بین مسلک کے عادی ہیں، ڈرنے

لگ جائیں گے کہ اگر ہم نے پاکستان کو اسلامی مملکت قرار دے دیا اور اس میں نظامِ شریعت کو رائج کر دیا تو

(۱) دنیا ہمیں پھر وحشی اور غیر مہذب سمجھنے لگ جائے گی۔

(۲) یہاں کی اقلیتیں بدک کر بھاگنا شروع کر دیں گی اور

(۳) اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کا ہندو انتقام پر اتر آئے گا۔

ان کا یہ ڈر بجا ہوگا!

مُلّا کی شریعت

آپ حیران ہوں گے کہ ہم نے یہ کیا کہہ دیا کہ ان کا یہ ڈر بجا ہوگا۔ ہاں نہ صرف ان کا یہ ڈر بلکہ ایک حد تک وہ پروپیگنڈا بھی جو مسلمانوں کے نظامِ حکومت کے خلاف دنیا کرتی چلی آئی ہے اور آج بھی کر رہی ہے جیسا کہ ہم بار بار بالوضاحت بیان کر چکے ہیں مسلمانوں کا (اسلام کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا) نظامِ مملکت و آئینِ شریعت اپنے اکثر و بیشتر حصوں میں ایسا ہی رہا ہے جسے ہم دنیا کے سامنے کبھی فخر کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے۔ اس کی ایک مثال اسی پرچہ کے "باب المراسلات" میں "لونڈی اور غلاموں" کے عنوان کے تحت دیکھئے۔[1] سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نظامِ شریعت کے سب سے بڑے علمبردار سمجھے جاتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ جنگی قیدیوں کے بارے میں وہ جس قسم کا شرعی نظام رائج کرنا چاہتے ہیں، اسے دیکھ کر دنیا کی قومیں آپ کے متعلق کیا کہیں گی اور جو کچھ کہیں گی، اس میں

---

[1] غلامی کے متعلق مودودی صاحب کی شریعت کے لئے دیکھئے "قتلِ مرتد، غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت" شائع کردہ طلوعِ اسلام ٹرسٹ۔

حق بجانب ہوں گی یا نہیں؟ یہ نمونہ ہے اُس نظامِ شریعت کا جو مسلمانوں کے دورِ ملوکیت میں ایجاد ہوا لیکن جسے شومیٔ قسمت سے مسلمان "اسلامی نظام" سمجھ رہا ہے۔

تو پھر کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اعلان کر دیں کہ پاکستان اسلامی اسٹیٹ نہیں ہوگی بلکہ لادینی اسٹیٹ ہوگی۔ یہ نہیں۔ اگر ایسا ہی کرنا ہوتا تو ہندوستان کی تقسیم کی ضرورت ہی نہ تھی کرنے کا کام وہی ہے جس کی طرف ہم گزشتہ اشاعت کے لمعات میں اشارہ کر چکے ہیں یعنی یہ کہ:-

(۱) پورے حتم و یقین اور وثوق و اعتماد سے اعلان کر دیا جائے کہ پاکستان اسلامی اسٹیٹ ہوگی۔

(۲) اس اسٹیٹ کا نظام قرآن پر مبنی ہوگا۔

قرآن کا آئین

اور اس کے بعد حکومت ہند سے یہ کہا جائے کہ پاکستان کے اسلامی اسٹیٹ بننے سے آپ کو غیر مسلموں کے بارے میں جو خدشات و خطرات نظر آرہے ہیں ان کی ایک تفصیلی فہرست مرتب کر کے بھیج دیجئے اور اس کے بعد دیکھ لیجئے کہ جو قانون ہم بناتے ہیں اس فہرست میں سے کسی ایک خطرہ یا خدشہ کا اندیشہ بھی باقی رہتا ہے ان سے کہہ دیجئے کہ ہم اپنا قانون اُس وقت رائج کریں گے جب آپ خود دیکھ لیں گے کہ آپ کے تمام خطرات و خدشات وہمی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی مبنی برحقیقت نہیں۔ اتنا ہی نہیں؛ اس سے ایک قدم آگے بڑھیئے اور اُن سے کہیئے کہ اس کے بعد ہمارے قانون کا اپنے قانون سے موازنہ کیجیئے اور دیکھئے کہ غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق و مفاد کا جس طرح

قانونی تحفظ ہم کرتے ہیں اور جو جو مراعات انہیں ہم دیتے ہیں کیا آپ کا قانون اس کی نظیر پیش کر سکتا ہے۔

اور آگے بڑھیئے اور ساری دنیا کو کہہ دیجئے کہ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ اس قانون کی کسی ایک شق کی نظیر اپنے ضوابط و قوانین سے پیش کر کے بتاؤ جسے ہم پیش کرتے ہیں وہ خدا کا قانون ہے مذاق نہیں ہے اگر وہ انسانوں میں عدل و مساوات قائم نہ رکھ سکے تو اسے خدائی قانون کہلانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ خدا کا قانون نہ ہوا منو کا شاشتر یا ایٹلانٹک چارٹر ہوا۔

کھیل بچوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

محترم خواجہ ناظم الدین صاحب نے اپنے محولہ صدر بیان میں فرمایا ہے :۔

جو لوگ (ORTHODOX) نظام شریعت کی فوری (IMMEDIATE) ترویج کا مطالبہ کرتے ہیں انہوں نے اپنی مساعی کو ملتوی کر دیا ہے۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ محترم خواجہ صاحب پاکستان میں قانون اسلامی کی تنفیذ کے خلاف نہیں ہیں (جیسا کہ ہندوستان ٹائمز نے اس سے نتیجہ نکالا ہے) بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ :۔

(۱) اسلامی قانون ہمارے حالات حاضرہ کے تقاضوں کو پورا کرنے والا ہونا چاہیئے اور

(۲) اسے بتدریج رائج کرنا چاہیئے۔

ہم شروع سے یہی کہتے چلے آرہے ہیں کہ وہ نظام اسلامی جو عصر حاضر کے تقاضوں

کو پورا کر سکتا ہے، اسی صورت میں مرتب ہو سکتا ہے کہ قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی جزئیات اپنے حالات کے مطابق متعین کی جائیں۔ یہ صلاحیت صرف قرآن میں ہے کہ وہ تمام نوعِ انسانی کی قیامت تک کی ضروریات کا ساتھ دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جو نظام بھی ہے انسانوں کا خود ساختہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انسانوں نے جو نظام کسی ایک زمانہ کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہو (خواہ وہ جزئیات قرآنی اصولوں کی روشنی میں کیوں نہ متعین کی گئی ہوں) وہ ابدالآباد تک غیر متبدل نہیں ہو سکتا جیسا کہ ہم نے گزشتہ ماہ لکھا تھا، اربابِ حکومت کو اس باب میں اغلباً یہ اندیشہ ہے کہ قدامت پسند حضرات اس کی مخالفت کریں گے اور عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیں گے لیکن اس اندیشہ کا علاج تاخیر نہیں ہے اس سے حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ قرآنی اصولوں کی روشنی میں ہمیں اپنے حالات کے مطابق خود اپنی جزئیات متعین کرنی ہیں تو عزمِ راسخ سے اس کا اعلان کیجئے کہ ہمارے

تاخیر نہ کیجئے

آئین کی بنیاد قرآن پر ہو گی۔ اور پھر پوچھئے مسلمانانِ پاکستان سے کہ کسی کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ اس کے خلاف ایک آواز بھی بلند نہیں ہو گی اس لئے کہ وہ کون بدبخت ہے جو یہ کہے گا کہ ہمارے آئین کی بنیاد قرآن پر نہیں ہونی چاہیے اور اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ پاکستان کے مسلمانوں کو اس نظام کے ساتھ کس درجہ والہانہ عقیدت پیدا ہو جاتی ہے یہ خدشات و خطرات سب اس لئے ہیں کہ آپ حقائق کا سامنا کرنے سے ہچکچاتے ہیں حقائق کو بے نقاب سامنے رکھیئے یہ تمام خدشات

کافور ہو جائیں گے۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ ۱۷/۸۱
باقی رہا اس کا تدریجی نفاذ، تو یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام تدریجی طور پر ہی رائج ہو سکتا ہے لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں، تدریجی مراحل تو کسی نقطۂ آغاز سے شروع ہوں گے۔ اگر آپ کسی پروگرام کی ابتدا ہی نہ کریں گے تو وہ اپنے تدریجی منازل طے کس طرح سے کرے گا۔
برس دن سے یہ قوم سنتی چلی آرہی ہے کہ پاکستان اسلامی اسٹیٹ ہے اس کا آئین اسلامی اصولوں کے مطابق ہوگا لیکن آج تک اس باب میں ایک عملی قدم بھی تو نہیں اٹھایا گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری حکومت کے سامنے بڑے بڑے اہم مسائل ہیں ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ بیرونی خطرات ان کی تمام توجہات کو اپنی طرف مرکوز اور تمام قوتوں کو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہیں لیکن اگر بیرونی خطرات کا تدارک اور حفاظتی تدابیر استحکامِ پاکستان کے لئے ضروری ہیں تو اندرونِ ملک میں آئینی نظام کی ترتیب و تنفیذ بھی استحکامِ پاکستان کے لئے کچھ کم ضروری نہیں اس سے نہ صرف یہ کہ ہمارے معاملات منشائے خداوندی کے مطابق طے پائیں گے بلکہ قوم اُس ذہنی خلفشار سے نجات حاصل کر سکے جس میں وہ آج کل مبتلا ہے کامل جمعیتِ خاطر سے استحکامِ پاکستان کے لئے تیار ہو جائے گی اور اُن تخریبی عناصر کو بھی زہرافشانی کا موقع نہیں ملے گا جو اس باب میں تاخیر یا عدمِ فیصلہ کی آڑ لیکر قوم میں تشتت و انتشار اور بددلی اور بدگمانی پیدا کرنے میں سرگرمِ عمل ہیں۔

جماعتِ اسلامی محترم خواجہ ناظم الدین نے اپنے بیان میں فرمایا ہے کہ

جو لوگ پہلے قدیم شرعی نظام کی تنفیذ کا مطالبہ کرتے تھے انہوں نے بھی اب اپنی جدوجہد کو ملتوی کر دیا ہے اور حکومت کی تائید اور امداد کا وعدہ کر لیا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس سے خواجہ صاحب کا اشارہ کن لوگوں کی طرف ہے۔ لیکن اگر ان کے پیشِ نظر وہ گروہ ہے جو اپنے آپ کو اسلامی جماعت سے تعبیر کرتا ہے اور اُنکے التوائے مساعی سے مقصود ہیں وہ اعلانات جو اس جماعت کی طرف سے ان کے امیر اور معتمد کی گرفتاری کے بعد صادر ہوئے ہیں، تو ہم گذارش کریں گے کہ ان کی اتنی سی بات سے مطمئن ہو جانا اور سمجھ لینا کہ اب قوم کو ان کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا اپنے آپ کو دھوکا میں رکھنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس پر ابھی تک غور نہیں کیا کہ یہ تحریک جو بظاہر اسلامی جماعت کے مقدس اور معصوم نقاب میں سامنے آئی ہے اور جس کا مقصود اور مطالبہ مسلمانوں کو سچے معنوں میں مسلمان بنانا بتایا جاتا ہے، کن محرکات پر مبنی، کن عوامل پر مشتمل ہے اور مستقبل میں کتنے بڑے فتنے کا موجب بن سکتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ مدت ہائے دراز کے ذہنی جمود اور فکری خمود کی وجہ سے مسلمانوں میں بڑی "سطح پسندی" آگئی ہے۔ وہ کسی معاملہ، مسئلہ یا تحریک کا دقتِ نظر سے مطالعہ نہیں کرتے کہ ایسے مطالعہ کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس کی سطح پر نگاہ ڈالتے ہیں اور اُسی سے اس کے اصل کے متعلق ایک رائے قائم کر لیتے ہیں اور پھر اس رائے پر اس شدت اور تعصب سے جم جاتے ہیں گویا وہ گہرے غور و فکر اور کامل بصیرت و فراست کے بعد قائم کی گئی تھی۔ ذرا سوچئے،

میرزا غلام احمد

آج سے قریب پچاس برس پہلے سرزمینِ پنجاب سے ایک تحریک اٹھی۔ بانیٔ تحریک نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے مُصلح،

مشفق اور طبیبِ دردمند اور اسلام کے بہت بڑے بہی خواہ کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ اپنی تعارفی تصنیف براہینِ احمدیہ کے متعلق بتایا کہ وہ ایک سپر ہوگی اُن تمام اعتراضات کے لئے جو معاندینِ اسلام کی طرف سے اسلام پر وارد کئے جاتے ہیں۔ اُس زمانہ میں آریہ پنڈت اور عیسائی مشنری مسلمانوں کے خلاف میدانِ مناظرہ گرم رکھا کرتے تھے۔ اس لئے اسلام کی محافظت کے سلسلہ میں انہی گروہوں کو پیش پیش رکھا گیا۔ سادہ لوح مسلمانوں نے اس دعوت پر بے تابانہ لبیک کہا اور اس کے داعی کی ہر ممکن مدد اور تائید کے لئے چاروں طرف سے آوازیں بلند ہوگئیں۔ ان مقدس دعاوی کے ساتھ اس تحریک کی ابتدا ہوئی اور کسی نے اتنا سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ اس سے مقصود اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انگریز کو مسلمان کے جذبۂ جہاد سے خوف لاحق ہو رہا تھا وہ کسی طرح اس سے مامون ہو جاتے۔ اس خطرہ کو وہ ہندوستان میں حضرت سید احمد بریلوی کی تحریکِ جہاد کی صورت میں اپنے سامنے دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ اگر یہ تحریک دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کے لئے ہندوستان تو ایک طرف مشرقِ بعید میں اپنے قدم جمانے ناممکن ہو جائیں گے۔ وہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے دلوں سے اس جذبہ کو نکال دیا جائے اور ان کی توجہات اس طرح کسی دوسری طرف منتقل کر دی جائیں کہ انہیں ان کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملے۔ یہ تحریک بڑی کامیاب رہی۔ اس نے ایک طرف جہاد کو حرام قرار دیا اور دوسری طرف پچاس برس تک مسلمانوں کو ان بحثوں میں الجھائے رکھا کہ

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟

یا "خاتم النبیین" میں خاتم کی ت مکسور ہے یا مفتوح۔ اور انگریز ہندوؤں کو ساتھ ملا کر نہایت اطمینان اور فراغت سے مسلمانوں کی ہلاکت اور بربادی کے سامان فراہم کرتا رہا۔ چونکہ اس تحریک کے

پاس کوئی ایجابی POSITIVE چیز پیش کرنے کو تھی نہیں اس لئے اس نے اپنی بنیاد منافرت کے سلبی (NEGATIVE) اسلوب پر رکھی آپ دیکھیں گے کہ جونہی کوئی شخص میرزائیت کی بیعت کرتا ہے مسلمانوں کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگ جاتا ہے وہ انہیں مسلمان ہی نہیں سمجھتا وہ ان سب کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے اور صرف اپنی جماعت کو نجات یافتہ سمجھتا ہے۔ اگر اس نے آج صبح بیعت کی تو اس کے کل (دیروز) اور آج میں عملی طور پر کچھ فرق نہیں ہوتا۔ لیکن بایں ہمہ وہ تمام مسلمانوں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھنے لگ جاتا ہے اور پھر یہ جذبۂ بُعد و منافرت اس طرح ترقی کرتا چلا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کا بدترین دشمن ہو جاتا ہے اور اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا (مسلمانوں کی خوشحالی سے وہ جل اٹھتے ہیں اور ان کے مصائب سے خوش ہوتے ہیں) ان کی جماعت بندی کا سیمنٹ یہی جذبۂ منافرت ہے اسی سے ان کی جداگانہ جماعت کا وجود قائم ہے ان میں ان جذباتِ نفرت کو شدید سے شدید تر کیا جاتا ہے تاکہ اس سے ان کی جماعت مستحکم رہے۔ وہ سارے مسلمانوں کو کافر کہتے ہیں لیکن اس کے باوجود حالت یہ ہے کہ جو مراعات مسلمانوں کے لئے مخصوص ہوتی ہیں ان میں مسلمان بن کر برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ برابر کے ہی نہیں، بلکہ اب تو شریکِ غالب کی حیثیت سے۔

مسلمانوں سے نفرت

یہ تحریک برٹش گورنمنٹ کے بل بوتے پر قائم تھی جب انگریزوں نے ہندوستان سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تو یہ تحریک بھی مرجھانے لگ گئی اب انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بابت کی ہیچ یا "پیری مریدی" کے مصالح ہیں جو اس کے مٹنے

والے آثار کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ بحیثیت ایک تحریک کے اس کی کوئی اصل باقی نہیں کچھ عرصے کے بعد اس کے یہ نقوش و شواہد بھی ختم ہو جائیں گے اور پھر آنے والے مؤرخ کے پاس سوائے اس نقصانِ عظیم کے جو مسلمانانِ ہند کو اس سے پہنچا اس کا کوئی نشانِ راہ باقی نہیں رہے گا۔

جدید مرزائیت

لیکن اسے ہماری شومئی قسمت کہیئے یا خطۂ پنجاب کی زرخیزی کا کرشمہ کہ عین اُس زمانہ میں جب اس پُرانی تحریک میں پت جھڑ شروع ہوئی ٹھیک اسی زمانہ میں ایک نئی تحریک نے اپنی پہلی کونپل نکالی جو اپنی نفسیاتی کیفیت اور تکنیک کے اس اعتبار سے اس پرانی تحریک کی بروز ہے۔ یہ تحریک جماعتِ اسلامی کے نام سے مشہور ہے جس کے تذکرہ سے اس قصہ کی ابتداء ہوتی ہے۔ مسلمانانِ ہند کی تحریکِ آزادی کی ابتداء میں بنیادی مابہ النزاع مسئلہ یہ تھا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں یا ہندوستان کی دیگر غیر مسلم اقوام کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قومیت کا جزو بنتے ہیں جمہور مسلمان اپنی جداگانہ قومیت کے حق میں تھے اور اسی پر ان کے سیاسی دعاوی کی بنیاد تھی۔ رسالہ ترجمان القرآن کے ایڈیٹر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اُس زمانہ میں متحدہ قومیت کے نظریہ کی مخالفت کی اور اس طرح جمہور مسلمانوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر لی۔ اس کے بعد انہوں نے سنہ ۱۹۴۱ء میں اپنی جداگانہ جماعت کی تحریک چلائی جس کی اساس اس معصوم اور مقدس آواز پر تھی کہ مسلمان جب تک سچے معنوں میں مسلمان نہیں بن جاتا جب تک وہ خدا کے رنگ میں نہیں رنگا جاتا اُس وقت تک اسے

فوز وفلاح نصیب نہیں ہو سکتی کون مسلمان ہے جسے اس دعوت سے اختلاف ہو سکتا تھا اس لئے اس آواز میں ایسی دلکشی اور اس دعوت میں ایسی جاذبیت تھی کہ لوگوں نے اس پر اس طرح لبیک کہا جس طرح براہین احمدیہ کی اشاعت پر بلکہ اس سے بھی زیادہ کہ یہ نئی تحریک MODERN طریق پر پیش کی گئی تھی ہمیں اس وقت اُن محرکات سے بحث نہیں جو اس تحریک کی تخلیق کا باعث ہوئے۔ لیکن اس جماعت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے آپ کو اسلامی جماعت کہہ کر باقی مسلمانوں کے غیر اسلامی ہونے کا اعلان کر دیا اور اس طرح بُعد ومنافرت کا وہی بیج جس پر تحریکِ قادیانیت کی اساس تھی از سرِ نو بو دیا گیا۔ اس کے بعد امیرِ جماعت (یعنی خود مودودی صاحب) نے جماعت کے اراکین کی تجدید ایمان کی اور اس طرح اپنے دست حق پرست پر گویا انہیں نئے سرے سے مسلمان کیا (ملاحظہ ہو جماعتِ اسلامی کے پہلے اجتماع کی روداد) مسلمان اُس زمانہ میں ہندو اور انگریز کے متحدہ محاذ کے خلاف اس سیاسی کشمکش میں مبتلا تھے کہ ہندوستان میں ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے یا مسلمانوں کو اپنی جداگانہ مملکت قائم کرنے کا موقع مل جائے۔ مسلمانانِ ہند کے لئے یہ دور بڑا نازک تھا اور غیر مسلم عناصر پوری کوشش کر رہے تھے کہ مسلمانوں کی جداگانہ حکومت کے نظریہ کی حامل جماعت کی قوتوں میں کسی نہ کسی طرح ضعف وانتشار پیدا کر دیا جائے کہ اس میں ہندو کی فتح کا راز مضمر تھا۔ عین اس کشمکش کے زمانہ میں اسلامی جماعت نے مسلمانوں کے خلاف ایسا زہر اگلنا شروع کیا جس سے ان کی اجتماعی کوششوں میں انتشار پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ آپ اس جماعت کے آرگن ترجمان القرآن اور دیگر

جرائد و رسائل کے فائل اٹھا کر پڑھیئے اور دیکھیئے کہ کس منظم طریق پر مسلمانوں کی اس سیاسی جدّوجہد کی مخالفت کی جاتی تھی جس سے ان کی ملّی زندگی اور موت کا سوال وابستہ تھا۔ قادیانی تحریک نے مسلمانوں کو کافر بنایا تھا۔ مودودی صاحب نے انہیں من حیث القوم منافق قرار دیا۔ کافر اور منافق میں جو فرق ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ چنانچہ ترجمان القرآن میں "حقیقتِ نفاق" کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شائع ہوا جس میں لکھا تھا کہ :-

مسلمانوں سے نفرت

منافقین کی مذکورہ بالا اقسام تو وہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے ان کے علاوہ ایک اور قسم بھی اس زمانہ میں پائی جاتی ہے جس کا وجود عہدِ نزولِ قرآن میں نہیں تھا اور نہ قدرتاً ہونا چاہیئے تھا۔ یہ قسم اُن نسلی اور خاندانی مسلمانوں پر مشتمل ہے جن کے دماغ تو غیر اسلامی نظریات اور اصولوں پر پوری طرح ایمان لائے ہوتے ہیں اور اسلامی اصول اور قرآنی تصوّرات سے بکسر بغاوت کر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے اور مسلمان کہلانے پر مصر ہیں اور ان کا یہ اصرار کسی غرض یا ذاتی مصلحت پر مبنی نہیں ہے۔ جیسا کہ دوسرے منافقوں کا خاصہ ہے بلکہ انہیں لفظ اسلام اور مسلمان کے ساتھ ایک گہرا پیدائشی تعلق ہے اور اس تعلق کے قیام و بقا میں وہ سخت متعصب واقع ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح دنیا میں بے شمار قومیں ہیں اسی طرح انہوں نے مسلمانوں کے لفظ کو بھی ایک قوم کے نام کی حیثیت دے رکھی ہے اور جس طرح ہر انسان کو اپنی قوم

سے ایک خصوصی لگاؤ ہوتا ہے خواہ اُس میں اور اُس کے دوسرے ہم قوم افراد میں کتنا ہی زبردست اختلافِ فکر و نظر موجود ہو مگر نفسیاتی اعتبار سے اس لگاؤ میں اتنی مضبوطی ہوتی ہے کہ بسا اوقات انسان کسی قیمت پر اس لگاؤ کو قربان نہیں کر سکتا۔ بالکل اسی طرح یہ مسلمان زادہ بھی اپنی قومیت کے نشان یعنی لفظ مسلمان کو اپنے سے جدا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور جب کوئی موقع قومی حمایت کا آتا ہے تو دوسرے منافقین کی روش کے برعکس یہ مسلم قوم کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتا ہے اور اس جاں فروشی کے مظاہرہ میں نہ تو اس کی کسی بدنیتی کا دخل ہوتا ہے نہ خود غرضی یا جاہ طلبی کا بلکہ یہ اثر ہوتا ہے محض اُس تعصب کا جو اُسے اپنی قومیت کے ساتھ ہے۔

اس سے ذرا آگے چل کر تحریر ہے :-

لیکن جیسا کہ کہیں اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس وقت ایک تیسرا طبقہ بھی پیدا ہو گیا ہے جس کا نام ہم نے غیر شعوری منافق رکھا ہے۔ یہ طبقہ اپنے خیالات، مقاصدِ زندگی اور طرزِ عمل کے اعتبار سے تو اسلام سے بالکل منحرف ہے مگر اپنے آپ کو مسلمان کہنے پر نہ صرف مصر ہے بلکہ اسلام کے نام پر جان دینے تک کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور بس مسلمانوں کو سربلند دیکھنے کیلئے مرا جاتا ہے۔ اس کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے لئے ویسی ہی عصبیت اور جاہلی حمیت ہے جیسی ایک پیدائشی ہندو میں ہندو مت اور ہندوؤں کے لئے اور ایک پیدائشی سکھ میں سکھ مت اور سکھوں کے لئے ہوتی ہے۔

مسلمانوں کی قیادت کیخلاف

جمہور مسلمانوں کے علاوہ ان کے ناوکِ استہزاو تخریب کا سب سے

بڑا ہدف مسلمانوں کی قیادت تھی، چنانچہ اس قیادت کے خلاف انہوں نے مسلسل جہاد جاری رکھا اور اس کی تذلیل و تحقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ انہوں نے اپنی جماعت کو تاکید کر دی کہ مسلمانوں کی اس اجتماعی تحریک میں کوئی حصہ نہ لیا جائے۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ جماعت ایک مستقل فرقہ بن گئی جس کی اب کیفیت یہ ہے کہ مرزائی حضرات کی طرح جونہی کوئی شخص اس جماعت میں داخل ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ مقدس طائفے کا فرد سمجھنے لگ جاتا ہے اور باقی مسلمانوں کو جہنم کا ایندھن سمجھ کر انہیں نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔

اس جماعت نے اس تمام دوران میں پاکستان کی مخالفت میں بھی کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ یہ کھلے بندوں اسے "زہر ملا حلوہ" کہا کرتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہو گئی جو اگرچہ اسلامی جماعت میں شامل نہیں تھے لیکن ان کے نگاہ فریب دلائل سے متاثر ہو کر تحریکِ پاکستان سے دل برداشتہ ہو گئے۔ اور بہت سے ایسے تھے جن کے دلوں کا یقین ریب و تشکیک سے بدل گیا۔ غرضیکہ بہ حیثیتِ مجموعی مسلمانوں کی اس اجتماعی تحریک کو جس قدر نقصان اس جماعت نے پہنچایا ہے، کھلے دشمن اتنا نہیں پہنچا سکے۔ اس کی وجہ خود اسی جماعت کی زبان سے سُن لیجئے۔ حقیقتِ نفاق کے مضمون میں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے، ارشاد ہے کہ:-

منافقین اسلام کے مقابلہ میں دو طاقتیں ہمیشہ سے نبرد آزما چلی آ رہی ہیں؛ ایک کفر دوسری نفاق۔ تاریخِ اسلامی کے ابتدائی صفحات ہمیں بتلاتے ہیں کہ اسلام کی راہ میں جتنی مشکلات کفار نے پیدا کیں وہ اُن موانع کی بہ نسبت کہیں کم اور بے ضرر تھیں جو منافقین کی بدولت پیش آئیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کفار کی بھی اکثر معاندانہ کارروائیاں انہیں منافقین کی خفیہ ریشہ دوانیوں کی رہین منت ہوا کرتی تھیں۔ انہوں نے مشرکین کو لڑائی پر اُبھارا، غزوات میں مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں سے نقصان پہنچایا، رسول اللہ اور صحابہ کرامؓ کی توہین و تذلیل کی، وطن اور حسب نسب کے جھگڑے برپا کر کے مسلمانوں کی جمعیت پراگندہ کرنے کے لئے کوشش کیں، تقسیم غنائم کے موقع پر کمزور ایمان رکھنے والے کو رسول اللہ سے بدظن کیا۔ اسلامی نظام کے تندرست پیکر میں طرح طرح کے وبائی جراثیم داخل کرنے کی سعی کی۔ بغرض ضرر رسانی کے جتنے طریقے ممکن ہو سکتے تھے ان میں کسی کو بھی فتنہ و شیطنت کے ان علمبرداروں نے باقی نہ اُٹھا رکھا۔ کفر تو اسلام کے مقابلہ میں بے نقاب آتا ہے۔ ڈنکے کی چوٹ پر اپنی عداوت کا اعلان کر کے کھلے میدان میں دعوتِ پیکار دیتا ہے۔ لیکن نفاق پیشانی پر دوستی اور رفاقت کا لیبل لگا کر اسلام کے گھر میں بیٹھ کر صدہا طریقوں سے اس کی بیخ کنی کرتا ہے اور اس انداز میں کہ نگاہِ ظاہر بین کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا پھر غور فرمائیے کہ کفر کے مقابلہ میں نفاق کی خطرناکیاں کتنی زیادہ کتنی بے پناہ اور کیسی کارگر ہوں گی۔ دن کی روشنی میں زمین پر پڑے ہوئے بڑے سے بڑے اژدہے کو مار ڈالنا کچھ مشکل نہیں ہوتا لیکن جو ناگن آستین میں چھپی بیٹھی ہو اس

کے زہر سے بچنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔

غرضیکہ یہ تھا اس جماعت کا موقف تقسیم ہند سے پیشتر۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مرزائی حضرات کی کیفیت یہ ہے کہ مسلمانوں کو کافر بھی کہتے ہیں اور مسلمانوں کی مراعات میں برابر کے شریک بھی ہو جاتے ہیں یہی حالت اسلامی جماعت کی ہے۔ وہ عمر بھر مسلمانوں کو منافق قرار دیتے تحریک پاکستان کی مخالفت کرتے اور ان کی قیادت میں کیڑے ڈالتے رہے۔ لیکن تشکیل پاکستان کے بعد پاکستان کے سب سے بڑے حامی

تشکیلِ پاکستان کے بعد

بن بیٹھے۔ لیکن یہ حمایت بھی دراصل اسی تخریب کے لئے ہے جس کی تبلیغ وہ لمبے عرصے سے کرتے چلے آتے ہیں۔ انہوں نے اب صرف پینترا بدلا ہے۔ اب وہ نہایت غم خوارانہ انداز میں ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر کہتے ہیں کہ اگر مسلمان ہماری مان لیتے تو مصیبتوں کے پہاڑ ان پر کیوں ٹوٹتے؟ اور اس کا مقطع کا بند اوہی ہوس قیادت!

مرزائی حضرات کی کیفیت یہ ہے کہ جب کبھی مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ جھٹ مرزا صاحب کی کتابوں کے اوراق الٹنے شروع کر دیتے ہیں اور کوئی نہ کوئی پیش گوئی نکال کر خوش ہو جاتے ہیں کہ اس سے مرزا صاحب کی صداقت کی ایک اور دلیل مل گئی۔ یعنی انہیں مسلمانوں کی اس مصیبت سے دکھ نہیں پہنچتا، اس چیز سے خوشی ہوتی ہے کہ وہ مصیبت مرزا صاحب کی صداقت کی دلیل بن گئی۔ گذشتہ سال اور اس کے بعد مسلمانانِ پاکستان پر جو قیامتیں ٹوٹیں ان میں اسلامی جماعت کے ارکین کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ ہر نئی مصیبت پر مسلمانوں کو طعنے دیتے تھے کہ اور اتباع کرو اپنی قیادت کی۔ دیکھا امیرِ جماعتِ اسلامی نے کتنا عرصہ پیشتر کہہ دیا تھا کہ

اس غلط قیادت کے نتائج بہت مہلک ہونگے۔ یعنی جب مسلمانوں کے گھروں میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تب یہ خوش ہوتے ہیں کہ ان کے امیر کی سیاسی بصیرت کی داد مل گئی۔

یہ ہے مختصر سا خاکہ اس جماعت کا جو اپنی مثیل جماعت (مرزائیوں) کی جگہ لے رہی ہے۔ سادہ لوح مسلمان پھر ایک بار فریب کھا رہا ہے کہ یہ جماعت نہایت مقدس عزائم کی حامل ہے۔ اس کی مخالفت خدا اور رسول ﷺ کے پیغام کی مخالفت ہے۔ اس کا قانونِ شریعت کا مطالبہ کس قدر صحیح اسلامی روح کا آئینہ دار ہے چنانچہ وہی مسلمان جو ہر "تیز رَو" کے ساتھ تھوڑی دُور چلنے کا عادی ہو چکا ہے اس گروہ کے ساتھ بھی چل رہا ہے اور دل میں سمجھ رہا ہے کہ یہ راہ ٹھیک کعبے کی طرف لے جائے گی۔ لیکن نہیں سمجھتا کہ جس تحریک کی بنیاد مسلمانوں کے خلاف جذبۂ منافرت پھیلانے پر قائم کی گئی ہو، جو نظریۂ پاکستان کی اس درجہ مخالف رہی ہو، جو ان کی قیادت کے خلاف ایسا کھُلا کھُلا زہر اگل چکی ہو، اُن کے دل میں مسلمانوں کی بہی خواہی کا درد کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک موجودہ مسلمانوں کا عدم اور وجود برابر ہے اس لئے مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ آخرالامر یہ تحریک اُس تحریک سے بھی کہیں زیادہ نقصان رساں اور خطرناک ثابت ہو گی جس کی یہ ظل و بروز اور (MODERN FORM) ہے اس سے بھی زیادہ مہلک اس لئے کہ اُس تحریک کا مقصد مسلمانوں میں محض تشتّت و انتشار پیدا کرنا اور انہیں جذبۂ جہاد سے بیگانہ بنا دینا تھا اُن کی سیاسی قیادت حاصل کرنا نہیں تھا۔ اِس کے برعکس، اِس تحریک کا سب سے پہلا مقصد سیاسی قیادت کا حصول ہے اور اس کے لئے ان کا صغریٰ و کبریٰ بالکل واضح ہے۔

ہوسِ قیادت

۱۔ مسلمانوں کی موجودہ قیادت انہیں جہنم کی طرف لے گئی اور لے جا رہی ہے۔

۲۔ قیادت کے اہل حاملینِ شریعت ہیں اور

۳۔ ان میں سب سے بلند مقام جماعتِ اسلامی کو حاصل ہے۔

۴۔ نتیجہ واضح ہے۔

ان حقائق کو سامنے رکھیئے اور پھر سوچیئے کہ اس جماعت کے مقاصد کیا ہیں۔ یاد رکھیئے اگر اس جماعت کو تقویت حاصل رہی تو یہ نہ مملکتِ پاکستان کو مستحکم ہونے دے گی نہ یہاں کسی حکومت کے پاؤں جمنے دے گی نہ کوئی نظام چلنے دے گی، اِلّا یہ کہ زمامِ حکومت خود ان کے ہاتھ میں رہے اور جس نظام کو یہ شرعی نظام قرار دیں وہ نظام اِن کے ہاتھوں سے نفاذ پذیر ہو جب تک یہاں کوئی نظام جدید رائج نہیں ہوتا، یہ شرعی نظام کا مطالبہ کرتے رہیں گے اور اگر مسلمانوں نے کوئی اسلامی نظام وضع کر لیا تو اِن کی طرف سے یہ اعتراض شروع ہو جائے گا کہ اُس نظام کو چلانے والوں کی سیرت اسلامی نہیں لہٰذا اُن کا نافذ کردہ نظام بھی صحیح اسلامی نظام نہیں قرار پا سکتا۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ سوچیئے کہ اس چیز سے مطمئن ہو جانا کہ چونکہ ان لوگوں نے (غالباً مودودی صاحب کی گرفتاری کے لئے) اپنے مطالبہ اور اس کے حصول کی جدّ و جہد کو معرضِ التواء میں ڈال دینے کا وعدہ کر لیا ہے، اس لئے اب خطرہ کی کوئی بات نہیں، اپنے آپ کو کس قدر غلط فہمی میں مبتلا رکھنا ہے۔ ان کا یہ پروگرام محض ہنگامی نہیں بلکہ اس پر تو ان کی جماعت کے وجود کا قیام ہے۔ باقی رہی ان کی یہ رجعت، تو یہ بھی اُس تحریک کی تقلید میں ہے جس کی یہ مثیل ہے۔ جب مرزا صاحب یہ

مقدمہ چلایا گیا تو انہوں نے عدالت میں معافی مانگ لی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ میں آئندہ اپنی پیش گوئیوں کی اشاعت نہیں کروں گا۔

اسی طرح امیر جماعت اسلامی نے جب دیکھا کہ جنگ کشمیر کے معاملہ میں ان کے فتویٰ سے معاملہ نزاکت اختیار کر گیا ہے تو انہوں نے بھی جھٹ اس سے رجعت فرمالی اور اس تبدیلیٔ فتویٰ کے لئے اس قسم کے لاطائل دلائل اور رکیک تاویلات سے کام لیا جن پر عقل روتے اور بصیرت ماتم کرے۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ وہ اپنے معافی نامہ میں اس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ مسلمانوں کی قیادتِ عظمیٰ کے متعلق انہوں نے برسوں جو زہر افشانی کی ہے وہ ہر اُس شخص کے سامنے ہے جو ان کی تحریروں کا مطالعہ کرتا رہا ہے۔ دور کیوں جائیے ترجمان القرآن کے دورِ جدید (اشاعتِ لاہور) میں انہوں نے پہلے پرچہ سے اُن تباہیوں اور بربادیوں کو گنانا شروع کر دیا جو ان کے نزدیک مسلمانوں کی غلط قیادت کا نتیجہ ہیں۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں تحریر فرمایا کہ :-

رجعت

> مسلمانوں نے اپنی ساری قومی طاقت اپنے تمام ذرائع اور اپنے جملہ معاملات اُس قیادت کے حوالے کر دیئے ہیں جو ان کے مسئلہ کو اس طرح حل کرنا چاہتی تھی دس برس کے بعد آج اس کا پورا کارنامہ ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کس طرح کس صورت میں ہمارے مسئلہ کو حل کیا جو کچھ ہو چکا ہے وہ تو اَمنٹ ہے اب اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اس پر اس حیثیت سے تو بحث بے کار ہے کہ یہ نہ کیا جاتا تو کیا ہوتا۔ البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل ہمیں اب درپیش ہیں کیا ان کے

حل کے لئے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلہ
کو اس طرح حل کر چکی ہے؟ کیا اس کا اب تک کا کارنامہ یہی سفارش کرتا ہے
کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آن پڑے ہیں جن کا
بیشتر حصّہ خود اس قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے انہیں حل
کرنے کے لئے ہم اس پر اعتماد کریں۔

منافقت سُن لیا آپ نے کہ مسلمانوں کی قیادت کے متعلّق کس رائے کا
اظہار کیا جا رہا ہے لیکن اس کے تھوڑے عرصے بعد جب مسلۂ
کشمیر کے سلسلہ میں قانونی گرفت کا تصوّر آیا تو (قائدِ اعظم کی وفات پر) اسی قیادت
کے متعلّق ارشاد ہوا کہ:-

ان کی شخصیت پچھلے دس بارہ سال سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مرکز و محور
بنی ہوئی تھی ساری قوم ان پر مجتمع تھی۔ ان کی راہ نمائی پر سب کو بھروسا تھا ان
ہی کے ذاتی اثر و رسوخ نے تمام مختلف عناصر کو جوڑ کر مسلمانوں کو ایک مُتحِد
قوم بنایا تھا۔ ان ہی کے اعتماد پر قوم نے اپنی پوری طاقت اس جدّوجہد میں
لگا دی تھی جس کے نتیجے میں آخر کار پاکستان قائم ہُوا اور قیامِ پاکستان کے
بعد اس نئی مملکت کی عمارت جس مضبوط ستون کے سہارے پر تعمیر ہو رہی تھی،
وہ بھی ان ہی کی جامع اور معتمد علیہ شخصیت تھی۔ صرف ملک کے اندر ہی
نہیں بلکہ ملک کے باہر بھی پاکستان کی جو ساکھ اور دھاک تھی وہ زیادہ تر اسی
آزمودہ کار کی بدولت تھی۔ کوئی دوسری شخصیت ہمارے ہاں ایسی نہیں کہ
اس کے وقار اور تدبّر کو بین الاقوامی برادری میں اس درجہ بھروسا اور اعتبار

کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ دُنیا کے لئے تو مرحوم کی وفات محض ایک بڑے اور مشہور راہ نما کی رحلت ہے مگر ہمارے لئے یہ ایک بہت بڑی قومی مصیبت ہے کیونکہ اس سے ہماری نوخیز مملکت کی طاقت اور ہماری قومی زندگی کو ایسا صدمہ پہنچا ہے جس کی تلافی مشکل نظر آتی ہے۔ الا یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمائے اور ہماری مدد کرے۔ (ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۴۸ء)

پہلے اُن خیالات کو دیکھئے جن میں اِسی قائدؒ اور اِس کے رفقائے کار کو منافقین کے گروہ میں شامل کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اُن خیالات کو جن میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ یہ تمام تباہیاں اور بربادیاں اسی قائد کی غلط قیادت کا نتیجہ ہے اور پھر مسلمانوں سے پُوچھا گیا کہ کیا ایسے قائد کی قیادت بھروسا اور اعتماد کے قابل ہے۔ اور پھر اُسی قائد کے متعلق اُن خیالات کو دیکھئے جن کا اظہار معاملہ کی قانونی نزاکت کے احساس کے بعد مندرجہ بالا الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ان سب کا موازنہ کیجئے اور پھر اندازہ لگائیے اس شخص کی سیرت کا جو پیغمبرانہ انداز میں منافقین (مسلمانوں) کو ازسرِ نو مسلمان بنانے کا مدعی ہے۔

نازک جذبات | ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ان جذبات کو اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں جو اس کے پڑھنے والے اُن نوجوانوں کے دلوں میں موجزن ہونگے جو اس تحریک کو اپنے خلوص اور دیانت کی بنا پر فی الواقع رُوحِ اسلامی کا پیکر سمجھے ہوئے ہیں اُن کا غم و غصہ اپنی جگہ بجا ہے اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کے خلوص اور قوتِ فیصلہ پر حرف آتا ہے اور ان کی

عقیدت کو ٹھیس لگتی ہے لیکن یہ غم و غصہ ویسا ہی ہے جیسا اُن لوگوں کے دلوں میں،
جو نہایت خلوص اور نیک نیتی سے تحریکِ مرزائیت کو سچا سمجھ کر اس میں داخل ہو
چکے ہوں اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی اس تحریک کو بے نقاب کرکے ان کے
سامنے پیش کرے۔ یہ انسانی جذبات کا تقاضا ہے لیکن اسے اچھی طرح سے سمجھ
لیجیے کہ کوئی تحریک، نظریہ، عقیدہ یا اُصول محض اس لئے مبنی بر صداقت نہیں ہو سکتا
کہ اس کے اختیار کرنے والوں نے اسے نہایت خلوص اور دیانت سے اختیار کیا ہے۔
اس طرح تو دنیا میں کوئی تحریک، کوئی نظریہ، کوئی عقیدہ اور کوئی اصول بھی غلط اور باطل
قرار نہیں دیا جا سکے گا جو کچھ ہم نے لکھا ہے، کوشش کیجیئے کہ آپ اسے ٹھنڈے دل سے
پڑھ سکیں اس کے بعد سوچیئے کہ کون سی راہ درست ہے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ
کی وہی رائے ہو جو اس سے پہلے تھی تو بڑے شوق سے اپنی رائے پر قائم رہیئے۔

فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ٦/١٠٥

ہم سب ایک جیسے ہیں

یاد رکھیئے ہم سب مسلمان اجتماعی طور پر ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ سب ایک
ہی ماحول کے پروردہ اور ایک جیسی ملی مجبوریوں میں ماخوذ۔ ہم میں سے کسی کی بھی
یہ پوزیشن نہیں جو دوسروں سے کہے کہ میں مسلمان ہوں اور تم منافق ہو۔ یہ حق صرف
رسول کو پہنچتا ہے جو اپنے ماحول سے متاثر نہیں ہوتا اور اس لئے درحقیقت
اُن میں سے نہیں ہوتا جن میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا اس مقام کا مدعی ہے
تو وہ (خواہ مرزا صاحب کی طرح) زبان سے اس کا اعلان کر دے یا (مودودی
صاحب کی طرح) لفظاً اس کا دعوٰی نہ کرے لیکن عملاً اپنے آپ کو اس مقام

پر سمجھے تو یہ پیغمبرانہ شان کا ادعا ہے۔ ہمارا صحیح مقام یہ ہے کہ ہم سمجھیں کہ ہم سب مسلمان ایک ہی مصیبت میں گرفتار ہیں اور ایک ہی ماحول کے مقید ہیں۔ آؤ ہم سب مل جل کر کوشش کریں کہ اس غلط ماحول کو بدل کر اس کی جگہ صحیح اسلامی فضا پیدا کریں۔ اس باب میں ہم میں سے جو لوگ صاحبِ فکر و نظر ہوں گے اُن کا کام اس قسم کی تجاویز سوچنا ہوگا جو ہمیں اس تبدیلیٔ احوال پر قادر کر دیں۔ یہی ان کا طرۂ امتیاز ہوگا۔ یہ ہے صحیح راہِ عمل، نہ یہ کہ اپنے متبعین کو "اسلامی جماعت" کے افراد اور باقی مسلمانوں کو جہنم کا ایندھن تصور کرلیں اور ان سب کو ذلت کی نگاہ سے دیکھیں۔ یہ نفس کا دھوکا ہے۔ یہ مذہب اور حق پرستی کی آڑ میں ابلہ فریبی ہے۔ یہ وہ مسلک ہے جس کے متعلق خود ترجمان القرآن نے لکھا تھا:۔

> منافقین کا ایک طبقہ وہ تھا جو مسلمانوں کی جماعت میں محض تفریق اور فتنہ و فساد برپا کرنے کی خاطر اسلام کا لیبل لگائے رہتا تھا۔ یوں تو جماعتی زندگی کے لئے تفرقہ عموماً مُضرّت رساں ہوتا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ جو تفرقہ مذہب اور حق پرستی کی آڑ میں نمودار ہوتا ہے وہ ایسا زہر ہلاہل ہے جس کا کوئی تریاق نہیں۔

یہ تو غنیمت سمجھئے کہ ہندوستان میں اس جماعت کو کوئی طاقت حاصل نہیں ہوئی اور جمہور مسلمان اس کے پیچھے نہیں چلے ورنہ سوچئے کہ اگر اُس وقت مسلمان پاکستان کی مخالفت میں ان کے ہم نوا ہو جاتے تو اس کا نتیجہ پوری کی پوری قوم کی ہلاکت کے سوا اور کیا ہوتا۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ اس وقت جو کچھ ہندو اور انگریز کرتا ہے کرنے دو، تم بے فکر ہو کر اپنے

غنیمت ہے کہ

اخلاق سنوارنے میں لگے رہو۔ جب تم اس طرح اصلاح یافتہ ہو جاؤ گے تو دنیا کی سلطنتیں تمہارے قدموں میں آجائیں گی۔ اگر مسلمان ان کی مان لیتا اور بساطِ سیاست کو ہندو اور انگریز کے سپرد کر دیتا یا نیشنلسٹ قسم کے مسلمانوں کے حوالہ کر دیتا تو اُس وقت پورے کے پورے دس کروڑ مسلمانوں کی وہی حالت ہوتی جو ہندوستان میں باقی رہ جانے والوں کی ہو رہی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اس لئے کہ پاکستان کی تشکیل کے بعد ہم پھر بھی اس قابل ہیں کہ اپنی آواز دنیا تک پہنچا سکیں اور اس دوران میں اپنی دفاعی قوتوں کو مضبوط کر کے مستقبل میں اپنی حفاظت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی حفاظت کا سامان بھی مہیا کر سکیں لیکن اگر اس اسلامی جماعت کے مواعظِ حسنہ کے تصدق ہم مقدمۂ پاکستان سے خود ہی دست بردار ہو جاتے تو آج ہندو سیاست کا کابوس اس طرح ہمارا گلا دبائے ہوتا کہ ہماری آواز تک نہ نکل سکتی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ حیدر آباد کے مسلمانوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ حالانکہ وہاں حکومت اُن کی اپنی تھی۔ ہم بھی غیر تقسیم شدہ ہندوستان میں تقریباً اتنے ہی فیصدی ہوتے جتنے حیدر آباد کے مسلمان وہاں کے ہندوؤں کے مقابلہ میں تھے یہ تو محض اللہ کا احسان ہے کہ اس نے قائد اعظم (مرحوم) کی آواز میں ایسا اثر پیدا کر دیا کہ ان کے سامنے کسی دوسرے کا چراغ جلنے ہی نہیں پایا اور وہ اس طرح بساطِ سیاست پر اتنا بڑا مقدمہ جیت گئے ورنہ مسلمانوں کی ہلاکت اور بربادی کے لئے کچھ کم سامان بہم نہیں پہنچائے جا رہے تھے۔ مسلمانوں کے خمیر میں مذہب پرستی ہے اس لئے ہماری سیاسی تگ و تاز میں قومیت پرست علما کا گروہ ایک فتنۂ عظیم کا موجب تھا۔ ان کی زبانوں پر دن رات قال اللہ وقال الرسول تھا۔ یہ وہ قال ہے

جس پر مسلمان اپنا سب مال فدا کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اس فتنہ سے مسلمان خدا خدا کر کے بچا۔ اس لئے بھی کہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم سمجھنے کا جو تصور وہ پیش کرتے تھے وہ خود مسلمانوں کی فطرت کے خلاف تھا۔ اس لئے مسلمان کے اس غیر شعوری جذبہ کے مقابلہ میں ان کا قال اللّٰہ اور قال الرسول بھی ناکام رہا لیکن مودودی صاحب پاکستان کی مخالفت میں اس کمزور پہلو کی مدافعت کا سامان بہم پہنچا کر باہر آئے تھے۔ انہوں نے متحدہ قومیت کی پہلے ہی مخالفت کرنی شروع کر دی تھی۔ (حالانکہ اس سے پہلے یہ جمعیت العلماء کے اخبار "الجمعیت" کے حلقۂ ادارت میں تھے اس لئے جو اعتراضات نیشنلسٹ علماء پر وارد ہوتے تھے وہ ان کی زد سے باہر ہو چکے تھے لہٰذا جس انداز سے انہوں نے مسلمانوں کو اپنی طرف بلانا شروع کیا وہ نیشنلسٹ علماء کے طریق و اسلوب سے زیادہ جاذب، معصوم اور نگاہ فریب تھا۔ اور بہت کم لوگ تھے جو یہ بھانپ سکے کہ اس دعوت سے مقصود بھی مسلمانوں کو مقدمۂ پاکستان سے الگ رکھنے کی کوشش ہے۔ جمعیت العلماء کے افراد چونکہ کھلے بندوں نیشنلسٹ بن کر سامنے آئے تھے اس لئے تشکیلِ پاکستان کے بعد ان کا مسلمانوں میں گھل مل جانا مشکل تھا لیکن اسلامی جماعت کے افراد (مرزائی حضرات کی طرح) یکسر پاکستانی بن گئے۔ اس سے کسے انکار ہے کہ تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں ہم سے غلطیاں بھی ہوئیں ہماری قیادت سے بعض معاملات میں سہو بھی ہوا اور طلوعِ اسلام نے بار بار ان چیزوں کو واضح کیا ہے) اس لئے کہ یہ قیادت انسانوں ہی پر مشتمل تھی۔ اس لئے ان سے غلطیوں کا امکان تھا پھر اس میں بھی کلام نہیں کہ ہماری اخلاقی حالت بہت پست ہے ہم میں بڑی کمزوریاں ہیں۔ ایسی کمزوریاں کہ مسلمان تو ایک

طرف عام سطح کے انسانوں میں بھی نہیں ہونی چاہئیں۔ لیکن یاد رکھیئے ان کے متعلق کسی

یہ سب درست

ایسے شخص یا جماعت کا بتایا ہوا علاج کبھی صحیح علاج نہیں ہو سکتا جو تشکیل پاکستان سے پہلے پاکستان کے خلاف تھا۔ اس کے دل میں پاکستان کا درد نہیں ہو سکتا۔ وہ پاکستان کو اپنی سابقہ روش کی تکذیب کا موجب سمجھتا ہے۔[1]

پاکستان کا مستقبل بڑا درخشندہ ہے بشرطیکہ یہ ان "ناصحینِ مشفق" کی کرم فرمائیوں سے محفوظ رہا جو شروع سے اس تحریک کے درپے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان بے پناہ مصائب کی وجہ سے پریشان دماغ ہو رہا ہے اس لئے بعض اوقات بدنظمی اور قنوطیت کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں لیکن ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں

دل بخوں مثلِ شفق باید زدن　　　دست در فتراکِ حق باید زدن!

جاں ز اُمید است چوں جوئے رواں　　　ترکِ اُمید است مرگِ جاوداں

اسی میں کامیابی کا راز ہے۔ واللّٰہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب۔

---

[1] اس کی توبہ کو اسی صورت میں محکم اور قابلِ اعتماد سمجھا جا سکتا ہے جب وہ ایک عرصے کے مسلسل عمل سے اس حقیقت کو ثابت کر دے کہ وہ فی الواقع دل سے تائب ہو چکا ہے اور اپنی سابقہ روش پر نادم اور متأسف ہے۔

صحیح اور غلط قیادت

(دسمبر ۱۹۴۹ء)

طلوعِ اسلام اور جماعتِ اسلامی

اسلامی جماعت کے موقف، مسلک اور منہاج کے متعلق

طلوعِ اسلام میں اس سے قبل اکثر مرتبہ لکھا جاچکا ہے اس لئے قارئینِ طلوعِ اسلام، اس باب میں ہمارے نقطۂ نگاہ سے بھی واقف ہوگئے ہیں لیکن ان تمام تصریحات کے باوجود یہ سوال اکثر دہرایا جاتا ہے کہ جب طلوعِ اسلام بھی اسلامی نظام کا داعی اور مبلّغ ہے۔ اس کی شروع سے یہی پکار چلی آتی ہے کہ ہر وہ نظامِ معاشرت وحکومت جو غیر قرآنی خطوط پر متشکل ہے، طاغوتی نظام ہے، اور اسی بنا پر وہ مسلمانوں کی موجودہ قیادت پر کبھی مطمئن نہیں ہوتا اور ان کے ہر مذموم فیصلہ پر کڑی سے کڑی تنقید کرتا ہے اور یہی کچھ اسلامی جماعت کا مسلک وعمل ہے، تو پھر طلوعِ اسلام اسلامی جماعت کا ہم مسلک وہم نوا کیوں نہیں بنا۔ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، اس سوال کا جواب اس سے پیشتر کئی مرتبہ دیا جاچکا ہے لیکن چونکہ اس سوال کو بار بار ہمارے سامنے لایا جاتا ہے، اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس موضوع پر ایک مرتبہ پھر مختصر انداز سے گفتگو کی جائے۔

طلوعِ اسلام کی اسلامی نظام کی طرف دعوت کسی تشریح وتبصرہ کی محتاج نہیں۔ اس کا وجود ہی اس مقصدِ عظیم کے لئے عمل میں آیا ہے۔ باقی رہی موجودہ قیادت پر اس

کی تنقید، سو اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ "چراغِ راہ" کے زیرِ نظر "قیادت نمبر" میں خود طلوعِ اسلام کا ایک پورا مضمون بہ تبدیلیٔ عنوان شامل ہے۔ لیکن اس کے باوجود طلوعِ اسلام کو جماعتِ اسلامی سے اختلاف ہے۔ یقیناً یہ امر موجبِ حیرت و استعجاب ہے اور اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ اس وجہ اختلاف کو ایک بار پھر واضح کر دیا جائے۔

ہمارے نزدیک مسلمانوں کی قوم یکسر جذباتی قوم بن چکی ہے۔ اسی کو ہم دوسرے الفاظ میں شاعروں کی قوم کہا کرتے ہیں۔ یہ پوری کی پوری قوم شاعروں کی قوم ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں شاعری کرتی ہے۔ شاعری سے مراد یہ نہیں کہ یہ شعر کہتی ہے اور نظمیں لکھتی ہے، بلکہ یہ کہ زندگی کے مخصوص حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے یہ قوم جذبات کی دنیا میں مست ہے۔ اس میں سنجیدہ فکر اور متین تدبّر کی صلاحیت نہیں رہی۔ اس کا دماغ مجلۂ تجلیات کا "افسانہ نمبر" بن چکا ہے۔ انہیں اس سے غرض نہیں کہ واقعات کی دُنیا میں کیا ہو رہا ہے، زندگی کے تقاضے کیا کہہ رہے ہیں، دنیا کی قومیں کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہیں، ان میں ہمارا مقام کیا ہے اور ہم اس مقام پر کیوں ہیں؟ انہیں ان سوالات سے کچھ غرض نہیں۔ انہیں زندگی کے ان تقاضوں اور وقت کے ان مطالبوں سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ حالت ہمیشہ اُس قوم کی ہوتی ہے جن میں قوتِ عمل مفقود ہو چکی ہو، جن کے قوائے عملیہ مفلوج و مشلول ہوں۔ زندگی کے ٹھوس حقائق عمل کے مقتضی ہوتے ہیں۔ عمل سے عاری قومیں اپنے آپ کو جذبات کی افیون سے فریب دے لیتی ہیں۔ اس افیونی فریب میں مذہب کا غلط تصور جزوِ اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔

غلط مذہب کی افیون

لہ۔ یہ مضمون جماعتِ اسلامی کے رسالہ "چراغِ راہ" کے قیادت نمبر پر تبصرہ کے سلسلے میں لکھا گیا تھا۔

جذبات کی افیون خوردہ قوم کو اپنے پیچھے لگا لینا بڑا آسان ہوتا ہے۔ حقائق کی دنیا میں رہنے والی قوم ہر پکارنے والے کی پکار کو نتائج سے پرکھتی ہے، وہ صرف اُسی کی سنتی ہے جس کی آواز کوئی ٹھوس نتیجہ سامنے لے آئے تو وہ اسی کے پیچھے چلتی ہے جو اُن کی مشکلات کا عملی حل ان کے سامنے رکھ دے۔ اس کے برعکس جذبات زدہ قوم کو اپنے پیچھے لگا لینے کے لئے چند ولولہ انگیز نعروں، چند حسین ترکیبوں، چند نگاہ فریب نظریوں اور چند خوش آیندہ وعدوں کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چونکہ، جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے، اس فریب خوردگی میں مذہب کے غلط تصور کو سب سے بڑا دخل ہوتا ہے، اس لئے ان خوش آئند نظریوں اور نگاہ فریب وعدوں کو اگر مذہب کے رنگ میں رنگ دیا جائے تو اس طلسمِ ہوش رُبا کی کامیابی میں کوئی شبہ ہی نہیں رہتا۔

جذبات پرستی

یہی وہ آسان راستے ہیں جن سے ہر رہزنِ مُلک پا جاتا ہے اور ان کی متاعِ دین و دانش کو نہایت اطمینان سے لوٹ کر لے جاتا ہے اور انہیں خبر بھی نہیں ہونے پاتی کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے نہیں! اتنا ہی نہیں کہ انہیں خبر بھی نہیں ہونے پاتی بلکہ یہ افیون ان کے نگاہ کے زاویوں کو اس طرح بدل دیتی ہے کہ یہ رہزن کو مشفق اور قزاق کو سب سے زیادہ ہمدرد سمجھتی ہے۔ ان رہزنوں کے علاوہ جو دیدہ و دانستہ ان کے متاعِ ملی کو غصب کرتے ہیں، ایک طبقہ نادان دوستوں کا بھی ہوتا ہے جو ان کی جذباتی افیون کو تیز سے تیز تر کرتا رہتا ہے اور انہیں کبھی ہوش میں نہیں آنے دیتا۔

یوں تو ساری دُنیا کے مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے لیکن سرِدست ہمارے پیشِ نظر صرف ہندوستان (اور اب پاکستان) کے مسلمان ہیں۔ ان کی گذشتہ

ایک سو سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالیئے اور سوچئے کہ ان دانا دشمنوں اور نادان دوستوں نے جن کی طرف ادپر اشارہ کیا جا چکا ہے کس بُری طرح ان کے جذبات کو لوٹا اور کھسوٹا ہے۔ سوچئے اور بار بار سوچئے کہ ان کے سفرِ حیات میں کتنے ایسے مقام آتے ہیں جہاں چند نعروں سے مدہوش کر کے پُوری کی پُوری قوم کو تباہ کرا دیا گیا۔ سوچئے کہ ان کی سو سال کی مختلف تحریکوں کا ماحصل کیا ہے؟ یہ سیماب پا قوم، چند گرم گرم نعروں کی حرارت سے کس طرح بگولے کی طرح اٹھتی رہی ہے اور اس کے بعد کس بُری طرح آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتی رہی ہے۔ غور کیجئے کہ اس کے اس قسم کے جوش و خروش کا ردِ عمل کیا ہوتا رہا ہے؟ ان ہنگامہ خیزیوں اور خوغا آرائیوں کو کبھی چھوڑ دیجئے اور اسے دیکھئے کہ مذہب کے غلط تصورات نے ان کی زندگی کے تمام حرکات و سکنات کو کس درجہ بے نتیجہ بنا رکھا ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں، خود ہی سوچئے کہ مذہب کے غلط تصورات کے جس فریب میں قوم کو مبتلا رکھا جا رہا ہے؟ ان کی تباہی اور بربادی میں کتنا بڑا دخل ہے۔

یہ ہے مسلمانوں کی وہ جذبات زدہ قوم، جسے ہر وہ شخص جو چند فقرے لکھنا یا چند الفاظ بولنا جانتا ہو، نہایت آسانی سے اپنے پیچھے لگا لیتا ہے نہیں! بلکہ اکثر اوقات ان متبوعین کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ وہ لکھنا اور بولنا بھی جانتے ہوں۔ اس بھولے شکار کے لئے تو تراش خراش کے مخصوص انداز اور وضع قطع کے خاص اسلوب کا جال اور دانہ ہی کافی ہے۔ یاد رکھیئے اس قوم کا سچا بہی خواہ ہو سکتا ہے جو اسے جذبات کی دُنیا سے نکال کر دو اور دو چار کہنا اور سمجھنا سکھائے اور الفاظ کا مفہوم نتائج سے پرکھنا بتائے۔ ہمیں اس کا خُوب احساس ہے کہ جذبات کے بعد یہ دنیا مشین رہ جاتی ہے اور عمل، جذباتِ صحیحہ ہی سے پیدا ہوتا ہے لیکن جذبات کی جس افراط میں ہماری قوم مبتلا ہے،

اس کا علاج یہی ہے کہ ان سے یہ افیون کسی طرح سے چھڑا دی جائے۔ سرسام کا علاج، سر پر برف رکھنا ہوتا ہے۔ جب درجۂ حرارت اعتدال پر آجاتے پھر آپ گرم اور سرد دونوں قسم کی فضاؤں میں رہ سکتے ہیں۔ اس وقت قوم سرسام زدہ ہو رہی ہے۔

حقائق کا سامنا

اسے جذبات سے الگ کر کے حقائق کا سامنا کرنے کا خوگر بنانا ازبس ضروری ہے۔ اس سو سال کے عرصہ میں ایسے دیدہ ور بھی گزرے ہیں جنہوں نے قوم کے اس مرض کا صحیح اندازہ کیا اور انہیں حقائق سے دوچار ہونے کی دعوت دی۔ ہماری گردن تشکر اُن کے اس احسان کے احساس سے خمیدہ ہے۔ ہمیں اِس وقت اُن تمام صاحبانِ فکر و عمل کا تذکرہ مقصود نہیں، صرف اُس آخری چارہ گر کی طرف اشارہ منظور ہے جس کی نگہ دُور رس اور حقائق پرور کی وجہ سے ہم آج اس قابل ہیں کہ ایک خطۂ زمین پر خدا کے احکام نافذ کر سکنے کا امکان پاتے ہیں۔ غور کیجئے کہ سن ۱۹۲۰ء سے آگے چل کر مسلمانوں کی سیاست کس طرح جذبات کی تلاطم انگیزیوں میں بہے چلی جا رہی تھی اور ہندو ان کی اِس مدہوشی سے کس طرح فائدہ اٹھا رہا تھا۔ یہ قوم کی خوش بختی تھی کہ عین اُس وقت فکرِ اقبال کی شمع قائدِ اعظم (مرحوم و مغفور) جیسے تبرو آزما ہاتھوں میں آگئی۔ جذبات کی شر انگیزیاں ان کی فطرت کے خلاف تھیں، وہ حقائق

اقبالؒ اور جناحؒ

کا سامنا جذبات سے یکسر الگ ہو کر کیا کرتے تھے۔ ان کی دہ سالہ بساطِ سیاست پر غور کیجئے۔ اس میں ایسے ایسے مقام آتے کہ ان کی جگہ کوئی بھی اور ہوتا تو جذبات کے سیلِ بے پناہ میں بہہ جاتا۔ ہندو یہی چاہتا تھا لیکن یہ ہماری خوش بختی تھی کہ قدرت نے انہیں مزاج ہی ایسا دیا تھا کہ ان کی فکر کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوتی تھی۔ وہ مسلمانوں جیسی سراپا ارتعاش قوم کو جذبات کی شعلہ فشانیوں

سے نکال کر حقائق کی دُنیا میں لے آئے یہی اُن کا وہ کمالِ سیاست تھا جس کے سامنے
ہندو کو قدم قدم پر زک اٹھانی پڑی۔

لیکن عین اُس وقت جب وہ مردِ فرزانہ قوم کو اسطرح جذبات کی شر انگیزیوں سے
نکال کر واقعات کی ٹھوس دنیا میں لا رہا تھا اسلامی جماعت وجود میں آئی اور اس نے

جماعتِ اسلامی

مسلمانوں کے انہی جذبات سے پھر کھیلنا شروع کر دیا جن میں
وہ اتنے عرصہ سے اُلجھی چلی آ رہی تھی۔ "جناح کی قیادت
بے دینی قیادت ہے"۔ "یہ نماز نہیں پڑھتا" "روزے نہیں رکھتا" "ڈاڑھی منڈاتا ہے" "سوٹ
پہنتا ہے"۔ "اسے مذہبی معلومات نہیں" وغیرہ ذالک۔ یہ تھے وہ "سلوگن" جن سے
مسلمانوں کے جذبات کو ہوا دی گئی۔

جناح کو کبھی مذہب پرستی کا دعویٰ نہیں تھا اس کے حامیوں نے اسے کبھی مذہبی
پیشوا نہیں مانا۔ سوال ایک سیدھا سا سامنے تھا۔ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ
ہو رہا تھا۔ ہندو کا مطالبہ تھا کہ پورے ملک پر اس کی اکثریت کی حکومت رہے۔ اس
حکومت کے تابع مسلمانوں کا جو حشر ہو سکتا تھا اس کی زندہ شہادت ہندوستان کے
موجودہ مسلمانوں کی حالت ہے۔ جناح کا مطالبہ تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت
ہے کم از کم اُن علاقوں میں تو ان کی اپنی حکومت قائم ہو جائے۔ یہ تھی جناح کی "قیادت"۔
ذرا سوچئے کہ اس مطالبہ میں جسے جناح نے پیش کیا تھا کوئی چیز "غیر دینی" بھی تھی؟
لیکن جناح یہ مطالبہ پیش کر رہا تھا اور عین اُس وقت جب ہندو کی یہ انتہائی خواہش
تھی کہ جناح کے اس مطالبہ کے خلاف خود مسلمانوں کی طرف سے آوازیں اُٹھیں،
یہ اسلامی جماعت تھی کہ مسلمانوں کے جذبات کو یہ کہہ کر جناح کے خلاف اُبھار رہی

تھی کہ اس کی قیادت غیر دینی ہے اس لئے اس کا ساتھ نہ دو۔

اب آپ یہ سوچئے کہ اگر اُس وقت اِن کی آواز پر مسلمان کان دھر دیتے اور اِن کے کہنے میں آکر جناح کا ساتھ چھوڑ دیتے تو آج ان چھ سات کروڑ مسلمانوں کا حشر کیا ہوتا جنہیں پاکستان میں سر چھپانے کو جگہ مل گئی ہے۔ اور مسلمانوں کو چھوڑیئے خود جماعت اسلامی سے پوچھئے کہ اگر (خدانکردہ) یہ کامیاب ہو جاتے تو وہ سرزمین کہاں ہوتی جس پر یہ اسلامی حکومت کے قیام کی دعوت دے رہے ہیں! یہ زمین جس پر آپ "مسجد" بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، اُسی "غیر صالح قیادت" کی کوششوں کا نتیجہ ہے جسے ناکام کرنے کے لئے آپ اُس وقت مسلمانوں کو اُبھار رہے تھے! طلوعِ اسلام اُس وقت پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ خدا کے لئے مسلمانوں کے جذبات کو ابھار کر انہیں غلط راہوں پر نہ لگاؤ۔ وقت بڑا نازک ہے! اس وقت اگر

بے ڈاڑھی کی فکر

تم جناح کی ڈاڑھی کا سوال لے کر بیٹھ گئے تو چند ہی دنوں کے بعد پوری کی پوری قوم کی ڈاڑھی مُنڈ جائے گی۔ خود جماعتِ اسلامی کے امیر اپنی امارت سے پہلے تمام عمر ڈاڑھی منڈاتے رہے ہیں۔ اگر ان کی اُس زمانہ کی پیش کردہ فکر "بے دین" فکر نہ تھی تو جناح کی کوششوں کو "بے دین" قیادت کی کوشش کیوں کہتے ہو۔ خدا کے لئے حقائق کو سامنے رکھو۔ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ابھار کر ان کے مستقبل کو خطرہ میں مت ڈالو۔

یہ تھی اُس وقت وجہِ اختلاف اسلامی جماعت سے طلوعِ اسلام کی۔ آپ خود سوچئے کہ اس اختلاف میں طلوعِ اسلام کس حد تک حق بجانب تھا۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ اسلامی جماعت کی اُس وقت نیت کیا تھی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر ان کی نیت تخریب کی تھی تو یہ غدارِ قوم تھے۔ اور اگر نیت اصلاح کی تھی تو ان میں سیاست سمجھنے کی ذرا

بھی صلاحیت نہ تھی، صورتِ حالات وہ تھی یا یہ، دونوں صورتوں میں نتیجہ قوم کے لئے ہلاکت تھا۔

اب تقسیم ہند کے بعد کے زمانہ کی طرف آئیے ہم اس بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتے کہ تقسیم ہند کے ضمن میں کس سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں۔ ہم مانے لیتے ہیں کہ جزئیات کے تعین میں جناح سے بھی غلطیاں ہوئیں، جناح بالآخر انسان تھے ہم انہیں معصوم عن الخطا نہیں مانتے۔ لیکن یہ کہنا کہ یہ غلطیاں یا ان کے عواقب اس لئے ظہور میں آئے کہ جناح کی قیادت غیر دینی تھی، پھر وہی جذبات انگیزی اور حقائق سے چشم پوشی ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تدبر صحیح نہیں تھا اندازے غلط تھے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ جناح کے ڈاڑھی نہیں تھی اس لئے یہ غلطیاں ہوئیں۔ اگر قیادت ڈاڑھی والوں کے ہاتھ میں ہوتی تو یہ غلطیاں نہ ہوتیں۔ اس بحث کو بھی چھوڑئیے کہ اگر قیادت جماعت اسلامی کے ہاتھ میں ہوتی تو یہ غلطیاں ہوتیں یا نہ ہوتیں یہ بحث لعداز وقت ہے۔ دیکھئے صرف یہ کہ جناح کی "غیر دینی قیادت" پاکستان کا مطالبہ کرتی تھی اور جماعت اسلامی کی "دینی قیادت" اس کی مخالفت کرتی تھی۔ یہ فرمائیے کہ اس اصولی بات میں وہ "غیر دینی قیادت" "صحیح راستہ" پر تھی یا آپ کی "دینی قیادت"! جیسا کہ ہم نے پچھلے سال لکھا تھا اگر جماعت اسلامی کی مخالفت مطالبۂ پاکستان ان کی دیانت داری پر مبنی تھی تو ان کے لئے صحیح راہِ عمل یہ تھی کہ وہ اس پاکستان میں قدم نہ رکھتی جس پاکستان کو وہ "زہر ملا ہوا حلوا" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ وہ اسے لادینی قیادت کا ثمرہ قرار دیا کرتے تھے۔ ایک دینی جماعت کے لئے یہ کبھی جائز نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ

صحیح راستہ

اس قسم کی سرزمین کی طرف رُخ بھی کرتی۔ جب ان سے کہا جاتا تھا کہ وحدتِ ہندوستان میں ہندو اکثریت مسلمانوں پر حکومت کرے گی تو اس کے جواب میں وہ کہا کرتے تھے کہ اگر مسلمانوں کا کردار درست کر دیا جائے تو یہ اقلیت میں رہتے ہوئے بھی حکمران ہو سکتے ہیں۔ ہم نے سال گزشتہ یہی کہا تھا کہ اگر اسلامی جماعت کا یہ دعویٰ اخلاص پر مبنی تھا تو انہیں چاہیئے تھا کہ ہندوستان میں جا کر مسلمانوں کے کردار کی درستگی کی کوشش کریں تاکہ وہ اقلیت میں رہتے ہوئے حکمران بن جائیں لیکن ان مدعیانِ انقلابِ صالحہ میں سے کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ اُدھر کا رُخ بھی کرے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ جو پاکستان "عیزدنی حیات"

پاکستان میں کیوں آئے؟

کا حاصل کردہ ہے، جو پاکستان اُن کوششوں کا ثمر ہے جن میں تعاون آپ کے نزدیک تعاون علی الاثم والعدوان تھا، اُس پاکستان میں پناہ لینا کون سے دین اور تقویٰ کی رُو سے جائز ہے؟ کیا مغصب کردہ زمین پر مسجد بنانا جائز ہو سکتا ہے؟ آپ نے مسلمانوں کے لئے جو راہِ عمل تجویز کی تھی، وہ اُس منزل کی طرف لے جاتی تھی جس میں آج ہندوستان کا مسلمان ہے۔ چونکہ وہ راہ آپ کے نزدیک حق و صواب کی راہ تھی، اس لئے آپ کا مقام بھی وہی ہونا چاہیئے نہ کہ یہ۔ لیکن آپ صرف پاکستان میں پناہ ہی کے طالب نہیں، اس سرزمین کو اپنے اقتدار میں لینے کے بھی خواہاں ہیں۔ بالآخر کس خصوصیت کی بنا پر؟ آپ کی سیاست دانی کا ثبوت تو پاکستان کی مخالفت سے ظاہر ہے اور آپ کی صالحیت کا ثبوت یہ کہ وہی پاکستان جسے آپ زہر ہلاہل کہا کرتے تھے، وہ اب شیرِ مادر قرار دیا جا رہا ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ اسلامی جماعت میں بہت سی ایسی سعید رُوحیں بھی شامل ہیں

جو نہایت نیک نیتی سے مسلمانوں کے اصلاحِ حال کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں۔

نیک نیت

ان سعید رُوحوں کو ہماری یہ تنقید یقیناً ناگوار گزرے گی لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک حقائق کو یکسر بے نقاب پیش نہ کیا جائے، حقیقت سامنے نہیں آسکتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے جذباتِ صالحہ سے فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے ہم ان حضرات سے باادب گزارش کریں گے کہ وہ اپنی جذباتی عقیدت مندی سے ذرا الگ ہو کر سوچیں کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ مبنی علی الحقیقت ہے یا نہیں۔ ہمیں جماعتِ اسلامی کا فریقِ مقابل بننے سے کچھ حاصل نہیں۔ طلوعِ اسلام کی کوئی جماعت نہیں نہ ہی یہ موجودہ اربابِ اقتدار کا وکیل ہے۔ ان کی مخالفت (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) خود اس سے ظاہر ہے کہ "چراغِ راہ" کے قیادت نمبر میں طلوعِ اسلام میں شائع شدہ مضمون شامل ہے۔ لہٰذا آپ ذرا حقائق کو سامنے رکھ کر سوچیے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ کس حد تک دُرست ہے۔

اب اس سے آگے بڑھ کر ایک اور اصول کی طرف آئیے۔ طلوعِ اسلام نے پچھلے سال لکھا تھا کہ جماعتِ اسلامی کی ٹیکنیک بھی وہی ہے جو مرزا غلام احمد صاحب نے

میرزائیت

اختیار کی تھی۔ میرزا صاحب نے مسلمانوں کی معاشرتی خرابیوں کو ایک ایک کر کے گنایا اور بتایا کہ وہ اصل اسلام کے حامل نہیں رہے۔ بات ٹھیک تھی مسلمان اُس کی آواز کی طرف لپکے۔ میرزا صاحب نے جب صالحیت کی ہر جگہ نفی کر دی تو اس کے بعد اس خلا کو پُورا کرنے کے لئے اثبات میں اپنی ذات کو پیش کر دیا اور کہہ دیا کہ،

آؤ لوگو کہ یہیں نُورِ خدا پاؤ گے!

ہم نے کہا تھا کہ ایک رسول کا یہ مقام ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے یہ کہے کہ یہ سب بتکدہ ہے اور وہ خود مدعیِ توحید بنے۔ اس لیئے کہ رسول اپنے ماحول کا پیدا کردہ نہیں ہوتا۔ لیکن کسی غیر رسول کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ یہ کہے کہ میرے ماحول کی قیادت غیر صالح ہے اور میری قیادت صالح ہے۔ جماعتِ اسلامی کا یہی دعویٰ ہے۔ وہ موجودہ قیادت کے نقائص کو بے نقاب کرنے کے بعد علی الاعلان دعویٰ کرتی ہے کہ

> آج جس نئی قیادت کی ضرورت عوامِ پاکستان میں محسوس کی جارہی ہے اس کے بیج مشیّتِ ربانی نے بہت پہلے سے بو رکھے تھے۔ یہ بیج ۱۹۴۱ء میں پھوٹے اور جماعتِ اسلامی وجود میں آئی۔ (قیادت نمبر صا)

غور فرمایا آپ نے! جس طرح میرزا صاحب کی قیادت مامور من اللہ تھی، اسی طرح جماعتِ اسلامی کی قیادت کے بیج بھی مشیّتِ ربانی نے بہت پہلے سے بو رکھے تھے۔

ہم سب ایک جیسے ہیں

طلوعِ اسلام یہ کہتا ہے کہ ہمارا پورے کا پورا معاشرہ خراب ہو چکا ہے اور جس قیادت کے ہاتھوں ہم اس درجہ نالاں و گریاں ہیں، وہ ہماری ہی آئینہ دار ہے۔ جس قسم کا دودھ ہوگا اسی قسم کی بالائی آئے گی۔ یہ بات نہیں کہ ہمارا معاشرہ صالحین پر مشتمل ہے، لیکن یہ سوچا کہ مفسدین کہیں باہر سے آکر ہم پر مسلط ہو گئے ہیں۔ انہیں نکال دو، معاشرہ صالح ہو جائے گا۔ یہ تصوّر ہی غلط ہے۔ ہمارے کہ دمہ سب خراب ہیں۔ جس کے ہاتھ میں جس قدر قوّت آتی ہے، اسی قدر اس کی خرابی ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ہم سب کے خون میں فساد ہو چکا ہے۔ ہم میں سے جو شخص کوئی گرم چیز کھا لیتا ہے، اس

کا فسادِ خون پھوڑے بن کر جلد سے باہر نکل آتا ہے، باقیوں کا جلد کے اندر رہتا ہے۔ لہٰذا یہ غلط ہے کہ ہم میں سے صرف ایک گروہ مفسدین کا ہے اور باقی سب صالحین ہیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ جماعتِ اسلامی ہمیشہ اپنی "صالح قیادت" کا ذکر کرتی ہے۔ قیادت ایک مجرد اصطلاح (ABSTRACT TERM) ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ قیادت بہرحال "افراد ہی پر مشتمل ہوگی۔ لیکن جماعتِ اسلامی اُن صالحین کا نام نہیں لیتی جن پر یہ قیادت مشتمل ہوگی۔ ان سے کہیئے کہ موجودہ غیر صالح قیادت (یعنی ان تمام اربابِ حل وعقد جن کے ہاتھ میں حکومت یا سیاست کی زمام ہے) کی جگہ وہ اپنے میں سے جن افراد کو صالح نظامِ حکومت چلانے کا اہل سمجھتی ہے نذرا اُن کی فہرست تو شائع کر دے۔ بات نکھر کر سامنے آجائے گی اس حقیقت کو سامنے رکھیئے کہ ان افراد کے ذمہ حکومت کا نظم ونسق ہوگا مسجد کی صفیں لپیٹنے کا کام نہیں ہوگا۔ (یہ الگ بات ہے کہ ضرورت پڑ جائے تو انہیں مسجد کی صفیں لپیٹنے سے بھی عار نہ ہو) اور حکومت کا نظام اس انداز سے چلانا ہوگا کہ وہ ساری دنیا کے لئے نمونہ بن جائے۔ اس لئے کہ ہم ساری دنیا سے یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ اگر کسی خطۂ زمین پر "خدائی حکومت" کا قیام ہوگیا تو وہ خطۂ زمین جنتِ ارضی بن جائے گا اور ساری دنیا دیکھ لے گی کہ قرآن کا مقصود ومنتہیٰ کیا ہے۔ یہ نتائج ہیں جو آپ کی حکومت کو پیدا کر کے دکھانے ہیں اور اُن قوتوں کی مخالفت کے باوجود پیدا کر کے دکھانے ہیں جن کے عزائم چاند اور مریخ تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ باتیں محض جذبات ابھار دینے سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ ان کے لئے بڑی بڑی صلاحیتیں درکار ہیں اگر غیر صالح قیادت کا قائم کردہ نظام ناکام رہا تو یہ انسانوں کی ناکامی ہوگی۔

لیکن اگر "صالح قیادت" کا نظام ناکام رہ گیا تو یہ "خدا" کی ناکامی ہو گی اس لئے کہ ان کا دعویٰ تو خدائی نظامِ حکومت قائم کرنا کا ہے لہٰذا ہر شخص کو جو محض جذبات کی رَو میں بہہ جانے کے لئے تیار نہ ہو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ دیکھے کہ وہ کون سے افراد ہیں جو اس قسم کا نظام قائم کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی جماعت، مسلمانوں کے اُنہی مذہب پرستانہ جذبات سے کھیل رہی ہے جن سے اِس وقت تک مختلف پیرایوں میں کھیلا جاتا رہا ہے۔ اِس

کرنے کا کام

وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل و دماغ سے مذہب کا وہ غلط تصوّر نکالا جائے جس نے انہیں اس طرح سے تباہ کر رکھا ہے اور اس کے بجائے دین کا صحیح تصوّر ان کے سامنے رکھا جائے لیکن یہ چیز اسلامی جماعت کے بس کی نہیں۔ اسلامی جماعت تو اُسی مولویت کی ایک (MODERNIZED FORM) ہے جو علت العلل ہے اُن تمام فاسد جراثیم کی جو ساری دنیا کے مسلمانوں کے خون میں حلول کر چکے ہیں۔ اس لئے یہ دین کا صحیح تصوّر کس طرح پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک "حکومتِ الٰہیہ" کا تصوّر بھی "پیشوائیت" کے نظام (THEOCRATIC GOVERNMENT) سے زیادہ کچھ نہیں جس میں اقتدارِ حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں رہا کرتا تھا۔ اُس نظام میں دین تو ایک طرف دُنیا بھی تباہ ہو جایا کرتی ہے۔ ان لوگوں نے جو کچھ اِس وقت تک کیا ہے، اُس کا نتیجہ فقط اتنا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں

صالحین کی تعریف

"غیر صالح قیادت" کے متعلق یہ تصوّر پیدا ہوا ہے کہ وہ ڈاڑھی منڈے مغرب زدہ لوگوں کا طبقہ ہے جو نماز نہیں پڑھتے

اور روزے نہیں رکھتے۔ شراب پیتے ہیں، رقص و سرود کی محفلیں منعقد کرتے ہیں اور صالح قیادت وہ ہے جس میں ڈاڑھی رکھی جاتی ہے، نمازیں پڑھی جاتی ہیں، شراب وغیرہ سے اجتناب کیا جاتا ہے لیکن انہیں اس کا علم نہیں کہ ابلیس کی نگاہیں کس قدر دوربین ہوتی ہیں اور اُس کے بہروپ کیسے نگاہ فریب۔ وہ غیر صالح قیادت، جس کے خلاف آپ اس قدر جہاد کر رہے ہیں، ابھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی لیکن جب اُس نے اس کی ضرورت سمجھی تو وہ بھی ڈاڑھیاں رکھ لیں گے، نمازیں پڑھنے لگ جائیں گے، شراب سے احتراز برتیں گے۔ اور پھر آپ اُن کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکیں گے۔ اس لئے کہ یہ آپ کے معیارِ قیادت پر پورے اتر آئیں گے۔ یہ محض ہمارا قیاس نہیں۔ ذرا مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ پر غور کیجئے۔ کتنے دَور ایسے گذرے ہیں جن میں قیادت ان تمام علامات کی حامل تھی جنہیں آپ شرطِ صالحیت قرار دے رہے ہیں لیکن آپ خود ہی کہیئے کہ کیا وہ صالح قیادت تھی؟ اگر وہ صالح قیادت نہیں تھی، تو جماعتِ اسلامی کے فارم ممبری کو پُر کر کے اُن علامات کے توسّط سے قیادت کس طرح صالح بن جائے گی۔؟

---

[1] ممکن ہے ڈاڑھی کا بار بار تذکرہ آپ کو ناگوار سا گذر رہا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک صالحیت کا معیار ڈاڑھی ہے۔ خود ابوالاعلیٰ صاحب مودودی تمام عمر ڈاڑھی منڈاتے رہے لیکن جب انہیں صالح قیادت کا خیال پیدا ہوا، تو انہوں نے ڈاڑھی رکھنا ضروری سمجھا۔ اس سے ان کی ذات پر کسی قسم کی تنقید مقصود نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ ان کے نزدیک بھی صالح ہونے کے لئے ڈاڑھی بڑھانا ضروری ہوتا ہے۔ یہ ہے مذہب کا غلط تصور جس سے جذبات کو اپیل کیا جاتا ہے۔

ہم اسلامی جماعت کے اُن افراد سے جن کے قالب میں سعید روحیں ہیں، مخلصانہ گزارش کریں گے کہ وہ ان تلخ حقیقتوں کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کریں اور پھر سوچیں کہ کیا اسلامی جماعت صحیح مسلک پر جا رہی ہے ہم اُن سے عرض کریں گے کہ اگر آپ فی الواقع چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں صالح قیادت پیدا ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ اُن کے دلوں سے مذہب کا غلط تصوّر نکال کر دین کا صحیح تصوّر اُن کے سامنے رکھیئے۔ یہ کام بڑا صبر آزما اور دِقّت طلب ہے۔ اس لئے کہ اس میں جذبات کی ہنگامہ آرائیاں نہیں، بلکہ صبر و استقلال

دین کی راہ

کی عزم پیمائیاں ہیں۔ یہ کیلے کا پیڑ نہیں کہ آج لگایا اور چھ ماہ بعد پھل اتارنا شروع کر دیا۔ یہ کھجور کا شجر محکم ہے جسے دادا لگائے اور پوتا کھائے۔ لیکن کیلے میں پھل صرف ایک مرتبہ آتا ہے دوسرے پھل کے لئے اسے کاٹ دینا پڑتا ہے اور کھجور کا یہ عالم ہے کہ محمد بن قاسم کے ہاتھوں کی لگائی ہوئی کھجوریں آج تک سندھ کے صحراؤں میں ثمربار ہیں اب آپ کے سامنے ہے کہ دونوں راہوں میں سے جونسی راہ چاہیں اختیار کریں وہ جذبات پرستی کی سہل وادی ہے، یہ دین کی کٹھن گھاٹی۔

إِنَّا هَدَيْنَٰهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا۔ ۷۶/۳

جنگِ کشمیر کے متعلق

(مودودی صاحب کا فتویٰ)

(اکتوبر ۱۹۴۸ء)

پچھلے دنوں مودودی صاحب نے جو فتویٰ صادر فرمایا کہ کشمیر کی لڑائی جنگ ہے جہاد نہیں ہے اور مسلمانانِ پاکستان کو اس میں شرکت نہیں کرنی چاہیئے تو اس کے متعلق ہمیں بھی بہت سے استفسارات موصول ہوئے لیکن مودودی صاحب کا فتویٰ کچھ ایسا طفلانہ سا تھا کہ علم اور حقیقت کے اعتبار سے اس پر گفتگو ہی لاحاصل تھی۔ البتہ بعض حضرات نے ہم سے پوچھا ہے کہ بالآخر مودودی صاحب کا اس سے مقصد کیا تھا! اس باب میں ہم اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ جہاد کے خلاف اس قسم کے فتوے کوئی نئی چیز نہیں جب اور جہاں مسلمانوں کے اندر کسی حرکت کے آثار پیدا ہوئے اور اُن سے دشمنانِ اسلام کو خطرات لاحق ہوئے۔

جہاد کے خلاف فتوے

تو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ انگیزی کے لئے اس قسم کے فتوے مَنصۂ شہود پر آگئے حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی تحریک جہاد کسی تعارف کی محتاج نہیں اس کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ

ترکش مارا خدنگ آخریں!

جب وہ تحریک ترقیوں کے زینے چڑھتی جارہی تھی اور کیفیت یہ تھی کہ سرحد سے سکھوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ مسلمانوں کا پرچم فضائی پہنائیوں میں لہرا رہا تھا اور انگریز اور سکھ دونوں اس کی اس رفتار سے بدحواس ہو رہے تھے تو اس وقت یہی تیر تھا جس نے مجاہدین کے سینوں کو وساوس انگیزی سے چھلنی کر دیا۔ اس کیفیت کو مصنف "سیرتِ سیّد احمد شہید" کی زبان سے سنیئے آپ لکھتے ہیں:۔

حضرت سیّد احمد کے خلاف فتویٰ

دہلی کے ایک مشہور عالم نے جن کے مزاج میں تیزی تھی اور میدانِ جنگ کی سختیوں کے عادی نہ تھے، راستہ میں درانیوں سے جو سدِ راہ تھے تنگ آکر سیّد صاحب کو خط لکھنے شروع کئے کہ پہلے ان کلمہ گو کافروں سے جہاد کرو۔ میدانِ جنگ میں پہنچ کر بھی ان کی برافروختگی دور نہ ہوئی۔ اپنا خیمہ مجاہدین سے الگ ڈالا اور سیّد صاحب پر اوچھے اعتراضات شروع کئے مثلاً آپ کا باورچی خانہ کیوں الگ ہے؟ سیّد صاحب نے فرمایا یہ مہمانوں کے واسطے ہے جو روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں اور اس میں صرف وہی چیزیں پکتی ہیں جو مخصوص ہدیہ اور ذاتی ملکیت ہوتی ہیں۔ بیت المال سے اس میں کچھ صرف نہیں ہوتا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ وہ سب تحائف بھی مجاہدین پر برابر سے تقسیم ہونے چاہئیں۔ سیّد صاحب نے کہا بہتر ہے یہ کام میں آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ آپ یہ خدمت اپنے ذمہ لیجئے۔ اس پر وہ لاجواب ہو گئے۔ انہوں نے آپ کی امامت میں قدح کرنا شروع کیا۔ سیّد صاحب نے فرمایا کہ آپ کے نزدیک میں اس کے لائق نہیں ہوں۔ تو خدا کے فضل سے آپ سیّد بھی ہیں، عالم،

جامع اور جامعِ صفات ہیں۔ اس بارِ گراں کو آپ قبول کریں میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ آج سے آپ امام اور میں آپ کا تابعدار ہوں مقصود کام کرنا ہے سرداری نہیں۔ اس پر وہ خاموش ہوگئے۔ مگر انہوں نے اہلِ لشکر سے کہنا شروع کیا کہ تمہارے اوپر بیوی بچوں اور والدین کے حقوق ہیں تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ لوگوں نے کہا جہاد کے واسطے! مولوی صاحب نے فرمایا جہاد کیا ہے۔ اور کون سے کفار سے مقابلہ ہے۔ کس میں تمہارا عمل دخل ہوا صبح سے شام تک تم لوگ کھانے پکانے کی فکر میں رہتے ہو۔ جہاد کا محض بہانہ ہے۔ تمہاری دنیا و آخرت دونوں خراب ہیں لوگوں کو ایک معتبر عالم کی زبان سے یہ سن کر خواہ مخواہ انتشار ہوا اور لشکر میں اس کا عام چرچا اور فتنے کا اندیشہ ہوا جس سے کام کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا اتفاق سے مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اُس وقت موجود نہ تھے اور بھیرہ میں گئے ہوئے تھے، ورنہ اس کا بہت جلد فیصلہ ہو جاتا۔ آخر محمد حسن صاحب رامپوری نے سید صاحب سے کچھ کہنے کی اجازت چاہی اور نماز کے بعد جب سب لوگ موجود تھے، مولوی صاحب سے کہا کہ آپ یہاں کے لوگوں کو کس طرح خارج از جہاد سمجھتے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ تم کس سے جہاد کر رہے ہو اور کون سا جہاد ہو رہا ہے۔ محمد حسن صاحب نے کہا کہ جنگ کا نام ہی جہاد نہیں۔ جنگ کو قتال کہتے ہیں اور وہ کبھی کبھی پیش آتا ہے۔ جہاد کے معنی ہیں اعلاء کلمۃ اللہ میں کوشش کرنا۔ یہ مدتِ دراز تک باقی رہتا ہے اور اُس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں یہ آپ کی غلط فہمی ہے کہ قتال کا نام جہاد رکھا ہے اور اُن کوششوں کو جو اعلاء کلمۃ اللہ

کے واسطے لوگ کر رہے ہیں عبث قرار دیتے ہیں بیں آپ سے پوچھتا ہوں کہ
اِس وقت جہاد کا انکار کرکے آپ وطن دہلی تشریف لے جائیں اور کسی دن
کفار سے مقابلہ اور قتال جس کو آپ جہاد کہتے ہیں پیش آجائے تو کسی پہاڑ
کی چوٹی پر چڑھ کر آپ کو اس کی اطلاع دی جائے گی اور آپ اپنی کون سی
کرامت سے اڑ کر داخلِ جہاد ہوں گے۔

دوسرا فتویٰ اسی فتنہ پر اکتفا نہیں ہوا۔ بلکہ سرحد کے بعض علماء بھی میدان میں
آئے اور انہوں نے طرح طرح کے الزامات اس تحریک اور بانیٔ
تحریک کے خلاف تراشنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ مصنّف موصوف کے الفاظ میں:۔

سرحد کے علماء نے مشہور کیا کہ یہ ہندوستانی علماء اور ان کا امیر لامذہب لوگ
ہیں۔ خواہشِ نفسانی کے پیرو اور آزاد خیال ہیں ..... مجاہدین کے ساتھ جنگ
کرنے میں جو بعض سردار اور باغی قتل ہوتے تھے، اُن کا قتل اور اُن کے علاقوں
پر قبضہ بھی مجاہدین کے خلاف سخت الزام تھا۔ علماء کہتے تھے کہ یہ لوگ مسلمان
کے جان و مال کو کوئی چیز نہیں سمجھتے اور بلا وجہ شرعی مسلمانوں کی جان و مال پر دست
درازی کرتے ہیں بعض لوگ اس سے آگے بڑھ کر مجاہدین کو باغی اور باغی مقتولین
کو شہید کہتے تھے۔

چنانچہ حضرات علماء کرام کی اس مجاہدانہ تگ و تاز کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں اسی طرح بد دلی
پھیل گئی (جس طرح مودودی صاحب کے فتویٰ سے مجاہدین کشمیر میں سے بعض سادہ لوح
لوگ متأثر ہو گئے) اور اس طرح وہ تحریک جو ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کی
ضامن بننے والی تھی "ان "مقدسین" کے فتادیٰ کی نذر ہو کر رہ گئی۔

اس تحریک کے بقیۃ السیف مجاہدین کے سینوں میں ایمان کی جو حرارتیں موجود تھیں، وہ انگریزی حکومت کے لئے بڑی خطرناک سمجھی جاتی تھیں۔ ان چنگاریوں کو دبانے کے لئے پھر مذہب ہی کو آگے بڑھایا گیا اور قادیان کے "بابِ نبوّت" سے یہ فتویٰ صادر ہو گیا کہ

اے دوستو جہاد کا اب چھوڑ دو خیال

کشمیر کا مسئلہ کشمیر کا مسئلہ پاکستان کے لئے موت اور حیات کا مسئلہ ہے۔ چونکہ مودودی صاحب شروع سے پاکستان کے خلاف چلے آ رہے ہیں، اس لئے وہ کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ کشمیر پاکستانی مسلمانوں کے لئے وجہِ تقویت بن جائے۔ اس لئے اُن کے فتویٰ کا مفہوم ظاہر ہے۔ غیر مسلم عناصر پاکستان کی تخریب میں ایک مُتّحدہ محاذ بناتے جا رہے ہیں اور مقدسین کا یہ طائفہ پاکستان کے اندر بیٹھا اس قسم کے فتنے پھیلا رہا ہے۔

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد — دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد
شبنم ما در نگاہِ مایم است — از نگاہِ اُو یمِ ما شبنم است
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی — آسمانش تیرہ از بے کوکبی
از شکر فہمائے آں قرآں فروش — دیدہ ام روح الامیں را در خروش

ہوسِ فتویٰ بازی کی تو ان کی یہ کیفیت ہے لیکن کیریکٹر کا یہ عالم کہ اس فتویٰ کے خلاف ذرا سی تحریک ہوئی اور یہ لگے بغلیں جھانکنے۔ کہیں اس فتویٰ کی تاویلیں ہو رہی ہیں، کہیں توجیہات بیان کی جا رہی ہیں، پھر اس سے رجعت اختیار کر لی جاتی ہے اور پاکستان کے فدائی بن کر خود اس "جہاد" میں شرکت کے ارادے ظاہر کئے جاتے ہیں۔

در کفر ہم پختہ نہ ای ——— زنّار را رسوا مکُن

اور پھر اپنی علمی بصیرت پر اعتماد کی یہ کیفیت کہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کو لکھتے ہیں کہ اگرچہ میں آپ کے دلائل سے مطمئن نہیں ہوا، لیکن اگر آپ یہ لکھ دیں کہ آپ اپنی کامل بصیرت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کشمیر کی جنگ جہاد ہے تو میں اپنے خیالات سے رجوع کر لوں گا لیکن جب علامہ صاحب لکھ دیتے ہیں کہ میں اپنی کامل بصیرت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں تو پھر مودودی صاحب غرّہ کر جاتے ہیں اور کوئی جواب ہی نہیں دیتے۔

یہ ہے اس شخص کی حالت جس کا قادیانی نبوّت کی تقلید میں دعویٰ یہ ہے کہ

آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے!

اور جس کے حواریوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ شخص چالیس کروڑ مسلمانوں میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے[1]۔ حیرت ہے کہ پنجاب کی سرزمین اس قسم کے لوگوں کو کس قدر راس آتی ہے۔ اور ابھی تو ابتدا ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

---

[1] جس زمانہ میں سید محمد شاہ صاحب مدیر "پیغامِ حق" مودودی صاحب کی رفاقت میں کام کیا کرتے تھے تو انہوں نے اپنے رسالہ میں ایسا کچھ لکھا تھا۔ معلوم نہیں سید صاحب کا اب مودودی صاحب کے متعلق کیا خیال ہے؟

ہندوستان چاہیئے

(ستمبر ۱۹۴۶ء)

ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں ہندوؤں کا دعویٰ یہ تھا کہ اس ملک میں بسنے والے تمام لوگ "بلاتخصیصِ مذہب وملت" ایک قوم کے افراد ہیں۔ اس لئے یہاں ایک "قومی حکومت" قائم کرنی چاہیئے جو جمہوریت کے اصولوں پر کارفرما ہو بعض مسلمان بھی ایسے تھے جو اس "نظریۂ متحدہ قومیت" میں ہندوؤں کے ہم نوا تھے انہیں نیشنلسٹ مسلمان کہا جاتا تھا۔

ہندوستان میں تین نظریئے

دوسری جماعت مسلم لیگ کی تھی جس کا اِدعا یہ تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک قومیت کا مدار اتحادِ وطن نہیں بلکہ مذہب ہے، تمام مسلمان بہ حیثیتِ مسلمان، ایک جداگانہ قوم کے افراد ہیں اس لئے وہ کسی دوسرے مذہب کے پیروؤں کے ساتھ مل کر متحدہ قوم نہیں بن سکتے۔ ہندوستان میں نظامِ جمہوریت کے معنی یہ ہوں گے کہ یہاں اکثریت کی حکومت ہو اور اکثریت چونکہ ہندوؤں کی ہے، اس لئے آزادئ ہند سے مفہوم ہوگا ہندوؤں کی حکومت اور مسلمانوں کی محکومیت۔ ان کے نزدیک اس گتھی کا عملی حل یہ تھا کہ ہندوستان کے

اُن علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے الگ کر کے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت قائم کی جائے۔ یہ تقسیمِ ہند کا نظریہ تھا جس کی مخالفت ہندو اور اُن کے ہم نوا مسلم نیشنلسٹ حضرات کرتے تھے۔

دورانِ تحریک میں ایک تیسری آواز اٹھی جس نے یہ کہا کہ بیشک مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قوم نہیں بن سکتے لیکن ہندوستان کے مسلمان محض پیدائشی مسلمان ہیں جن کا مسلمان ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ انہیں پہلے سچے معنوں میں مسلمان ہونا چاہیئے، اس کے بعد آزادی کے طالب پیدائشی مسلمان انگریز یا ہندو کے غلام رہیں تو کیا اور اپنی الگ حکومت قائم کرلیں تو کیا اُن کی آزادی صحیح معنوں میں آزادی اُسی صورت میں کہلا سکتی ہے جب یہ اپنے اندر اسلامی صفات پیدا کریں۔ اس نظریہ کے مدعیان نے اپنے آپ کو "اسلامی جماعت"[1] کے نام سے متعارف کرایا۔

طلوعِ اسلام اس حد تک اسلامی جماعت کے ساتھ ہم نوا[2] تھا کہ مسلمان صرف اُسی صورت میں آزاد کہلا سکتا ہے جب یہ اپنی مملکت میں خدا کا قانون رائج کرے۔ لیکن اس کا مسلک یہ تھا کہ خدا کے قانون کو رائج کرنے کے لئے کسی خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم ہندوستان میں کسی خطۂ زمین کے مالک نہیں بن جاتے، اُس وقت تک حکومتِ خداوندی کے قیام کا امکان نہیں لہٰذا مسلم لیگ کی تحریکِ تقسیمِ ہندوستان

---

[1] سطورِ پیشِ نظر میں اس جماعت کے اس مسلک سے بحث کی جائے گی جو اس نے تحریکِ آزادی کے ضمن میں اختیار کیا تھا۔ ان کے دینی موقف کے متعلق ہم عندالضرورت پھر کبھی گزارش کریں گے۔

[2] طلوعِ اسلام، اسلامی جماعت کے وجود میں آنے سے بہت پہلے اس مسلک کی اشاعت کر رہا تھا۔

کو کامیاب بنانے کیلئے ہمیں پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس کی کامیابی سے ہمیں وہ امکانی قدرت حاصل ہو جائے گی جس سے اس زمین پر آسمان کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھ سکے۔ اگر ہم نے اِس وقت تغافل برتا تو انگریز پورا ہندوستان ہندو کے سپرد کر دیگا جس سے ہمیں یہ امکانی قدرت حاصل نہ ہو سکے گی۔ ہمیں مسلم لیگ کی اس سیاسی تحریک کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو قرآن کے قریب لانے کی کوشش بھی جاری رکھنی چاہیئے۔

جماعتِ اسلامی کا مسلک

لیکن اسلامی جماعت کے نزدیک یہ مسلک قابلِ قبول نہ تھا۔ وہ بیدا نشی مسلمانوں کے قومی اور اجتماعی مطالبات سے ہم آہنگی اور تعاون کو اس طرح تعاون علی الاثم والعدوان (گناہ اور سرکشی کے معاملات میں تعاون) سمجھتی تھی جس طرح مرزائی حضرات مسلمانوں سے روابط قائم کرنے میں کفر و فسق محسوس کرتے تھے چنانچہ اس جماعت نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی اس تحریک سے عملاً الگ رکھا اور دوسروں کو اس سے الگ رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ ان کا یہ طرزِ عمل مسلمانوں کی اس اجتماعی تحریک کیلئے نیشنلسٹ مسلمانوں سے بھی کہیں زیادہ ضرر رساں تھا اس لئے کہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے نظریۂ متحدہ قومیت کا بودا پن عوام کو بآسانی نظر آجاتا تھا لیکن ان کا یہ اندازِ گفتگو کہ جب تک مسلمان اپنے آپ کو سچے معنوں میں مسلمان نہیں بنا لیتا جب تک یہ اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں نہیں رنگ لیتا اُس وقت تک انہیں کوئی فوز و فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے قومی لیڈروں کو دیکھو ان میں کوئی اسلامی خصوصیت نظر نہیں آئے گی۔ ان کا فکر مغربی ٹکسالوں میں ڈھلا ہوا، ان کا عمل کفّار اور مشرکین سے

ملتا ہوا۔ کون سچا مسلمان ہے جو ان کی قیادت میں چلنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھے گا؟ اگر مسلمان اپنے اندر قوّتِ ایمانی پیدا کر لے تو دنیا کی کوئی قوّت اسے محکوم نہیں بنا سکے گی۔ لہٰذا ان ہنگامی تحریکوں کو چھوڑو اور مسلمان بننے کی کوشش کرو عوام پر اپنا اثر کرجاتا تھا اور وہ بھول جاتے تھے کہ اس دلیل اور اُس نتیجہ میں جس تک یہ جماعت ہمیں پہنچاتی ہے کوئی ربط نہیں۔

بہرحال وہ دور ختم ہوا اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے نظریۂ متّحدہ قومیت اور اسلامی جماعت کے مسلکِ اعتزال کے باوجود مسلمانوں کو ایک خطۂ زمین مل گیا جس میں انہیں اپنے اندازِ فکر کے مطابق حکومت قائم کرنے کے امکانات حاصل ہو گئے۔ تقسیمِ ہند سے پہلے اسلامی جماعت کا مرکز اُس علاقہ (پٹھانکوٹ) میں تھا جو تقسیم کی رُو سے ہندوستان میں چلا گیا۔ لیکن دیکھنے والوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُنہوں نے دیکھا کہ ان حضرات کو بھی وہاں کہیں پناہ نہ مل سکی اور انہیں اپنی حفاظت کے لئے اُسی سرزمین کی طرف بھاگنا پڑا جس کے حصول کی جدّوجہد سے تعاون واشتراکِ عمل کو یہ اتنا بڑا گناہ قرار دیا کرتے تھے۔ ہم خیال کرتے تھے کہ خیر اب تو یہ لوگ اس حقیقت کا اعتراف کریں گے کہ تقسیمِ ہند کی تحریک ایسی "شجرِ ملعونہ" نہ تھی جیسی یہ لوگوں کو بتایا کرتے تھے اور جس سے احتراز واجتناب عین خدمتِ اسلامی قرار دیا کرتے تھے لیکن افسوس ہے کہ اس اعتراف کی انہیں اب بھی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔ انہیں اس حقیقت کا اقرار تو مجبوراً کرنا پڑ رہا ہے کہ :-

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے تک اس ملک کے رہنے والے خود مختار نہ تھے لیکن ۱۵ اگست کے بعد ہمارے ملک کی صورتِ حال بالکل بدل

گئی ہے اب اس ملک کے لوگ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے میں پوری طرح
مختار ہیں۔ (رسالہ ترجمان القرآن بابت جولائی ۱۹۴۷ء صفحہ ۵)

بلکہ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں:

ہم اس برِعظیم ہند میں پچھلے دس سال سے اس بات پر لڑتے رہے ہیں کہ
ہم اپنی ایک مستقل تہذیب، الگ نظریۂ زندگی اور مخصوص آئینِ حیات رکھتے ہیں۔
ہمارے لئے مسلم و غیر مسلم کی ایک ایسی متحدہ قومیت ناقابلِ قبول ہے
جس کا نظامِ زندگی لامحالہ ہمارے آئینِ حیات سے مختلف ہوگا۔ ہمیں ایک
الگ خطۂ زمین درکار ہے جس میں ہم اپنے آئین پر زندگی کا نظام بنا اور
چلا سکیں ایک طویل اور انتھک کشمکش کے بعد بالآخر اب ہمیں وہ خطۂ زمین
مل گیا ہے جس کا ہم مطالبہ کر رہے تھے۔ (ایضاً صفحہ ۱۹۸)

لیکن اس کے باوجود ان کی زبان سے آج تک (اس اتنی بڑی تبدیلی پر) نہ خدا کی بارگاہ
میں اظہارِ تشکر و امتنان کے لئے ایک جملہ نکل سکا ہے اور نہ مسلمانوں کی اس جدّوجہد
کی تعریف میں ایک لفظ۔ ان کی پیشانیاں ابھی تک مسلمانوں کے خلاف اظہارِ نفرت میں
شکن آلود اور ان کی نگاہیں غضب آگیں ہیں۔

۱؎ اس ٹکڑے میں "ہم" اور "ہمیں" کے الفاظ قابلِ غور ہیں "ہم لڑ رہے تھے" "ہمیں ایک الگ
خطۂ زمین درکار تھا" "ایک طویل اور انتھک کشمکش کے بعد بالآخر اب ہمیں" وہ خطۂ زمین مل
گیا ہے جس کا ہم مطالبہ کر رہے تھے" یہ ان کی طرف سے کہا جا رہا ہے جو اس مطالبہ کو "لغو"
اس جدّوجہد کو مذموم اور اس کے ماحصل کو شجرۃ الزقوم قرار دیا کرتے تھے۔

تقسیم ہند کے وقت ہمارے اکابرین سے تدبر اور سیاست کی بعض غلطیاں ہو گئیں جن کے نتائج بڑے مضر رساں ثابت ہوئے۔ طلوعِ اسلام اپنی پہلی اشاعت (کراچی) سے اس وقت تک اُن غلطیوں کو بار بار گِنا رہا ہے اور ذمہ دار ارکانِ اقتدار کو مسلسل متنبہ کر رہا ہے کہ ان کا پھر اعادہ نہ ہونا چاہیے۔ نیشنلسٹ مسلمان ان نتائج و عواقب کو تقسیم ہند اور جداگانہ قومیت کے نظریوں کا نتیجہ قرار دے کر انہیں اپنے مسلک کی حقانیت کے جواز میں بطور دلیل پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر میدانِ جنگ میں حربی تدبر کی کسی غلطی سے فوج کو نقصان اٹھانا پڑے تو یہ اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ جس مقصد کیلئے وہ فوج میدانِ جنگ میں آئی تھی، وہ مقصد باطل تھا۔

لیکن نیشنلسٹ مسلمانوں سے کہیں زیادہ حیرت انگیز مسلک "اسلامی جماعت" کا ہے۔ یہ اُس جدّوجہد کے ماحصل کو ایک بہت بڑی تبدیلی بھی قرار دے رہے ہیں، لیکن سالِ گذشتہ کے نقصانات کو اس مسلک کے بطلان کے لئے بطور دلیل بھی پیش کر رہے ہیں جس کا نتیجہ اتنی بڑی تبدیلی ہے اور جس سے ہمیں حکومتِ خداوندی کے قیام کی امکانی قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ آپ جون اور جولائی ۱۹۴۸ء کا ترجمان القرآن دیکھئے (کہ اس کے اُس وقت تک یہی دو نمبر شائع ہوئے ہیں۔) اس تحریک کے خلاف پورا زہر اگلا ہوا دکھائی دے گا۔

اور آگے بڑھیئے۔ طلوعِ اسلام کی اوّلین اشاعت سے لیکر آج تک کسی پرچے کو دیکھئے اس میں قرآنی نظامِ حکومت کے قیام کا مطالبہ نہایت شدومد سے کیا جا رہا ہے۔ یہ کسی پر احسان نہیں۔ طلوعِ اسلام نے پہلے دن سے یہی مسلک

اختیار کیا (کیونکہ یہ اس مسلک کو قرآن کی روشنی میں مسلکِ حق پرستی سمجھتا تھا)۔ اس نے اگر مسلم لیگ کی تحریکِ تقسیمِ ہند کی تائید واعانت کی تھی تو بھی اس مقصد کے پیشِ نظر لیکن اس کے ساتھ ساتھ طلوعِ اسلام نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا کہ ان مطالبات میں کوئی حرکت ایسی نہ ہونے پائے جس سے استحکامِ پاکستان میں کسی قسم کی کمزوری واقع ہو جائے۔ اگر یہ زمین ہی نہ رہی تو قرآنی حکومت قائم کہاں ہوگی لیکن اس کے برعکس یہی مطالبہ "اسلامی جماعت" کی طرف سے پیش ہو رہا ہے لیکن خالص جماعت سازی اور گروہ بندی کے انداز سے جس سے مسلمانوں میں تشتت وانتشار پیدا ہو اور یہ اس طرح باہمی جھگڑوں میں الجھیں کہ ان کی ساری قوتیں تخریب میں ضائع ہو جائیں۔

اگر "اسلامی جماعت" اپنے مسلک کی حقانیت پر یقین رکھتی ہے، تو ہمارے نزدیک ان کے لئے مستقبل کا لائحہ عمل بالکل واضح ہے۔ ان کا ارشاد ہے:۔

> دس سال پہلے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال آیا تھا کہ وہ ہندو امپیریلزم کے تسلط سے اپنے آپ کو کیسے بچائیں۔ اس سوال کا ایک حل یہ پیش کیا گیا تھا کہ اسلام کے اصولوں اور اسلامی سیرت کی طاقت سے اس خطرے کا مقابلہ کیا جائے مگر اس حل نے مسلمانوں کو اپیل نہ کیا اور وہ اسے آزمانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اب یہ بحث بیکار ہے کہ اسے آزمایا جاتا تو کیا ہوتا۔ دوسرا حل جو پیش کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ قومیت کی بنیاد پر سیاسی جنگ لڑی جائے۔ اس حل کو مسلمان نے قبول کیا اور اپنی ساری قومی طاقت، اپنے تمام ذرائع اور اپنے جملہ معاملات اس قیادت کے حوالے کر دیئے جو ان کے قومی مسئلہ

کو اس طرح حل کرنا چاہتی تھی۔ دس برس کے بعد اس کا پورا کارنامہ ہمارے
سامنے ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کس طرح، کس صورت میں،
ہمارے مسئلہ کو حل کیا۔ جو کچھ ہو چکا ہے وہ اَمٹ ہے اسے اب بدلا نہیں
جا سکتا اس پر اس حیثیت سے تو بحث بیکار ہے کہ یہ نہ کیا جاتا تو کیا ہوتا
البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں
درپیش ہیں، کیا ان کے حل کے لئے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو ہمارے
قومی مسئلہ کو اس طرح حل کر چکی ہے؟ کیا اس کا اب تک کا کارنامہ یہی سفارش
کرتا ہے کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آ پڑے ہیں
جن کا بیشتر حصہ خود اسی قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے انہیں
حل کرنے کے لئے ہم اس پر اعتماد کریں؟

(ترجمان القرآن بابت جولائی ۱۹۵۷ء صفحہ ۱۳۸)

یعنی ایک مسلک وہ تھا جو آزمایا جا چکا ہے اور جس کے تباہ کن نتائج آج قوم کے سامنے

ہندوستان جائیے

ہیں دوسرا مسلک وہ تھا جسے انہوں نے پیش کیا اور
قوم نے اسے اختیار نہ کیا ان کا دعویٰ ہے کہ اسے اختیار
کر لیا جاتا تو مسلمان بغیر نقصان کے ہندو امپیریلزم کے خطرے سے بچ جاتا۔ بہت
اچھا۔ پاکستان کے مسلمانوں نے آپ کی دشمنی اور اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔
لیکن مسلمانوں کو ہندوؤں کی امپیریلزم سے بچانے کا سوال تو اب بھی ہمارے سامنے ہے۔
وہ پانچ کروڑ مسلمان جنہوں نے انتہائی بے کسی کے عالم میں ایک مفتوح اور شکست
خوردہ قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو اچانک اُن ہندوؤں اور سکھوں کے چنگل میں

پایا جن کے ساتھ وہ چند روز پہلے دُوبدُو لڑ رہے تھے (ترجمان القرآن ص۱۳۵) اب ہند امپریلزم کے تسلط میں بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں اگر آپ کے پاس کوئی ایسا پروگرام ہے جس سے وہ اس امپریلزم کے چُنگل سے چھوٹ سکتے ہیں بسم اللہ کیجئے۔ جائیے اور ہندوستان کو اس مسلک کی تجربہ گاہ بنا لیجئے جسے پاکستان کے مسلمانوں نے ٹھکرا دیا۔ ہندوستان کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کی بھی آپ پر ویسی ہی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جیسی پاکستان کے مسلمانوں کی، بلکہ ان سے بھی کہیں زیادہ۔ آپ کا تجربہ کامیاب ہوگا تو وہاں کے مسلمان اپنی مصیبتوں سے نجات پا جائیں گے اور پاکستان کے مسلمان آپ کے مسلک کی حقانیت کے خود بخود قائل ہو جائیں گے اور اس قیادت کو آپ کے قدموں میں ڈال دیں گے جس کی کار فرمائیوں کے نتائج وہ اس بُری طرح سے بھگت رہے ہیں۔

شرعی نظامِ حکومت کا مطالبہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ اگر اسلامی جماعت یہاں نہ رہی تو اس کا پیش کرنے والا بھی کوئی نہ رہے گا پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریت یہی چاہتی ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ یہ آئینی تبدیلی عملاً کس طرح سے ہو لوگ اس کے لئے بھی سوچ رہے ہیں اور کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیں گے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی مصیبتوں کا حل (سردست) اُن کے پاس نہیں اور جو حل یہ سوچیں گے وہ (بزعم آپ کے) پھر غلط ہوگا اس لئے اسلامی جماعت کے جذبۂ اسلام کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس مصیبتِ عظمیٰ سے بچائیں۔ یہ آپ کا اُن پر بھی احسان ہوگا اور پاکستان کے مسلمانوں پر بھی اور وہاں ابھی تک کوئی ایسی قیادت بھی مسلط نہیں ہوئی جسے توڑنا مشکل ہو۔ یہ کام پاکستان میں رہ کر نہیں ہو سکتا۔ ایک تو بُعدِ مسافت کی وجہ سے تبلیغی مشکلات، دوسرے یہ بھی اندیشہ ہے کہ اس سے ہندوستان اور پاکستان کی مملکتوں

میں خواہ مخواہ تصادم پیدا ہو جائے۔ اسلامی جماعت کا مرکز ہندوستان ہی میں ہونا چاہیئے اور وہی خطہ اس کی سرگرمیوں کی جولانگاہ۔ پاکستان کے مسلمانوں کو سردست ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ آپ نے خود ہی تو فرمایا ہے کہ جو مسلک آپ نے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تھا۔

> یہ وہی بات تھی جو نبی ﷺ مکہ میں قریش کے لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ میں وہ کلمہ لے کر آیا ہوں کہ اگر تم اسے لے لو تو عرب و عجم سب تمہارے زیر نگیں ہو جائیں گے لیکن مسلمانوں نے اس مشورہ میں وہی خطرہ محسوس کیا جو قریش نے محسوس کیا تھا کہ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ یعنی اگر ہم اس راہ عمل کو اختیار کر لیں تو اس سرزمین میں ہمارا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا۔
>
> (ترجمان القرآن جولائی ۱۹۴۸ء صفحہ ۱۳۰)

آپ بھی پاکستان کے قریش سے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف ہجرت فرما جائیے اور وہاں اپنے تجربہ کو کامیاب بنا کر پھر پاکستان کی طرف مراجعت فرما کر اسے فتح کر لیجئے۔ اس طرح یہاں بھی آپ کا پیش کردہ مسلک رائج ہو جائے گا۔ اس دوران میں اگر یہاں نظامِ شریعت رائج نہ بھی ہوا تو بھی یہ مملکت (جماعتِ اسلامی کے ارکان کے الفاظ میں) ایسی تو رہ جائے گی جیسی افغانستان اور ایران کے مسلمانوں کی حکومتیں ہیں لیکن اگر آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی خبر نہ لی تو نہ معلوم اُن بچاروں کا کیا حشر ہو!

بابِ دُوُم

آہنی ڈکٹیٹر شپ

آہنی ڈکٹیٹرشپ کے عزائم [۱]

"مزاج شناسِ رسولؐ" کا مفہوم

(دسمبر ۱۹۵۰ء)

کہتے ہیں کہ جس بھیڑیئے کے منہ کو انسان کا خون لگ جائے پھر اسے کسی اور جانور کے خون میں لذت ہی نہیں ملتی۔ بھیڑیوں کے متعلق تو معلوم نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب انسان کے منہ کو انسان کا خون لگ جائے تو وہ چھڑائے نہیں چھوٹتا۔ آپ غور کیجئے تو انسان کی ساری تاریخ اسی خون کی لذت کی داستان نظر آئے گی۔ بالادست انسانوں نے ہمیشہ کمزور انسانوں کا خون چوسا اور ایسا انتظام رکھا کہ یہ انسان اُن کے پنجۂ فولادی کی گرفت سے نکلنے نہ پائیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ فولادی پنجے انسان کے دونوں ہاتھوں میں رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں ملوکیت (مالکانہ مفاد۔ یعنی VESTED INTERESTS کا پنجہ اور دوسرے ہاتھ میں مذہبی پیشوائیت۔ (PRIESTHOOD) کا پنجہ۔

ملوکیت اور پیشوائیت جس طرح شکار کی گرفت کیلئے انسان کے دونوں ہاتھ اکٹھے ہو جاتے ہیں، اسی طرح عوام کو اپنی گرفت میں رکھنے

کے لئے ملوکیت اور پیشوائیت کے یہ فولادی پنجے بھی ایک دوسرے کے معاون ومددگار رہے ہیں۔ معاون ومددگار ہی نہیں بلکہ ـــــ این دو قوت حافظ یکدیگر اند۔ ملوکیت مذہبی پیشوائیت کی محافظ رہی ہے اور مذہبی پیشوائیت ملوکیت کی رکھشا (حفاظت) میں سپر بنی رہی ہے۔ آج بھی آپ دیکھئے دنیا میں جہاں جہاں ملوکیت ہے مذہبی پیشوائیت اس کے ساتھ ہے اور جہاں سے ملوکیت اٹھ گئی ہے وہاں مذہبی پیشوائیت کا اقتدار بھی ختم ہو گیا ہے۔

مظلوم انسانوں کو ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے دنیا میں بہت سے تجربے ہوئے۔ ان میں آخری تجربہ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر سرزمین عرب میں ہوا۔ یہ تجربہ بڑا کامیاب رہا۔ نوعِ انسانی کے اس عظیم القدر معلّم ومحسن نے تیئس سال کی شبانہ روز محنت سے تاریخ میں ایک محیّر العقول انقلاب پیدا کر دیا اور اس کے بعد ساری دنیا کو علی الاعلان کہہ دیا کہ دیکھ لو۔

کس دریں جا سائل ومحروم نیست　　عبد ومولا، حاکم ومحکوم نیست

انقلابِ عظیم

اس انقلاب نے ہر قسم کے مالکانہ مفاد (VESTED INTERESTS) اور مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کا خاتمہ کر دیا جس سے انسانیت کو آزادی کی فضائے بسیط میں اڑان بال کشائی مل گیا۔ اس معلّم ومحسنِ انسانیت نے اس تجربہ کو کسی راز میں نہ رکھا بلکہ ہر ایک سے کہہ دیا کہ اس تجربے کے تمام اصول اس کتاب میں محفوظ ہیں جو میں تمہارے حوالے کئے جا رہا ہوں۔ ان اصولوں پر کاربند رہو گے تو ان کی رو سے پیدا شدہ انقلاب آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

لیکن کچھ عرصہ بعد مفاد پرستانہ ذہنیتیں پھر سے اپنی کمین گاہوں سے نکلیں اور انہوں نے اپنے گم گشتہ اقتدار کی بازیابی کے لئے کوششیں شروع کر دیں جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ملوکیت کے قیام کیلئے مذہبی پیشوائیت کی تائید و اعانت ناگزیر ہے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت کی راہ میں وہ کتاب جس میں اس انقلابی تجربہ کے اصول منضبط تھے، سنگِ گراں بن کر حائل ہو رہی تھی لہٰذا اُن دونوں قوتوں کی پہلی کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کتاب کو راستے سے ہٹانا چاہیے انہوں نے اس کے لئے کیا کچھ کیا؟

پھر وہی نقشہ

یہ داستان بڑی طویل ہے لیکن آخر الامر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے اور اس کتاب انقلاب کی عملی حیثیت یکسر ختم ہو گئی اس کے بعد انہوں نے ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے استحکام کیلئے سندیں وضع کرنی شروع کیں۔ چنانچہ ایک طرف اعلان کر دیا کہ السلطان ظل اللہ علی الارض (بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے) اور دوسری طرف اس قسم کے اعلانات کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل (میری امت کے علما بنی اسرائیل کے انبیاء کی مثل ہیں) اور ملوکیت اور پیشوائیت کی اِن سندات کو منسوب کر دیا اُس انقلاب آفریں معلّمِ و محسنِ انسانیت کی طرف جس نے ملوکیت اور پیشوائیت کا خاتمہ کر دیا تھا چنانچہ اس کے بعد مظلوم انسانیت پھر سے جسمانی اور ذہنی استبداد کے ان فولادی پنجوں کی گرفت میں آ گئی اور ان کے قشونِ قاہرہ نے جی بھر کر ان کا خون پیا۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے[1]۔ آپ دیکھئے۔ آج دنیا

---

[1] ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ مسلمانوں کی تاریخ پر عمومی تبصرہ ہے مُستثنیات اس میں داخل نہیں کیونکہ تاریخ عمومیت سے مرتب ہوتی ہے مُستثنیات سے نہیں۔

میں مسلمانوں کے ممالک میں بادشاہتیں قائم ہیں اور ان بادشاہتوں کی تائید علما کی زبان سے ہوتی ہے وہ خطبوں میں خدا اور رسول کے ساتھ ان بادشاہوں کا نام پکارتا ہے اور ان کے پنجۂ استبداد کے استحکام و تقویت کے لئے دعائیں مانگتا ہے وہ زمینداریوں اور جاگیرداریوں کے جواز کے فتوے دیتا ہے اور ہر قسم کی مفاد پرستانہ ذہنیت کی تائید کرتا ہے اسلام کے دورِ انقلاب میں امیر اُس صاحبِ امر (صاحبِ اختیار) کو کہتے ہیں جو خدا کے قانون کے زور پر مفاد پرستی کے بت کو توڑ دے لیکن اب امیر اُسے کہتے ہیں جو دولت مند ہو۔ مذہبی پیشوائیت بادشاہ سے نیچے اتر کر انہی امراء کے سائے تلے پرورش پاتی ہے اور ان کی تقویت کا باعث بنتی ہے۔ آج مسلمانوں کے قریب قریب تمام ملکوں میں یہی حالت ہے۔

تحریکِ آزادی ہندوستان میں مسلمانوں کی بادشاہت ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ انگریز کی حکومت قائم تھی۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے وہاں آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔ ہندو چاہتا تھا کہ حکومت کو انگریزوں سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لے اور اس طرح وہاں کے مسلمانوں پر حکمراں بن کر بیٹھ جائے۔ اللہ کے ایک بندے نے اپنی قرآنی بصیرت سے اس صورتِ حالات کو بھانپ لیا اور مسلمانوں کو اپنی جداگانہ مملکت قائم کرنے کا تصوّر دیا۔ ایک دوسرا مردِ دانا اٹھا اور اس نے اس تصوّر کو حقیقت بنانے کے لئے جدّ و جہد شروع کر دی۔ مولوی ذہنیت[1] نے ان حالات کا جائزہ لیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس کے اقتدار کا امکان اسی شکل میں ہو سکتا ہے کہ

---

[1] ہم ذہنیت کا ذکر کر رہے ہیں افراد کا نہیں بعض مولوی صاحبان نے پاکستان کے نظریہ کی تائید بھی کی تھی۔

(۱) یا تو مسلمان کی حکومت اس انداز کی قائم ہو جس میں قانون کے اختیارات اس کے ہاتھ میں ہوں (اس کا نام اس نے قانونِ شریعت کا نفاذ رکھ چھوڑا تھا کیونکہ شریعت کا حامل وہ اپنے آپ کو سمجھتا تھا اور یہی اس نے سب کو بتا رکھا تھا۔)

(۲) اور اگر اس قسم کی حکومت قائم نہ ہو تو پھر اس کے اقتدار کی دوسری صورت یہ تھی کہ ہندوؤں کی لادینی اسٹیٹ ہو جس میں مسلمانوں کے پرسنل لاء کا تحفظ ہو جائے یہ ظاہر ہے کہ اس پرسنل لاء (شریعت) کی نگرانی مولوی صاحبان کے ہی سپرد کی جا سکتی تھی۔

مولویانہ ذہنیت نے دیکھا کہ اول الذکر صورت کا امکان بعید ہے کیونکہ تحریکِ پاکستان کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں تھی اُن سے اسے یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ قانونی اختیارات مولوی صاحبان کے ہاتھوں میں دیدیں گے۔ بالفاظِ دیگر مولوی کو مسٹر جناح سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی مملکت کو مولویت کی مفاد پرستانہ ذہنیت کے سپرد کر دیں گے، اس لئے کہ مسٹر جناح کی نگاہ تاریخ پر تھی اور تاریخ بتا رہی تھی کہ یہ ذہنیت کن کن تباہ کاریوں کا موجب بنتی رہی ہے۔ لہٰذا مولوی نے اپنا مفاد دوسری شکل میں دیکھا اور تحریکِ پاکستان کی مخالفت شروع کر دی یہ تھا قومیت پرست علماء کا مسلک مولوی کا ایک اور گروہ تھا جو اس طبقہ سے زیادہ ہوشیار تھا اس نے سوچا کہ انداز یہ رکھنا چاہیئے کہ اگر پاکستان کی تحریک کامیاب نہ ہو تو مشترکہ ہندوستان میں ان کا گروہ مذہب کا نمائندہ سمجھا جائے۔ اور اگر پاکستان قائم ہو جائے تو وہاں قانونِ شریعت کے نفاذ کی تحریک سے اپنا اقتدار قائم کر لیا جائے۔ اس مقصد کیلئے اس گروہ نے ایک طرف قومیت پرست علماء کی مخالفت شروع کر دی (تاکہ پاکستان بن جانے کی صورت میں ان کا شمار قومیت پرستوں میں نہ کیا جائے) اور دوسری طرف پاکستان کی بھی مخالفت شروع کر دی تاکہ پاکستان نہ بننے

کی صورت میں انہیں حامیانِ پاکستان نہ قرار دیا جائے) اور اس کے ساتھ قانونِ شریعت کی

اسلامی جماعت

پکار شروع کر دی (تاکہ پاکستان بنے تو اور نہ بنے تو ان کے وقار و اقتدار کی صورت بہرحال نکل آئے) شریعت سے ان کا مقصود تھا وہ قانون جسے لوگ مرتب کریں اور مرتب کرنے کے بعد اس کی (INTERPR ETATION) بھی انہی سے پوچھی جایا کرے یعنی قانون کے اجارہ دار یہ ہوں اور حکومت ان کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی مشینری ہو۔ یہ گروہ اسلامی جماعت کے نام سے متعارف ہوا۔ پاکستان بن گیا۔ قومیت پرست علماء ہندوستان میں رہ گئے اور اسلامی جماعت کے مولوی صاحبان پاکستان آ گئے اور یہاں شریعت کے نفاذ کا مطالبہ پیش کر دیا۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ شریعت وہ ہے جسے یہ شریعت کہیں۔ ان کی یہ شریعت وہی ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں پیدا ہوئی اور جس کی خصوصیتِ کبریٰ مالکانہ مفاد (VESTED INTERESTS) کی موافقت اور حفاظت ہے۔ پاکستان میں بادشاہت کے قیام کی تو صورت نہیں اس لئے یہاں مالکانہ مفاد کی صورت زمینداری، جاگیرداری، سرمایہ داری ہے۔ ان لوگوں کی کوشش یہ ہے کہ ان مفادات کے تحفظ اور ان کی تائید سے پیشوائیت کے اقتدار کا استحکام ہو جائے یعنی استبداد کے وہی فولادی پنجے جنہیں قرآن کے انقلاب آفریں نظام نے توڑا تھا انہیں پھر سے مسلط کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سامنے جب قرآن کا نام لیا جائے تو ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس لئے کہ قرآن پیشوائیت اور مفاد پرستانہ ذہنیت دونوں کا دشمن

قرآن سے چڑھ

ہے۔ عہدِ رسالتمآب میں کبھی کسی نے مولوی کا نام ہی نہیں سُنا تھا۔ آپ نے کہیں یہ نہ پڑھا ہو گا کہ کسی نے حضرت مولانا

ابوبکرؓ صدیق یا مولانا عمر فاروق کہا ہو۔ وہ دور اس چیز سے آشنا ہی نہ تھا یہ سب دَورِ ملوکیت کی پیدا شدہ چیزیں ہیں اسی لئے یہ لوگ اُسی اسلام کو رائج کرنا چاہتے ہیں جو دَورِ ملوکیت کی پیداوار ہے لیکن اس کی نسبت کردی جاتی ہے حضور رسالتمآبؐ کی طرف۔ نبی اکرمؐ نے قرآن ہی کی اتباع فرمائی۔ اسی کے ذریعہ وہ انقلاب پیدا کیا جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ آپ نے قرآن ہی سے اسلامی مملکت کا نظام و آئین مرتب فرمایا اس لئے قرآن سے آئین مرتب کرنا عین سنتِ رسول اللہ کے مطابق ہے لیکن اس میں پیشوائیت کو نہ اپنے اقتدار کے جواز کی سند ملتی ہے نہ اس مالکانہ مفاد کے تحفظ کی گنجائش جن کی یہ تائید کرنا چاہتے ہیں اس لئے یہ حضرات کہتے ہیں کہ سنتِ رسول اللہ نام ہے اُن روایات کا جن میں ان سب باتوں کی گنجائش نکل آتی ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے جس سے انہیں بھی انکار نہیں کہ رسولؐ اللہ نے روایات کا کوئی مجموعہ اُمت کو نہیں دیا۔ حضورؐ نے خود بھی قرآن پر عمل کیا اور اُمت کو بھی اُسی پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ روایات کے مجموعے تیسری صدی میں مرتب ہوئے جو مسلمانوں کی ملوکیت کا دور ہے اور ان مجموعوں میں وہ تمام روایات مدرج ہو گئیں جن سے ملوکیت اور پیشوائیت کو تقویت ملتی ہے اور جو اس مقصد کے لئے وضع کی گئی تھیں۔ اب یہ لوگ ان روایات کو سنتِ رسول اللہ کا مقدس نام دیکر ان کے ذریعے اپنے اقتدار کا تسلّط چاہتے ہیں۔

روایات

علاوہ ازیں ایک بات اور بھی ہے۔ قرآن کا اپنے متعلق دعوے ہے کہ اس میں کہیں تضاد نہیں۔ اس کی تعلیم کھلی کھلی واضح اور غیر مبہم ہے اور اختلاف کا اس میں کوئی دخل نہیں اس کے برعکس روایات لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور جس قسم کا حکم آپ چاہیں ان سے نکل سکتا ہے جو روایات آپ کے مطلب

کی ہوں انہیں صحیح کہہ دیجئے جو اس کے خلاف ہوں انہیں ضعیف قرار دے دیجئے۔ کہنے کو تو صحیح اور ضعیف کے کئی معیار مقرر ہیں لیکن عملاً اس کا فیصلہ پیشوائیت کی اپنی مرضی پر موقوف ہوتا ہے چنانچہ ان معیاروں پر بحث کرنے کے بعد جو احادیث کے پرکھنے کیلئے مقرر کئے گئے ہیں سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ارشاد فرماتے ہیں :۔

محدثینؒ کی خدمات مسلّم یہ بھی مسلّم کہ نقدِ حدیث کیلئے جو مواد انہوں نے فراہم کیا ہے وہ صدرِ اوّل کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیۃً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کیلئے جو حدیں فطرۃ اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہیں تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے۔ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے۔ مزید برآں یہ ظنِ غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظِ روایت تھا نہ کہ بلحاظِ درایت۔ ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع نہ تھا۔ پس ان کے کمال کا جائز اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ تحقیقات بھی انہوں نے کی ہے اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں ایک بلحاظِ اسناد دوسرے بلحاظِ تفقہ۔

(تفہیمات حصہ اوّل صہ۱۹-۳۱۸)

یہاں تک آپ دیکھیں گے کہ روایات کے متعلق یہ وہی نظریہ ہے جسے طلوعِ اسلام

پیش کرتا چلا آرہا ہے لیکن اس کے بعد دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ طلوعِ اسلام یہ کہتا ہے کہ جب احادیث کی حالت یہ ہے تو دین کے متعلق یقینی تعلیم کا سرچشمہ قرآنِ کریم ہی رہ جاتا ہے کیونکہ اس کی صحت میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں یعنی طلوعِ اسلام خدا کے قانون کی اتباع کی تلقین کرتا ہے اس کے برعکس مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جب احادیث کی حالت یہ ہے

مزاج شناس

کہ ان کے پرکھنے کے ذرائع ناقص ہیں تو پھر رسول اللہ کا صحیح حکم معلوم کرنے کیلئے کیا کیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

> کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے اور اسلام کی صحیح روح اُس کے دل ودماغ میں بس جاتی ہے۔ پھر وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اوّل نظر میں سمجھ لیتا ہے کہ آیا رسول اللہ ایسا فرما سکتے تھے یا نہیں۔ (ایضاً ص ۳۰۲)

غور کیجئے کہ مودودی صاحب آپ کو کس مقام پر لے جاتے ہیں ان کا ارشاد ہے کہ:-

(۱) پاکستان میں قانونِ شریعت کا نفاذ ہونا چاہیئے۔

(۲) قانونِ شریعت احادیث کی رُو سے مرتب ہوگا۔

(۳) احادیث کا ذخیرہ ضعیف اور قوی صحیح اور موضوع روایتوں پر مشتمل ہو۔

(۴) انہیں پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ جو شخص رسول اللہ کا مزاج شناس ہو جائے، وہ جسے صحیح کہہ دے، وہ صحیح ہے، جسے غلط کہہ دے، وہ غلط ہے۔

(۵) اور یہ ظاہر ہے کہ اس وقت خود مودودی صاحب سے بڑھ کر رسول اللہ کا مزاج شناس اور کون ہو سکتا ہے[1]؟

---

[1] فٹ نوٹ صفحہ ۸۲ پر دیکھیئے

لہٰذا، (۴) قانونِ شریعت وہ ہوگا جسے مودودی صاحب قانونِ شریعت قرار دیں۔

یہ چیز محض قیاسی نہیں واقعات پر مبنی ہے۔ اگلے دنوں مودودی صاحب نے یہ بحث چھیڑی تھی کہ زمین پر انفرادی ملکیت جائز ہے اور ایک شخص اپنی زمین دوسروں کو بٹائی پر کاشت کے لئے دے سکتا ہے بعض حضرات نے ان کے اس مسلک کے خلاف کچھ احادیث پیش کیں جن میں مذکور تھا کہ رسول اللہ نے زمین کو بٹائی پر دینے سے منع فرمایا ہے احادیث پرکھنے کے اصولوں کے مطابق یہ روایات صحیح قرار پائی تھیں لیکن مودودی صاحب نے فرما دیا کہ نہیں، حدیثیں وہی صحیح ہیں جو میرے مسلک کی تائید کرتی ہیں۔ یہ حدیثیں جو اس مسلک کے خلاف جاتی ہیں، اُن کے متعلق میری ممارست مجھے یہ بتاتی ہے کہ

دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ اور تھا اور وہ روایات میں بیان کسی اور طرح ہو گیا۔ (ملکیتِ زمین)

اس "دراصل" کے ٹکڑے پر غور فرمایئے یعنی ان احادیث کے الفاظ تو بیشک مودودی صاحب کے مسلک کے خلاف جاتے ہیں، لیکن دراصل ہوا یہ کہ رسول اللہ نے کچھ اور فرمایا تھا اور روایات میں کسی اور طرح بیان ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ مودودی صاحب کے پاس وہ کون سا ذریعہ علم ہے جس کی بنا پر انہوں نے یہ معلوم کر لیا کہ دراصل رسول اللہ نے کچھ اور فرمایا تھا۔ اور روایات میں بیان کسی اور طرح ہو گیا یہ ذریعہ علم ہے رسول اللہ کی وہ مزاج شناسی جو کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے مودودی صاحب کو حاصل ہو گئی ہے اور

ؔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ اب اس کا عدالت میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ یہ "مزاج شناس" مودودی صاحب ہی ہیں۔

جس کے پیشِ نظر وہ تمام مُستند محدّثین کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ

روایات کے بارے میں محدّثین کا مستند ہونا یہ معنی کب رکھتا ہے کہ جن امور کا تعلق عقل، درایت اور فہم و استنباط سے ہے ان میں بھی وہ بالکلیہ معتمد سمجھے جائیں۔

(ترجمان القرآن جلد ۱ عدد ۶ صفحہ ۳۹۵)

اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مودودی صاحب کس طرح قانونِ شریعت کے متعلق خود آخری سند (FINAL AUTHORITY) کی حیثیت اختیار کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ شریعت کے معاملہ میں آخری سند خدا کی کتاب ہے۔ اس لئے کہ ایسا کہنے میں ان کی اپنی سیادت کا خاتمہ ہو جاتا ہے وہ اس کے برعکس کہتے یہ ہیں کہ

جس حکومت کے دستور میں رسولِ خدا کے حکم کو آخری فیصلہ کن سند نہ تسلیم کیا گیا ہو وہ ایک اسلامی حکومت نہیں ہے۔

(دستوری سفارشات پر تنقید صفحہ ۱۳)

آخری حکم مزاج شناس کا

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس کی روشنی میں اس ٹکڑے کو پڑھیئے بات بالکل صاف ہو جاتی ہے آخری حکم رسول اللہ کا ہے۔ رسول اللہ کا صحیح حکم وہ ہے جسے میں صحیح قرار دوں۔ "لہٰذا آخری حکم میرا فیصلہ ہے"۔ دیکھا آپ نے کہ پیشوائیت کی ہوسِ اقتدار کس مقدس اور معصوم رنگ میں آگے بڑھتی ہے۔

یہ عوام کی نگاہوں میں عاشقِ رسول اللہ قرار پاتے ہیں۔ سنت کے متبع، حضور کے فرامین کے دلدادہ، انہی کے مطابق آئینِ پاکستان مرتب کرنے کے داعی اس سے زیادہ ان کے پیشِ نظر اور کوئی غرض نہیں۔ لیکن ذرا گہرائی میں جائیے تو خالص اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے

کے عزائم۔ غور کیا آپ نے کہ کس بُری طرح سے حضورِ سرورِ کائنات کے نام کو (EXPLOIT) کیا جا رہا ہے اور کس معصومانہ انداز میں پیشوائیت کی حکومت (THEOCRACY) قائم کرنے کے منصوبے باندھے جا رہے ہیں۔ ہمارے بعض سطح بین احباب شکایت کیا کرتے ہیں کہ طلوعِ اسلام کو کیا ہو گیا کہ یہ اُس جماعت کی مخالفت کر رہا ہے جو شریعت کا قانون نافذ کرنا چاہتی ہے۔ طلوعِ اسلام کو ہو یہ گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی آمریت قائم کرنے کی فکر میں ہیں اور

ڈکٹیٹرشپ

اس کے لئے خدا اور اس کے مقدس رسول کو سپر بنا رہے ہیں۔ وہ تاریخ میں دیکھ چکا ہے کہ پیشوائیت نے اس سے پہلے کون کون سے فتنے برپا کئے ہیں اور اس بھولی بھالی اُمّت کو کس کس طرح فریب دیئے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ وہی پیشوائیت اب اس نازک ترین دور میں اُمّت کو کتنا بڑا فریب دینے کے درپے ہے۔ ذرا سوچو کہ طلوعِ اسلام کو اس مخالفت سے لینا کیا ہے۔ طلوعِ اسلام کی ساری تاریخ آپ حضرات کے سامنے ہے کیا اس تمام زمانہ میں آپ کوئی ادنیٰ سی مثال بھی ایسی پیش کر سکتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ طلوعِ اسلام نے کوئی بات اپنے مفاد کے لئے پیش کی ہو۔ طلوعِ اسلام کی کوئی پارٹی نہیں۔ یہ کسی پارٹی کا آرگن نہیں، کسی گروہ کا طرفدار نہیں۔ اس نے الکشن نہیں لڑنے۔ اس نے ووٹ نہیں حاصل کرنے۔ پھر اسے کیا پڑی ہے کہ کسی جماعت کی مخالفت خواہ مخواہ کرے۔ اگر کوئی پارٹی الیکشن جیت کر سب کی سب نشستیں بھی حاصل کر لے تو طلوعِ اسلام کو کیا۔ طلوعِ اسلام کے نزدیک موجودہ سب پارٹیاں برابر ہیں۔ اسے اس سے کیا دلچسپی ہے کہ گاؤ آمد و خر رفت لیکن طلوعِ اسلام کی نگاہیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ پیشوائیت کے عزائم قوم کو کس طرح تباہیوں کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ اور چونکہ یہ سب کچھ مذہب کے مقدس نام پر ہو رہا ہے، اس لئے سادہ لوح قوم ان عزائم کو بے نقاب نہیں دیکھ رہی اور ان کے دھوکے میں آ رہی

ہے۔ طلوعِ اسلام اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ قوم کو اس مہیب خطرے سے آگاہ کر دے۔ قوم دوسری پارٹیوں سے فریب نہیں کھاتی۔ جب بھی کوئی لیڈر الگ پارٹی بناتا ہے تو ہر شخص سمجھ لیتا ہے کہ یہ اپنی وزارت قائم کرنے کی فکر میں ہے اور خود بھی اس اعتراف سے ہچکچاتا نہیں لیکن مولویوں کی اس پارٹی کے متعلق سادہ لوح مسلمان ابھی تک یہ سمجھے ہوئے ہے کہ ان کا مقصد وزارتیں اور امارتیں نہیں۔ یہ تو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی کوشش کر رہے ہیں اس لئے ان کا ساتھ دینا خدا اور رسول کا ساتھ دینا ہے۔ پیشوائیت (PRIESTHOOD) نے ہمیشہ یہی کہا ہے۔ پیشوائیت آج بھی یہی کہہ رہی ہے۔ طلوعِ اسلام پیشوائیت کے چہرے سے نقاب اٹھا دینا چاہتا ہے اس کے بعد بھی قوم اگر ان کی اتباع میں بربادیوں کے جہنم کی طرف جانا چاہے تو اس کی مرضی۔

شکست خوردہ

پیشوائیت طلوعِ اسلام کے کسی اعتراض کا جواب تو دے نہیں سکتی عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کیلئے کہہ دیتی ہے کہ طلوعِ اسلام رسول اللہ کا منکر ہے! قاعدہ کی بات ہے کہ ہر شکست خوردہ گالیوں پر اُتر آتا ہے۔ مولویت کی زبان میں یہ بھی گالی ہے۔ اگر اس سے ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو وہ اور گالیاں دے لیں ورنہ کوئی ان سے پوچھے کہ جس طلوعِ اسلام کا ایمان یہ ہو کہ کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ رسالتِ محمدیہ پر ایمان نہ لائے اور کوئی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا اگر وہ رسول خدا کے بعد کسی اور کو رسول تسلیم کرے۔ اسے رسول اللہ کا منکر کہنا کتنا بڑا جھوٹ ہے کہتے ہیں کہ طلوعِ اسلام سنتِ رسول اللہ کا منکر ہے۔ طلوعِ اسلام کا ایمان یہ ہے کہ رسول اللہ نے قرآن کی اتّباع فرمائی لہٰذا قرآن کی اتّباع ہی رسول اللہ کی سنّت ہے۔ رسول اللہ نے اُمّت کو قرآن دیا۔ لہٰذا قرآن سے متمسک رہنا ہی رسول اللہ کے حکم کی تعمیل ہے۔ طلوعِ اسلام رسول اللہ کے لائے ہوئے دین کا منکر نہیں۔ وہ منکر ہے اُس مذہب کا جو جاسے دورِ ملوکیت میں

تیار ہوا اور جو غلط روایات کے مقدس غلافوں میں لپیٹ کر منسوب کر دیا گیا جناب نبئ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف۔ طلوعِ اسلام اس مذہب کا منکر ہے اس لئے کہ اس مذہب کی رُو سے رسول اللہ کے دیئے ہوئے دین کی جڑ کٹتی ہے پیشوائیت اسی مذہب کو سچا دین بتاتی ہے، اس لئے کہ اس مذہب میں ان کی اپنی سیادت و امارت کا راز مضمر ہے۔

ذرا سوچئے کہ آج ہم کس نازک دور میں پہنچ چکے ہیں۔

نازک دور

تیرہ سو سال کے بعد ہمیں پھر ایک خطۂ زمین ایسا نصیب ہوا ہے جس پر ابھی کوئی نظام مسلط نہیں ہوا پھر سوچئے! تیرہ سو سال کے بعد یہ پہلا موقع آیا ہے کہ مسلمانوں کے سامنے یہ سوال درپیش ہے کہ وہ اپنے لئے کس قسم کا نظام مرتب کرنا چاہتے ہیں! سوچئے کہ ہم تاریخ کے کس دوراہے پر کھڑے ہیں ایک طرف وہ راستہ ہے جو ہمیں اس تجربہ کی طرف لے جاتا ہے جو محمدؐ رسول اللہ کی وساطت سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عمل میں آیا جس نے دنیا کے سامنے خدائی نظام کو متشکل کر کے دکھا دیا۔ دوسری طرف وہ راہ ہے جو ہمیں اُس نظام کی طرف لے جاتی ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع کیا گیا۔ رجعت پسندانہ قوتیں (REACTIONARY FORCES) پھر سے اس نظام کو مسلط کرنے کی فکر میں ہیں جو ہمارے دورِ استبداد کی یادگار ہے اور جو آج بھی مسلمانوں کے دوسرے ممالک میں رائج ہے اگر یہ نظام رائج ہو گیا تو پاکستان بھی ویسا ہی ملک ہو جائے گا جیسے مسلمانوں کے دیگر ملک مثل افغانستان، عراق، ایران، عرب ہیں لیکن اگر یہاں قرآن کا نظام نافذ ہو گیا تو پاکستان نہ صرف خود ہی زندگی کی خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہو جائے گا بلکہ پوری دنیا کی امامت اس کے حصہ میں آجائے گی آج دنیا اپنے ہر

نظام سے تنگ آکر مڑ مڑ کر دیکھتی ہے کہ کوئی نظام ایسا بھی ہے جو انسانیت کو تباہی اور بربادی سے بچانے روس صرف روٹی کے مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے۔ بایں ہمہ دنیا اٹھ اٹھ کر اُس کی طرف دیکھ رہی ہے اگر آج دنیا کو کوئی ایسا نظام دیدے جو انسان کی روٹی کا مسئلہ بھی حل کر دے اور اس کے ساتھ ہی اس کے شرفِ انسانیت کو بھی بالیدگی عطا کر دے تو ساری دنیا اُس کی طرف جھک پڑے گی۔ اس لئے کہ روس کے پاس شرفِ انسانیت کی نشو و ارتقا کا کوئی سامان نہیں۔

قرآنی نظام

وہ شرفِ انسانیت کے الفاظ تک سے ناآشنا ہے وہ انسان کو صرف حیوان کی سطح پر دیکھتا ہے۔ لیکن انسانی مشکلات کا حل دنیا کی جمہوریتوں کے پاس بھی تو نہیں ہے وہ بھی تو انسان کو اس کی طبعی سطح (PHYSICAL STATUS) سے اونچی نہیں لے جاتیں۔ اس لئے اگر پاکستان نے تاریخ کے اس نازک موڑ پر صحیح راہ کی طرف قدم اٹھایا تو یہ نہ صرف ملّتِ پاکستانیہ ہی کے لئے وجہ شادابی ہوگا، بلکہ یہ ساری انسانیت پر احسان ہوگا یاد رکھئے! خدا نے اپنے اس آخری ضابطہ کا وارث مسلمانوں کو بنایا تھا اُس نے انہیں اُمّتِ وسطیٰ (INTERNATIONAL PARTY) قرار دیا تھا جس کا فریضہ یہ بتایا تھا کہ لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ تاکہ وہ تمام نوعِ انسانی کے اعمال پر نگاہ رکھے انہوں نے وارثِ کتاب ہونے کے باوجود اس فریضہ کی ادائیگی سے کوتاہی برتی اس لئے اس تیرہ سو سال میں تمام نوعِ انسانی سے جس قدر جرائم انسانیت کے خلاف سرزد ہوئے ہیں اُن سب کی ذمہ داری مسلمانوں کے سر پر عائد ہوتی ہے اگر چوکیدار کی موجودگی میں چوری ہو جاتی ہے تو سب سے پہلے چوکیدار پکڑا جاتا ہے انہی جرائم کی سزا ہے جس میں یہ قوم اس وقت تک ماخوذ چلی آ رہی ہے جہاں اپنی حکومت نہیں وہاں غیروں کی غلامی اور جہاں اپنی حکومتیں ہیں وہاں ملوکیت اور پیشوائیت کا استبداد! اس سے بڑھ کر اور سزا کیا ہو سکتی ہے۔ اب خدا خدا کر کے ایک موقع

سامنے آیا ہے کہ اگر یہ قوم چاہے تو اپنے جرائم کا کفارہ ادا کر کے خود بھی سربلندی و سرفرازی کی زندگی بسر کرے اور نوعِ انسانی کو بھی سلامتی کے راستہ کی طرف لے جائے۔ لیکن اگر اس نے ایسا نہ کیا تو مسلمانوں کے دوسرے ممالک کی طرح یہ بھی مغربی اقوام کے سیاسی مصالح کے رحم و کرم پر زندہ رہے گی۔ اس صورت میں یا تو کمیونزم کا لادینی فلسفہ اسے چپٹ کر رہ جائے گا اور یا یورپ کا دوسرا محاذ اسے اپنی کاسہ لیسیوں کا آلۂ کار بنائے رکھے گا۔ پاکستان میں ملوکیت اور پیشوائیت کے ازمنہ وسطیٰ کے مستبد نظام کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔

آہنی ڈکٹیٹر شپ ۲

(اگست ستمبر ۱۹۵۲ء)

یوں تو

تاریخِ اُمَم کا یہ پیامِ ازلی ہے صاحبِ نظراں! نشۂ قوّت ہے خطرناک!

لیکن تاریخ ہی ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جب زمامِ اختیار اُن لوگوں کے ہاتھ میں آجائے جو خدا کے نام (مذہب) کو اپنی ہوسِ اقتدار کا آلۂ کار بنائیں تو یہ ادوار تاریخِ انسانیت میں سب سے زیادہ وحشت انگیز اور انسانیت کُش ہوتے ہیں۔ اس وقت ہر گرگِ خوں آشام، برّۂ معصوم کی کھال اوڑھ کر سامنے آتا ہے اور ہر ابلیس خدائی فوجدار ہونے کا مدّعی ہوتا ہے۔ جبر و قہرمانیت کے اس اندازِ سیاست میں جسے مذہبی پیشواؤں (PRIESTS) کا گروہ حکومتِ الٰہیہ (TEOCRACY) کے مقدّس نام سے لوگوں پر مسلّط کرتا ہے، خدا کے نام پر ہر وہ ظلم و استبداد روا رکھا جاتا ہے جس سے خود ظلم شرما جائے اور استبداد کی آنکھوں میں حیا آجائے۔ اہلِ پاکستان کی بدبختی سے آج ان فتوحات چھیننے والے ہوس کاروں میں ایک گروہ وہ ہے جو اپنے حصولِ مقصد کیلئے مذہب کو آلۂ کار بنا رہا ہے۔ یہی ہے وہ سب سے زیادہ خطرناک گروہ جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ان لوگوں کی داستان بڑی دلچسپ (اور معیارِ انسانیت کے مطابق بڑی افسوسناک)

ہے۔ ملک کی دوسری پارٹیاں جو حصولِ اقتدار کے لئے باہمد گر دست وگریباں ہیں، ان کی پھر بھی یہ کیفیت ہے کہ وہ حصولِ پاکستان کی تحریک کے ہم نوا تھے اور اس مقصد کے لئے اُس زمانہ میں جو کوششیں بھی ہو رہی تھیں، اُن میں مسلم لیگ کا ساتھ دیتے تھے لیکن

ان کا ماضی

مذہب کے نام پر زمامِ اقتدار حاصل کرنے والے مقدسین کے اس طائفہ کا ماضی یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کے زمانہ میں یہ جماعت پاکستان کی بدترین دشمن تھی۔ اور چونکہ ان کا اُس وقت بھی یہ دعویٰ تھا جیسا کہ آج دعویٰ ہے، کہ کسی ملک سے ان کی موافقت یا مخالفت ذاتی رجحانات کی بنا پر نہیں بلکہ از روئے شریعت ہوتی ہے، اس لئے یہ حضرات اُس وقت تحریکِ پاکستان کو شریعت کے خلاف قرار دیتے تھے اور مسلمانوں کو اس "زہر ملے حلوے" سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے لیکن پاکستان بن جانے کے بعد ان حضرات کی "شریعتِ حقہ" نے یہ فتویٰ دیدیا کہ اس مملکت کی حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہونے کی کوشش عین جہاد ہے۔ مومن کا مقام تو خیر بہت بلند ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کیا دنیا میں کوئی انسان، جس کے دل میں اصول پرستی کا ذرا سا بھی خیال ہو، اس قسم کی ننگِ انسانیت روش اختیار کر سکتا ہے؟ ان سے تو حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، احمد سعید، حفظ الرحمٰن جیسے لوگ ہزار درجے اچھے ہیں کہ اگر پاکستان کی مخالفت کی تھی تو پھر پاکستان کی طرف رخ نہیں کیا۔ اس قسم کا مسلک صرف موقع پرستوں (OPPORTUNISTS) کا ہو سکتا ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں منافقت کہا جاتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں ہزاروں (لاکھوں) کی تعداد میں وہ مسلمان موجود ہیں جو تحریکِ پاکستان کے زمانہ میں نیشنلسٹ تھے۔ ان کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ سو اوّل تو ہم اُن کے متعلق بھی یہی کہیں گے کہ کریکٹر کا تقاضا یہی تھا کہ یہ لوگ بھی ہندوستان ہی میں رہتے لیکن

اگر وہاں حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے جن کی رُو سے وہاں سے جان بچا کر بھاگ آنا ضروری ہو گیا تھا تو یہ لوگ یہاں پاکستان کے شہریوں کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں اگر ان کا اب بھی یقین (CONCEPTION) وہی ہے جو تحریکِ پاکستان کے زمانہ میں تھا تو ان کی مثال پاکستان میں بسنے والی اقلیتوں کی سی ہو گی۔ لیکن اگر اب ان کا وہ یقین بدل چکا ہے تو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہایت دیانت داری سے اس امر کا اعلان کریں اس کے بعد ان کی مثال فتح مکہ کے بعد کے مسلمانوں کی سی ہو جائے گی۔

لیکن اسلامی جماعت کی پوزیشن مذکورہ صدر نیشنلسٹوں سے مختلف ہے ان لوگوں کا محض از روئے سیاستِ ملکی یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر متحدہ حکومت قائم کریں برعکس اس کے اسلامی جماعت کا دعویٰ یہ تھا کہ تحریکِ پاکستان اسلام کی رُو سے منافی اور شریعت کے خلاف ہے۔

حالات بدل چکے ہیں کہا جا سکتا ہے کہ حالات کے بدل جانے سے شریعت کا فیصلہ بدل سکتا ہے۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ حالات میں وہ کون سی تبدیلی واقع ہوئی ہے جس کی بنا پر شریعت کا فیصلہ بدل گیا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہاں وہی مسلمان بستے ہیں جو پاکستان کا مطالبہ کرتے تھے (اور جنہیں یہ حضرات "پیدائشی مسلمان" کہہ کر "اصل مسلمانوں" کے حلقے سے خارج کر دیتے تھے) اور وہی حکومت ہے جس کے قیام کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ جب یہ دونوں صورتیں اپنی جگہ پر قائم ہیں تو پھر شریعت کا فیصلہ کس طرح بدل گیا۔

ان حضرات کی طرف سے کہا یہ جاتا ہے کہ مملکتِ پاکستان قراردادِ پاکستان کے پاس کرنے سے "مسلمان ہو گئی ہے" اس لئے اس تبدیلی کی بنا پر شریعت کا فیصلہ بدل گیا ہے۔

قرار دادِ مقاصد میں صرف اس امر کا اعلان ہے کہ مسلمانانِ پاکستان اپنا آئین کتاب وسنّت کے مطابق مرتب کریں گے سوال یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران میں مسلمانوں نے کب کہا تھا کہ اگر ہماری حکومت قائم ہوگئی تو اس کا آئین منٹوسمرتی کے مطابق بنایا جائے گا جو اُس وقت پاکستان کی تائید کفر تھی اور اب وہ عین اسلام ہوگئی۔ تحریکِ پاکستان کی تو بنیاد ہی اس دعوے پر تھی کہ مسلمان اپنا جدا تمدن، جدا تہذیب، جدا معاشرت، جدا تصوّرِ زندگی رکھتے ہیں اس لئے یہ اپنی جدا حکومت چاہتے ہیں جس میں اپنی زندگیوں کو اپنے مخصوص تصوّر کے مطابق ڈھال سکیں۔ اس حقیقت کو بار بار دہرایا جاتا تھا حتّٰی کہ جب نیشنلسٹ علماء یہ کہتے کہ متحدہ حکومت میں مسلمانوں کا پرسنل لاء (شخصی قانون) مذہب کے مطابق ہوگا، تو اس کے جواب میں کہا جاتا تھا کہ مسلمانوں کا مذہب پرسنل لاء تک ہی محدود نہیں اس کا دائرہ زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے اس لئے انہیں مذہبی آزادی صرف اپنی حکومت میں حاصل ہو سکتی ہے۔ فرمائیے کہ ان اعلانات میں اور قرار دادِ مقاصد میں مفہوم کے اعتبار سے فرق کیا ہے، کہ اوّل الذکر کفر تھا اور ثانی الذکر عین اسلام بن گیا۔

تب اور اب

اُس وقت اسلامی جماعت کا دعویٰ یہ تھا کہ اسلام کا مقصود "پیدائشی مسلمانوں" کو اصلی مسلمان بنانا ہے نہ کہ پیدائشی مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا۔

اس لئے ہم پیدائشی مسلمانوں کو اصلی مسلمانوں میں تبدیل کرنے کی فکر میں ہیں اور یہی اسلام کا منشاء ہے۔ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ پیدائشی مسلمان اپنی حکومت قائم کرتے ہیں یا محکوم رہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان دونوں صورتوں میں کچھ بھی فرق نہیں حتّٰی کہ ہمارے نزدیک پیدائشی مسلمانوں کا مسلمان رہنا یا نہ رہنا بھی برابر ہے۔ آج وہی پیدائشی مسلمان ہیں اور وہی ان کی حکومت، لیکن آج ان علمبردارانِ شریعتِ حقّہ کے نزدیک سب سے مقدم مسئلہ

اس حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہونا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جمہور کا حافظہ (PUBLIC) اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ انہیں یاد ہی نہیں رہتا کہ جو شخص ہم سے آج یہ کچھ کہہ رہا ہے وہ کل کیا کہہ رہا تھا۔ یہ حضرات عوام کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے ماضی اور حال میں اس قدر تضاد ہو اور جو آج کچھ کہتے ہوں اور کل کچھ وہ کہیں چار آدمیوں کے سامنے کھڑے ہو سکنے کے بھی قابل ہیں؟

تکنیک

اب دیکھئے کہ ان لوگوں کی تکنیک کیا ہے؟ مسلمانوں کی کیفیت یہ ہے (اور یہ کیفیت ہر اُس قوم کی ہو جاتی ہے جس نے سوچنا چھوڑ دیا ہو) کہ ان کے ہاں کچھ الفاظ وراثتاً (نسلاً بعد نسلٍ) چلے آتے ہیں جو ان کے نزدیک بالکل غیر شعوری طور پر بہت محبوب اور واجب الاحترام ہیں (انہوں نے کبھی نہیں سوچا کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے اور ہم انہیں کیوں محبوب سمجھتے ہیں) خدا پرستی، نیک عملی، ثواب، تقویٰ، تزکیۂ نفس، روحانی ترقی وغیرہ اسی قسم کے الفاظ ہیں۔ انہی الفاظ میں شریعت بھی شامل ہے جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے مسلمانوں کو یہ الفاظ غیر شعوری طور پر اچھے لگتے ہیں۔ اور جس گوشے سے ان الفاظ کی آواز کان میں پڑتی ہے وہ بلا ارادہ اس طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ نہ سوچنے والی قوموں کی یہی روش ہوتی ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ جن چیزوں کو دل کی گہرائیوں میں جگہ دیئے ہوئے ہیں وہ بجز اس نیست کہ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ (کچھ الفاظ ہیں جنہیں تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے اختیار کر رکھا ہے) مسلمانوں کی یہی نفسیاتی کیفیت ہے جس سے مفاد پرست گروہ ہمیشہ فائدہ اٹھاتے چلے آ رہے ہیں وہ ان الفاظ کو بطور سلوگن (SLOGAN) پیش دیتے ہیں اور اس کے بعد عوام بلا سوچے

سمجھے ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور اسے نہایت نیک نیتی سے ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ مسلمانانِ ہند و پاکستان کی گذشتہ پچاس سالہ اجتماعی زندگی پر تیرتی ہوئی نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ اس قسم کی نعرہ بازیوں نے انہیں کس طرح اپنے پیچھے لگا کر تباہ و برباد کیا۔ یہی کچھ ان کے ساتھ آج اسلامی جماعت کر رہی ہے۔ ان کا سلوگن یہ ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ نظامِ حکومت خدا کے صالح بندوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ عوام کو کچھ معلوم نہیں کہ شریعت کسے کہتے ہیں اور صالح بندوں سے مفہوم کیا ہے؟ یہ الفاظ انہیں غیر شعوری طور پر محبوب ہیں۔ اس لئے وہ ان کی طرف بلا ارادہ کھنچے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک بات اور بھی ہے جس سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھا لیا۔ موجودہ برسرِ اقتدار طبقہ بالعموم ان لوگوں پر مشتمل ہے جو ڈاڑھیاں منڈاتے، سر پر انگریزی بال رکھتے اور سوٹ پہنتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو کلبوں میں جاتے ہیں، شراب سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ علاوہ بریں ان کی بیویاں بے پردہ پھرتی ہیں۔ ان حضرات نے عوام کے سامنے ان لوگوں کی تصویر پیش کر کے کہنا شروع کر دیا کہ یہ ہیں وہ لوگ جو شریعتِ حقہ کی تضحیک کرتے ہیں۔ ان کے برعکس ہمیں دیکھئے کہ ہماری ڈاڑھیاں بھی ہیں اور سر پر پٹے بھی۔ ہمارے پائجامے ٹخنوں سے اونچے ہیں اور ہماری بیویاں پردہ بھی کرتی ہیں۔ اب کہو کہ خدا کے صالح بندے یہ لوگ ہیں یا ہم؟ عوام کے لئے صالحیت اور غیر صالحیت کا یہ معیار کافی تھا اس لئے وہ ان کے پیچھے ہو لئے۔

سلوگن

لہ واضح رہے کہ خود امیر جماعتِ اسلامی (سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی) نے اس جماعت سازی کے وقت ڈاڑھی رکھی تھی اور سر کے بال بھی پٹوں میں تبدیل کر لئے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے وہ (SHAVE) کرتے تھے اور سر پہ بال بھی انگریزی وضع کے تھے۔

عوام کو ساتھ رکھا جائے

اب ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ مغربی جمہوریت کی تکنیک یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح عوام کی اکثریت کو اپنے ساتھ رکھا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام سے مبہم الفاظ میں باتیں کی جائیں۔ اس لئے کہ جب تک الفاظ میں ابہام رہے گا انہیں مختلف معنی پہنائے جا سکیں گے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے ساتھ رکھا جا سکے گا۔ اگر بات واضح اور متعین الفاظ میں کی جائے تو صرف وہی گروہ ساتھ رہ سکے گا جو اس متعین مسلک میں آپ کا ہم نوا ہوگا۔ اس تکنیک کے پیش نظر اسلامی جماعت نے اپنے مطالبہ کو ہمیشہ مبہم رکھا ہے۔ اس کے الفاظ کا مفہوم متعین نہیں کیا۔ مطالبہ یہ ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ انہوں نے (باوجود تقاضوں کے) آج تک یہ نہیں بتایا کہ شریعت سے ان کا مفہوم کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ خوب جانتے ہیں کہ شریعت کا کوئی سا مفہوم بھی متعین کیا جائے۔ ان کے ساتھیوں کا ایک نہ ایک طبقہ ان کا ساتھ چھوڑ کر مخالفت شروع کر دے گا۔ اس لئے ان کی مصلحت بینی کا تقاضا یہی ہے کہ اس لفظ کو غیر متعین رہنے دیا جائے تاکہ سادہ لوح مسلمانوں کی اکثریت کو اپنے ساتھ رکھا جائے۔

ماڈرن مقلّد طبقہ

اکثریت کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے انہوں نے ایک اور تکنیک بھی اختیار کر رکھی ہے۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ تو یکسر عوام کا ہے جو اندھی تقلید کے بہاؤ میں بہے چلا جاتا ہے۔ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اگرچہ تعلیم یافتہ کہلاتا ہے لیکن ابتدائی تعلیم و تربیت و ماحول کے اثرات اور اپنی فکری صلاحیتوں کے فقدان کے باعث مذہب کے معاملے میں بالکل عوام جیسا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کا ظاہر ماڈرن ہے لیکن باطن اس دقیانوسی ملائیت کا حامل۔ یہی وہ طبقہ تھا جو آج سے کچھ عرصہ پہلے

مزائیت کے دامِ تزویر میں گرفتار ہوا کیونکہ انہوں نے بھی ان کے دونوں پہلوؤں کی تسکین کا سامان فراہم کیا تھا۔ اب وہی انداز اسلامی جماعت نے اختیار کر رکھا ہے یہ جماعت دقیانوسی ملائیت کا پیکر ہے لیکن انہوں نے اسلوب نگارش (FORM OF EXPRESSION اور طریق استدلال ماڈرن رنگ کا اختیار کر رکھا ہے چونکہ یہ طریق پہلے مولویانہ طریق سے مختلف ہے اس لئے یہ لوگ محض اسلوب بیان اور طریق استدلال کے فرق کی بناء پر یہ خیال (IMPRESSION) عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا پیش کردہ مذہب ملائیت سے مختلف ہے اس سے وہ تعلیم یافتہ طبقہ (یعنی سوٹ پہننے والا ملا) ان کا ہم نوا ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے ان کی ظاہرا ماڈرن ازم بھی قائم رہ جاتی ہے اور قلبی ملائیت کی بھی تسکین ہو جاتی ہے اس جماعت کی خوش قسمتی سے بعض مولویوں کی طرف سے ان کی مخالفت بھی ہو گئی ہے[1]۔ یہ لوگ اس سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں اور یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ دیکھ لو ہم ملا نہیں ہیں۔ یہ بھی بہت بڑا دھوکا ہے جو ان لوگوں کی طرف سے دیا جا رہا ہے آپ ان سے کہئے کہ یہ واضح الفاظ میں بتائیں کہ وہ کون کون سے امور ہیں جن میں یہ دیگر علماء سے اختلاف رکھتے ہیں تبارت صاف ہو جائے گی!

اب یہ دیکھئے کہ ان لوگوں نے اپنے قیام کے لئے سہارا کون سا پکڑا ہے اس دور میں قرآنی تعلیم کے بہت سے گوشے بڑی سرعت سے آشکارا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ملوکیت بڑی تیزی سے ختم ہو رہی ہے پیشوائیت کا جنازہ نکل رہا ہے نسل پرستی کا تصور معدوم

[1] مولویوں میں شروع سے باہمدگر مخالفت چلی آرہی ہے مقلد اور غیر مقلد حنفی اور شافعی وغیرہ کی باہمی مخالفتیں کسی سے چھپی ہوئی نہیں۔ اس قسم کی کچھ اصطلاحی سی چیزیں ہیں مثلاً فقہ میں اجتہاد یا روایات پر کھنے کا معیار۔ جنکی بناء پر بعض ملا مودودی صاحب کی مخالفت کرتے ہیں کیا اس قسم کی مخالفت سے ایک ملا ملا نہیں رہتا۔ کیا مقلد ملا ملا سے کچھ اور ہو جاتا ہے۔

ہوتا جا رہا ہے جغرافیائی حدود کی جگہ عالمگیر انسانی برادری کا خیال اُفق سے ابھر رہا ہے اس کے ساتھ ہی سرمایہ داری کی لعنت بھی مٹتی چلی جا رہی ہے۔ زمینداری اور جاگیرداری، سرمایہ داری کے قدیم ادارے ہیں انہیں بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے ان لوگوں کو اپنا مستقبل سخت خطرہ میں دکھائی دے رہا ہے اس لئے اگر انہیں کسی طرف سے تائید کی ذرا سی اُمید بھی نظر آئے تو یاس

زمینداری کی تائید

گوشے کی طرف لپک کر جاتے ہیں۔ اسلامی جماعت نے ان لوگوں کی اس کس مپرسی اور احتیاجِ تائید کی کیفیت کو بھانپا اور زمینداری کی تائید شروع کر دی چونکہ ہماری روایات کے مجموعے ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوئے تھے[1] اس لئے ان میں مفاد پرستی اور سرمایہ داری کی تائید میں بہت کچھ مل سکتا ہے چنانچہ انہی روایات کی بناء پر اس جماعت نے زمینداری کے مسئلہ (CASE) کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اسلام میں زمین کی انفرادی ملکیت پر کوئی حد نہیں باندھی جا سکتی۔ اس لئے زمینداری عین شریعت کے مطابق ہے، اسی طرح سرمایہ داری بھی یہ ہے وہ "ارضی" سہارا جس پر یہ "آسمانی" تحریک قائم ہے۔

پروپیگنڈا اس جماعت کا خاص فن ہے۔ گذشتہ انتخابات میں ناکام رہنے کے بعد انہیں پھر پروپیگنڈا کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان کے پاس کوئی پروگرام نہیں (اپنی مفاد پرستی کے علاوہ کوئی نصب العین نہیں) اس لئے پروپیگنڈا کے لئے نئے حربے کہاں سے آئیں چنانچہ انہوں نے پھر سے اسی پرانے سلوگن کو دہرانا شروع کر دیا ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اب پھر ہر مسجد میں اس کے لئے جلسے منعقد کئے جا رہے ہیں

---

[1] دیکھئے رسالہ "ملکیتِ زمین" از سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ اسی قسم کی "شریعت" مرزا بشیر الدین احمد صاحب نے بھی اپنی کتاب میں پیش کی ہے۔

پھر وہی سلوگن

اور اس سلوگن پر مشتمل ریزولیوشن پاس کر کے حکومت کے پاس بھیجے جا رہے ہیں۔ اب ذرا اس مہم کی حقیقت پر غور کیجئے۔ حکومت کی پاس کردہ قراردادِ مقاصد میں یہ اصول موجود ہے کہ پاکستان کا آئین کتاب و سنت کے مطابق ہوگا۔ خود اسلامی جماعت کے نزدیک اس قرارداد کی اہمیت اس قدر تھی کہ انہوں نے کہا تھا کہ اس قرارداد کے منظور کرنے سے مملکتِ پاکستان مسلمان ہوگئی ہے۔ یہ قرارداد ابھی تک اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ نہ اس میں کوئی ترمیم و تنسیخ ہوئی ہے نہ رد و بدل۔ اس قرارداد کو بنیاد تسلیم کر کے حکومت تدوینِ آئین کے کام میں مصروف ہے۔ ان حالات میں یہ ایجیٹیشن شروع کرنا کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ پاکستان کا آئین شریعت کے مطابق ہونا چاہیئے، بے معنی غوغا آرائی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ مطالبہ تو پھر بھی قابلِ فہم ہو سکتا تھا کہ آئین سازی کا کام جلدی ختم کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس پروپیگنڈے سے جماعت کا مقصود اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ لوگوں پر ظاہر کیا جائے کہ شریعت کے مطابق آئین سازی کا خیال صرف اسی جماعت کو ہے۔ اس کے بعد اگر آئین ان کی مرضی کے مطابق بن جائے تو پھر ڈھنڈورا پیٹا جائے کہ یہ سب اسلامی جماعت کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جس طرح انہوں نے اس سے پیشتر ڈھنڈورا پیٹا تھا کہ قراردادِ مقاصد انہی کی جدّوجہد کا نتیجہ ہے۔ ان کی نیّت کا اس سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے آٹھ نکاتی اشتہارات میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ حکومت کی پاس کردہ قراردادِ مقاصد میں یہ چیز موجود ہے کہ پاکستان کا آئین کتاب و سنّت کے مطابق ہوگا۔

شرعی نظام

اب یہ دیکھئے کہ اس مطالبہ کی تہ میں ہے کیا؟ ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ (۱) شریعت صرف قرآن سے مرتب نہیں ہوتی۔ قرآن مجمل بھی ہے اور نامکمل بھی۔ اس کے اجمال کی تفصیل اور اس کی ناتمامی کی تکمیل سنّت سے ہوتی ہے۔

سنت سے مراد ہیں روایات کے مجموعے۔
(ب) روایات کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں غلط بھی ہیں اور صحیح بھی۔
(ج) غلط اور صحیح روایات پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ جس روایت کے متعلق مزاج شناسِ رسول، یہ کہہ دے کہ وہ صحیح ہے اسے صحیح تسلیم کیا جائے جس کے متعلق وہ کہہ دے کہ غلط ہے اسے غلط مانا جائے۔
(د) جس مسئلہ کے متعلق کوئی روایت نہ مل سکے اس کے لئے بھی مزاج شناسِ رسول کہہ سکتا ہے کہ اگر اس وقت رسول اللہ موجود ہوتے تو وہ کیا فیصلہ دیتے؟

ڈکٹیٹر شپ

آپ نے غور فرمایا کہ ان عقائد کی رو سے شریعت سمٹ سمٹا کر کہاں پہنچ جاتی ہے۔ شریعت محصور ہو جاتی ہے۔ مزاج شناسِ رسول کے فیصلوں میں اسے اپنے فیصلوں کی تائید میں نہ کسی سند کی ضرورت ہے نہ مشورے کی، نہ دلیل کی حاجت ہے نہ شہادت کی۔ آخری فیصلہ ٹھہرتا ہے اس کی نگاہ پر کیونکہ اس کی نگاہ میں وہ بصیرت ہوتی ہے جو یہ کہہ سکے کہ اس مقام پر رسول اللہ کا فیصلہ کیا ہو سکتا تھا؟ وہ اپنی رائے کو رسول اللہ کے حکم کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور اسی حیثیت سے اسے منواتا ہے۔ جو اس سے اختلاف کرتا ہے وہ رسول اللہ کے حکم سے اختلاف کرتا ہے۔ اور چونکہ رسول اللہ کا حکم خدا کا حکم ہے اس لئے اس "مزاج شناسِ رسول" کا حکم دراصل خدا کا حکم قرار پا جاتا ہے، یہ ہیں وہ خدائی اختیارات جو یہ "مزاج شناسِ رسول" اپنی ذات میں

نہ آپ نے غور فرمایا کہ یہ حضرت احادیث کی اطاعت پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں؟ اس لئے کہ احادیث کی اطاعت سے مقصود ہوتا ہے خود ان لوگوں کے فیصلوں کی اطاعت۔ اس طرح یہ لوگ رسول اللہ کے نام کی سپر میں اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین چاہتے ہیں۔

حکایتِ قدِ آں یار دلنواز کنم ۔۔۔ بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

سمیٹ لیتا ہے اور اس طرح خود خدا بن کر مخلوقِ خدا پر حکومت کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی ڈکٹیٹرشپ ہے جس کی مثال دنیا کے مستبد ترین آہنی ڈکٹیٹروں کے ہاں بھی نہیں ملے گی۔ یہ ہے وہ "حکومتِ الٰہیہ" (THEOCRACY) کی مطلق العنان آمریت جسے مقدسین کا یہ طائفہ اُمّت پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ ان کے اس استبداد کی زد کہاں تک ہوگی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ان لوگوں کی طرف سے ابھی سے یہ اعلانات شروع ہو گئے ہیں کہ اسلام میں مُرتد کی سزا قتل ہے[1] اور مُرتد سے مراد وہی شخص نہیں جو اسلام چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لے، بلکہ "شریعت" کی رو سے ہر وہ شخص مُرتد ہے جو اسلام کے مسلّمہ عقائد سے اختلاف رکھے اور عقائد وہی مسلّمہ ہو سکتے ہیں جن کی صحت کی تصدیق ان حضرات کی طرف سے ہو۔ ان سے ذرا اختلاف ہوا اور آپ مرتد قرار پائے اس کے بعد آپ کا انجام ظاہر ہے یعنی جن اختلافات کی بناء پر آج یہ حضرات (اختیارات نہ ہونے کی وجہ سے) صرف گالیوں تک اکتفا کرتے ہیں اختیارات حاصل ہونے کے بعد انہی اختلافات کی بنا پر ان کے مخالفین کو حوالۂ دار و رسن کیا جائے گا اور چونکہ یہ سب کچھ کیا جائے گا "خدا کا نام بلند کرنے کے لئے" اس لئے جو شخص انکے استبداد کے خلاف لب کشائی کرے گا اس کا مقام بھی پھانسی کا تختہ ہوگا۔ آپ دنیائے مذہب کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے اور یہ دیکھئے کہ جس زمانہ میں زمامِ اقتدار مذہبی ملاؤں کے ہاتھ میں آئی ہے تو انسانیت پر کیا گزری ہے؟ خود مسلمانوں

---

[1] اس کی تفصیل طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "قتلِ مُرتد، غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت" میں دیکھئے۔

کی تاریخ میں ایسے زمانے گزر چکے ہیں جب ہر شخص کو اپنی جیب میں "صحتِ عقائد کا سرٹیفیکیٹ" رکھنا پڑتا تھا جس کے پاس ایسا سرٹیفیکیٹ نہ ہوا سے ہر وقت اپنی جان کا خوف رہتا تھا کیونکہ ارتداد کے جرم میں اس کا خون مباح ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر خونِ ناحق مذہبی پیشواؤں کے خود ساختہ "خدا" کے نام پر بہایا گیا ہے، شیطان کے حصے میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا ہوگا۔ آج بھی جن اسلامی ممالک میں شریعت کا نفاذ ہے، وہاں دیکھئے کہ شخصی استبداد کی گرفت کس قدر آہنی ہے۔ وہاں ملوکیت اسی شریعت کے سائے میں پروان چڑھتی ہے اور ہر ظلم "خدا" کے نام پر روا رکھا ہے۔ اسی کی کوشش آج پاکستان میں ہو رہی ہے اس وقت یہ لوگ شریعت کے نام پر اپنی قوت مجتمع کر رہے ہیں اور سادہ لوح مسلمان کو کچھ معلوم نہیں کہ اس دام ہمرنگِ زمین کے نیچے کیا ہے؟ جب انہوں نے اس طرح قوت فراہم کر لی تو اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہاں جو آئین بھی مرتب ہو اس کے متعلق یہ لوگ اعلان کر دیں گے کہ یہ شریعت کے مطابق نہیں۔ شریعت کے مطابق صرف وہ آئین ہو سکتا ہے جسے "مزاج شناسِ رسول" کی تصویب حاصل ہو اس طرح یہ کوشش کریں گے کہ ان کا مرتب کردہ آئین ملک میں نافذ ہو۔ آئین کسی جامد شے کا نام نہیں کہ ایک دفعہ مرتب ہو چکنے کے بعد قصہ ختم ہو۔ آئین چند بنیادی اصولوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی تعبیرات (INTERPRETATIONS) اور جزئیات کی ترتیب کا کام متقلاً جاری رہتا ہے ظاہر ہے کہ یہ کام انہی کے سپرد ہو سکے گا۔ جو آئین کی تدوین کے ذمہ دار ہوں گے! یہ ہے وہ طریقِ کار جس سے یہ لوگ یہاں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں آپ خود سوچ لیجیے کہ اگر (خدا نکردہ) یہ لوگ اپنے عزائم میں کامیاب ہو گئے۔ تو پاکستان کا حشر کیا ہوگا! یہ دوسرا افغانستان بن جائیگا۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بناپر طلوعِ اسلام ان حضرات کی مقدس نقابوں میں چھپی ہوئی اقتدار پرستیوں کی مخالفت کرتا ہے اور یہ ہے وہ مخالفت جس کی وجہ سے یہ لوگ طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث اور ایک جدید اسلام کا بانی اور نہ جانے کیا کیا قرار دے کر سزاوارِ دارورسن قرار دیتے ہیں۔ طلوعِ اسلام نہ مقامِ رسالت کا منکر ہے نہ مقامِ حدیث کا۔ یہ منکر ہے ان لوگوں کی دسیسہ کاریوں کا جو رسول اور حدیث کے نام پر اپنا اقتدار قائم کر کے پیشوائیت د ا کا وہی استبداد پھر سے لانا چاہتے ہیں جسے مٹانے کے لئے قرآن نازل ہوا تھا اور جس کے ذریعہ رسول اللہؐ نے دنیا کو انسانیت ساز اور زندگی بخش پیامِ عدل و ربوبیت دیا تھا۔ طلوعِ اسلام اسی قرآنی اسلام کی تجدید کرنا چاہتا ہے۔

آہنی ڈکٹیٹر شپ ۳

(جنوری ۱۹۵۱ء)

تشکیل پاکستان کے بعد نیشنلسٹ علما کا وہ خطرہ تو وہیں رہ گیا لیکن شومئی قسمت سے اسلامی جماعت کا خطرہ اس کے پیچھے ہی رہا۔ اور حیرت بالائے حیرت یہ کہ یہاں پہنچ کر وہ آتش خاموش شعلۂ جوالہ بن کر بھڑک اٹھی، چونکہ جماعت اسلامی کا ہاتھ عوام کے جذبات کی دکھتی ہوئی رگ پر ہے اس لئے اس مسئلہ پر ذرا تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے ہمارے تجزیہ کی رُو سے یہ جماعت دو قسم کے عناصر پر مشتمل ہے ایک عنصر تو وہ ہے جو پہلے دن سے پاکستان کی تحریک کا دشمن ہے آپ ترجمان القرآن اور مودودی صاحب کی دیگر تصانیف کو اٹھا کر دیکھئے آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے مسلم لیگ، قائد اعظم مرحوم اور تحریک پاکستان کے خلاف کس قدر زہر اُگلا ہے اور ان کی یہ روش ایک یا دو دن نہیں رہی بلکہ تحریک پاکستان کی ابتداء سے لے کر تشکیل پاکستان تک یہ مسلسل اور متواتر اپنی انہی مذموم کوششوں میں مصروف رہتے یہ چیز ان کے خلاف نہ کوئی بہتان ہے نہ الزام ان کی تحریریں موجود ہیں جس کا جی چاہے اٹھا کر دیکھ لے وہ لوگ بھی موجود ہیں

پاکستان کی مخالفت

جو محفلوں میں ان کو گفتگو اور چھوٹے موٹے جلسوں میں ان کی تقریریں بھی سنا کرتے تھے وہ تمام اس پر شاہد ہیں کہ تحریکِ پاکستان کے متعلق ان کے خیالات کیا تھے اور اس کی مخالفت میں یہ اعلانیہ کہتے رہے کہ

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں، وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔

پھر یہ بھی کہ

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔

وہ تحریکِ پاکستان کو ہمیشہ غیر اسلامی قرار دیتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ:

> یہ اسکیم دراصل اُن لوگوں کے دماغ کی پیداوار ہے جن کے ذہن کی ساری تربیت مغربی اثرات کے تحت ہوئی ہے اور جنہوں نے تمدن و سیاست کے متعلق تمام تصورات یورپ کی تاریخ اور علومِ عمرانی سے سیکھے ہیں۔

اس تحریک کے قائد کے متعلق وہ اٹھتے بیٹھتے کہا کرتے تھے کہ وہ

> اسلام کی الف بے تک سے ناواقف ہے [1]

پاکستان آکر

یہ عنصر جو تقسیمِ ہند کے آخری لمحہ تک پاکستان کے خلاف اس قسم کی زہر افشانیوں میں مصروف تھا، پاکستان بننے کے

---

[1] ان اقتباسات کیلئے دیکھئے ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۳۹ء، مئی و جون ۱۹۴۰ء، دسمبر ۱۹۴۲ء، جنوری ۱۹۴۲ء

بعد جھٹ سے یہاں آ دھمکا اور اس کے بعد مطالبہ یہ شروع کر دیا کہ پاکستان کی حکومت ہمارے حوالے کر دو۔ ہمارا خیال ہے کہ تاریخ نے انسانی کردار کی ایسی مثال بھی بہت کم پیش کی ہو گی۔ ہمارے نزدیک نیشنلسٹ علماء ان لوگوں سے کہیں بہتر ثابت ہوئے کہ انہوں نے اگر پاکستان کی مخالفت کی تو اس کے بعد وہ آج تک اس کے مخالف چلے آ رہے ہیں لیکن انہیں دیکھئے کہ یہ پاکستان کی مخالفت میں اُن سے بھی پیش پیش تھے لیکن اب اِن کا مطالبہ یہ ہے کہ پاکستانی حکومت کا حق بھی ان کا ہے۔ اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ اگر ایک مٹھی بھر جماعت بھی صحیح معنوں میں مسلمان ہو جائے تو ہندوؤں کی مجال نہیں کہ اپنی حکومت قائم کر سکیں۔ ہندوستان میں اِس وقت بھی تین چار کروڑ مسلمان موجود ہیں اور وہ ہندوؤں کے استبداد سے پس رہے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو اپنے اصول کا ذرا سا بھی پاس ہوتا اور اپنے مقصد کو دیانت پر مبنی سمجھتے تو ان کیلئے کرنے کا کام یہ تھا کہ ہندوستان میں رہ کر وہاں کے تھوڑے سے مسلمانوں کو سچے معنوں میں مسلمان بنا دیتے تاکہ وہاں ہندوؤں کی جگہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جاتی۔ لیکن اب یہ تمام باتیں بھلائی جا چکی ہیں اور اپنی ساری توجہات پاکستان کی حکومت کی کرسیوں کی طرف مبذول کی جا رہی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اس چیز کو چھوڑو کہ انہوں نے اُس وقت کیا کہا اور کیا کیا۔ اب اِن کی یہ کوشش ہے کہ پاکستان کو تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کر دیا جائے یہ کوشش تو بڑی مستحسن ہے۔ اس کے خلاف تو کوئی اعتراض نہیں چاہیئے۔ لیکن ذرا سنئے کہ اس باب میں بھی ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے۔ ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے ترجمان القرآن بابت اگست ۱۹۴۰ء میں لکھا تھا:

ناممکن ہے

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک پاکستان کا اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل ہو جانا ناممکن تھا۔ وہ اسی دلیل کی بنا پر لوگوں کو پاکستان کی تحریک سے برگشتہ کیا کرتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ جو چیز کل تک مودودی صاحب کے نزدیک ناممکن تھی اور ایسی ناممکن جیسا آج معجزہ کا وقوع ناممکن ہے تو آج وہی چیز اس قدر ممکن بلکہ سہل الحصول کس طرح ہو گئی کہ مودودی صاحب اس تحریک کے پیش رو بن رہے ہیں۔ ہمیں مودودی صاحب پر افسوس نہیں کہ وہ کیا کچھ کہا کرتے تھے اور اب کیا کہہ رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے اس قوم پر جس کی سمجھ میں اس قدر کھلی ہوئی بات بھی نہیں آتی کہ ایک شخص کل تک یہ کہہ رہا تھا کہ اخلاقی اصلاح کے ذریعہ پاکستان کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کرنا ناممکن ہے وہی شخص آج لوگوں کو دعوت دے رہا ہے کہ میرے پیچھے چلو میں اخلاقی اصلاح کے ذریعہ پاکستان کو اسلامی اسٹیٹ بنا دوں گا۔

جذبات پرست گروہ

یہ تو ہے اسلامی جماعت کا ایک عُنصُر۔ دوسرا عُنصُر جذبات پرستوں کا ہے جو محض اس نعرے کے ماتحت کہ ہماری حکومت شریعت کے مطابق ہونی چاہیئے، ان کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ وہ مخلص ہیں لیکن سطح سے نیچے جانے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور یہی وہ

لوگ ہیں جن کے جذبات سے یہ پہلا عنصر کھیل رہا ہے۔ سطحی مقبولیت (CHEAP POPULARITY) کی طرح سطحی مذہبیت (RELIGIOSITY) بھی بڑی سہل الحصول اور خوش آیند تدبیر ہوتی ہے اسلامی جماعت کی ٹکنیک یہ ہے کہ وہ سطحی مذہبیت کی راہ سے عوام میں مقبولیت حاصل کرے اور اس طرح ان کے جذبات کی قوتوں کے ذریعے اپنے مقاصد بروئے کار لے آئے۔ ہمیں اپنی قوم کے اس دوسرے طبقے سے دلی ہمدردی ہے اور اس احساس سے ہمیں سخت اذیت پہنچتی ہے کہ ان مخلص مسلمانوں کو کس بُری طرح سے (EXPLOIT) کیا جارہا ہے تاریخ بتاتی ہے کہ جن مفاد پرست افراد نے عوام کے جذبات کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا وہ قوم کیلئے بڑے خطرے کا موجب ثابت ہوئے۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر طلوعِ اسلام اس جماعت کی مخالفت کرتا ہے۔ اگر ملک کے سنجیدہ طبقے کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے تو طلوعِ اسلام کو اس سے خوشی ہے کہ اس سے پاکستان بہت سے نقصانات سے بچ جائے گا اور اگر وہ اس سے متفق نہیں ہیں تو طلوعِ اسلام اس چیز کو علیٰ وجہ البصیرت حق سمجھتا ہے اور وہ اسے دہرائے چلا جائے گا خواہ اس کی کوئی سُنے خواہ نہ سُنے کہ حق کی آواز کے سامعین بعد میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔

آئین کی تدوین تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے اہم مسئلہ آئینِ پاکستان کی تدوین کا ہے بلکہ یوں سمجھیئے کہ اصل مسئلہ ہی یہ ہے پاکستان

کی تشکیل تو اس کا پیش خیمہ تھی چونکہ قوم ابھی غلامی کی نیند سے جاگ کر اٹھی ہے بلکہ یوں کہیئے ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں، نیند کا خمار ابھی اترا ہی نہیں۔ اس لئے وہ اس مسئلہ کی اہمیت کو کماحقہٗ نہیں پہچان سکے۔ قوم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یہ ایک فرضِ کفایہ ہے جسے ان کی طرف سے مجلسِ دستور ساز کے اراکین ادا کر رہے ہیں اور مجلسِ دستور ساز کے اراکین نے یہ سمجھ لیا کہ یہ بات ہی کون سی ہے۔ مختلف ممالک سے کانسٹی ٹیوشن سے متعلق کتابیں آجائیں بس اس کے بعد کانسٹی ٹیوشن تیار ہو جائے گا۔ چنانچہ ان سے جب کبھی کسی نے پوچھا کہ تدوینِ دستورِ پاکستان کس منزل میں ہے تو یہی جواب دیتے رہے کہ ہمارے پاس کتابیں ہی نہیں حالانکہ پاکستان کی جداگانہ مملکت کیلئے دلیل ہی یہ دی جاتی تھی کہ ہم اسے اسلامی نظام کی تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں جو اس وقت دنیا میں کہیں موجود نہیں اور جو دنیا کے ہر آئین سے نرالا اور اعلیٰ اور ارفع ہوگا۔ تین برس تک یہ حضرات اسی تگ و تاز میں مصروف رہے اور اسکے بعد جو کچھ پیش کیا اس کے متعلق ہر ایک کو علم ہے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، قوم میں سے جس طبقہ نے آئین سازی کے متعلق شور اٹھایا، وہ بیشتر اسلامی جماعت والوں ہی کا طبقہ تھا۔ ان کا

مقامِ شریعت

مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان میں شریعت کا نظام ہونا چاہیئے۔ اور شریعت کا نظام وہی لوگ مدوّن کر سکتے ہیں جو شریعت سے واقف ہوں اور شریعت سے واقف اربابِ شریعت ہیں جن کی نمائندگی اسلامی جماعت کرتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہاں تک بھی مطالبہ شروع کر دیا کہ مجلسِ دستور ساز کا انتخاب نئے سرے سے ہونا چاہیئے اور اس میں انہی لوگوں کو آنے دینا چاہیئے جو شریعت سے واقف ہوں۔

ان سے پوچھا گیا کہ شریعت کسے کہتے ہیں اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ شریعت کے مستقل ماخذ دو ہیں: قرآن اور روایات۔ قرآن میں صرف اصول ہیں۔ اس لئے شریعت کی جزئیات کا مستقل ماخذ روایات ہیں۔

کہا گیا کہ کیا روایات کے موجودہ مجموعوں میں سب روایات صحیح ہیں اور مستقل شریعت کی حیثیت رکھتی ہیں؟ جواب ملا کہ نہیں ان میں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔

مزاج شناس

پوچھا گیا کہ صحیح اور غلط کا معیار کیا ہے۔ جواب ملا کہ اس کے لئے کوئی خارجی معیار نہیں۔ جو شخص رسول اللہ کا مزاج شناس ہو، وہ اپنے ذوق کی بنا پر کہہ سکتا ہے کہ کون سی روایت صحیح ہے اور کون سی غلط۔ اگر کہیں کوئی روایت نہ ملے تو وہ از خود بتا سکتا ہے کہ ایسے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فیصلہ دیتے۔ لہٰذا شریعت کا مستقل ماخذ اس شخص کا ذوق ہے۔

یہ ہے اس شریعت کا تصور جسے یہ حضرات اسلامی نظام کے نام سے مسلمانوں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں یہ خالص خدائی اختیارات ہیں جن کا تصور تک بھی کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔ طلوعِ اسلام نے مسلسل تین برس اپنی اس کوشش کو جاری رکھا کہ مسلمانوں کی نگاہوں کے سامنے اس حقیقت کو واضح کر دے کہ اسلامی نظام کے مستقل، غیر متبدل اور ابدی اصول قرآن کریم کے اندر ہیں اور ہر زمانے میں مسلمان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی روشنی میں جزئی قوانین خود مرتب کر سکتے ہیں البتہ ان قوانین کی ترتیب میں اُن قوانین سے بطور نظائر و مؤیدات PRECEDENTS مدد لی جا سکتی ہے جو اس سے پہلے کسی اسلامی حکومت نے مرتب کئے

ہوں انہیں قوانین کا نام شریعت ہوگا اور ان کو نافذ کرنے والے نظام کا نام اسلامی نظام۔ طلوعِ اسلام کی یہ آواز شروع شروع میں بڑی نامانوس سی محسوس ہوتی رہی لیکن اللہ کی توفیق سے اب اس آواز نے ایک خاص فضا پیدا کر دی ہے اور ملک کے دور دراز گوشوں سے اس کی بازگشت صدائیں سنائی دینے لگ گئی ہیں۔ یہ عنوانات بڑے امید افزا اور حوصلہ بخش ہیں۔

(٠)

نبوّتِ جدیدہ

نبوّتِ جدیدہ

(اکتوبر ۱۹۵۲ء)

دین میں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، حجّت صرف سند کو حاصل ہے۔ حجّت کے معنی ہیں ایسی دلیل جس سے آپ انکار نہ کر سکیں۔ اور سند سے مراد ہے قرآن کریم، یعنی جب آپ یہ کہیں کہ فلاں معاملہ میں دین کا حکم یہ ہے تو آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ اس حکم کے لئے آپ کے پاس قرآن کی کون سی سند ہے۔ ایسی کسی سند کے بغیر کسی کا کوئی قول دین میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ قرآن سے نیچے اترے تو بعض لوگوں نے حدیث کو بھی اسی قسم کی سند تصور کر لیا۔ چنانچہ ان لوگوں کا مسلک یہ قرار پایا کہ جب کوئی یہ کہے کہ اسلام میں فلاں معاملہ کے متعلق یہ حکم ہے کہ اس سے قرآن کے بعد یہ بھی پوچھا جائے گا کہ اس کی سند میں تمہارے پاس کون سی حدیث ہے۔؟

سند

اور آگے بڑھے تو بعض لوگوں نے قرآن (یا قرآن و حدیث) کے اصولی احکام سے جزئی احکامات مستنبط کئے اور اس استنباط میں اپنے قیاس سے کام لیا اسے فقہ کہتے ہیں لیکن جب اہل فقہ سے بھی پوچھا جائے تو انہیں بھی یہ بتانا ہوگا کہ انہوں نے

کسی مسئلہ کے متعلق اس حکم کو قرآن کی کس آیت یا کس حدیث پر قیاس کر کے مستنبط کیا ہے یعنی سند سے یہ گروہ بھی بے نیاز نہیں۔

اس سے آگے بڑھے تو بعض لوگوں نے ان فقہا کے فیصلوں کو دین میں سند تسلیم کر لیا جب ان سے پوچھا جائے کہ تم کس طرح کہتے ہو کہ فلاں بات میں اسلام کا فیصلہ یہ ہے تو وہ اپنے قول کی تائید میں کسی نہ کسی امام کا فیصلہ بطور سند کے پیش کریں گے لیکن اس نقطۂ خیال کا بھی اگر تحلیل و تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہ میں بھی یہی عقیدہ کارفرما نظر آئے گا کہ ہمارا امام یا ہمارا مجتہد اپنی طرف سے خود کچھ نہیں کہتا بلکہ جو کچھ کہتا ہے وہ قرآن و حدیث ہی کو سامنے رکھ کر کہتا ہے۔ چنانچہ آپ ہر فقیہ سے یہ مطالبہ بھی کر سکتے ہیں کہ اُن کے امام کے اس فیصلہ کی کیا سند ہے جس پر وہ آپ کو قرآن یا حدیث سے اپنے امام کے اس فیصلہ کی سند پیش کر دے گا چنانچہ فقہ کی کتابیں ان کے ان دلائل سے بھری پڑی ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ دین کے معاملہ میں چودہ سو سال سے آج تک سند ضروری رہی ہے آپ کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے کہ دین میں فلاں چیز (حدیث یا قیاس یا کسی امام کا قول) سند ہو سکتا ہے یا نہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دین میں سند کا ہونا لا ینفک ہے کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے سے یہ کہے کہ دین کا یہ حکم یوں اس لئے ہے کہ میں ایسا کہتا ہوں۔

یہ ہے وہ اصلِ عظیم جس پر دین کی بنیاد قائم ہے۔ یعنی کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا قول بطور دینی حکم کے منوائے اور ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہر دوسرے شخص سے یہ پوچھ لے کہ جس بات کو تم دین کا حکم کہتے ہو اس کی سند تمہارے پاس کیا ہے؟

حتیٰ کہ ایک نبی اور رسول کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی سے یوں کہہ سکے کہ دین کا یہ حکم یوں اس لئے ہے کہ میں ایسا کہتا ہوں۔ اُس کو بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ دین کا یہ حکم اس لئے ہے کہ خدا کا ایسا ہی حکم ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۸)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے (انسان کی ہدایت کے لئے) کتاب اور حکومت اور نبوّت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرو) بلکہ چاہیے کہ ربّانی انسان بنو۔ اس لئے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہو اور اس لئے کہ اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

آپ نے دیکھ لیا کہ دین کے ہر حکم کے لئے رسول کو بھی خدا کی طرف اپنی سند بیان کرنی پڑتی ہے یعنی اُسے بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ چونکہ خدا کا یہ حکم ہے اس لئے میں ایسا کہہ رہا ہوں۔

مقامِ نبوّت

البتہ نبی کا صرف ایک دعویٰ ایسا ہوتا ہے جہاں سند یا دلیل طلب نہیں کی جا سکتی اور یہ اُس کا دعوائے نبوّت ہوتا ہے اس کا یہ دعوےٰ کہ خدا نے اسے ایک ایسی چیز عطا کی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔ اس دعوے کے لئے دراصل رسول کا اپنا دعویٰ ہی سند ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں رسول پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جب رسول یہ کہے کہ خدا نے مجھے یہ حکم دیا ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ خدا نے واقعی یہ حکم دیا ہے یعنی رسول کا وہ حکم اسے

خدا کی طرف بذریعہ وحی ملا ہے۔

بہرحال، دین میں ایک مقامِ نبوت ہی ایسا مقام ہے جہاں سند کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا مگر یہ نکتہ یاد رہے کہ سند کا یہ مطالبہ صرف اس امر میں نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حکم اس کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملا ہے اور بس۔

یہاں سے آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ اگر کوئی شخص آج اس قسم کا اِدّعا کرتا ہے کہ اس کا حکم دین میں اس لئے واجب التعمیل ہے کہ وہ ایسا کہتا ہے تو در اصل وہ اپنے لئے مقامِ نبوت کا دعویدار ہے بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر، کیونکہ اس اِدّعا کا حق تو ایک نبی کو بھی حاصل نہیں ہے بلکہ اسے بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ چونکہ خدا نے ایسا حکم دیا ہے اس لئے میں ایسا کہتا ہوں۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ بابِ نبوت بند ہو گیا اس لئے اب رسول اللہ کے بعد کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں رہا کہ وہ بلا سند کوئی بات دین کی حیثیت سے کسی سے منوا سکے۔ یہ ایک ایسی حقیقتِ کبریٰ ہے جس میں آج تک کسی کو اختلاف کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ البتہ صوفیا میں سے بعض حضرات نے ضرور یہ کہا ہے کہ مجھے فلاں فلاں بات کشف یا الہام کے ذریعے سے معلوم ہوئی ہے اور کشف یا الہام ایک ایسی چیز ہے جس کی تائید میں کوئی سند یا دلیل پیش نہیں کی جا سکتی مگر کشف و الہام کو دین میں کسی نے بھی حجت قرار نہیں دیا حتیٰ کہ خود صاحبِ کشف اپنے کشف کو خود اپنے لئے بھی دینی حجت نہیں مانتا۔

کشف و الہام

بہرحال، تیرہ سو برس سے اُمت میں یہ مسلک متفقہ طور پر چلا آیا تھا یعنی یہ مسلّمہ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دین کے معاملہ میں اپنی بات کو بغیر سند کے منوا سکے یعنی

وہ یہ کہے کہ جس بات کو میں صحیح کہدوں وہ صحیح ہے اور جس بات کو میں غلط کہوں وہ غلط ہے۔

میرزا غلام احمد کا دعویٰ

تیرہ سو سال کے بعد اس مسئلہ کو میرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے توڑا کس طرح توڑا، یہ داستان بڑی دلچسپ ہے میرزا غلام احمد صاحب نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں قرآن اور حدیث کو نہیں مانتا وہ اپنے ہر دعوے کیلئے کتاب وسنّت اور قرآن وحدیث کے الفاظ دہراتے رہتے تھے ان کی تمام تصانیف ان الفاظ سے بھری پڑی ہیں لیکن انہوں نے ایک ایسا چور دروازہ کھول لیا جس کی رُو سے قرآن وحدیث سند بننے کے بجائے خود میرزا صاحب کے فیصلوں کے تابع ہو جائے۔ اس کے لئے صغریٰ اور کبریٰ کی ضرورت تھی صغریٰ تو ملّا کے مذہب نے گھڑا گھڑایا پہلے سے تیار رکھ چھوڑا تھا یعنی وحی کی دو قسمیں ہیں، ایک متلو اور دوسرے غیر متلو دونوں ہم پایہ ہیں اور دین میں دونوں کی حیثیت ایک ہے لیکن چونکہ وحیٔ غیر متلو (حدیث) قرآن کی تشریح کرتی ہے، اس لئے اگر ان دونوں میں کہیں اختلاف نظر آئے تو حدیث کو راجح تسلیم کرنا ہوگا اور ماننا پڑے گا کہ قرآن کا حکم منسوخ ہے اس طرح قرآن کو ایک طرف بالائے طاق رکھا جا چکا تھا اور دین کی اصلی سند حدیث قرار پا گئی تھی۔ اس کے بعد میرزا صاحب کو صرف کبریٰ اپنی طرف سے لگانا تھا۔ اس کبریٰ کے بھی دو جزو تھے پہلا جزو یہ تھا حدیثیں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ کبریٰ کے اس جزو میں بھی ملّا کا مذہب کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا تھا کیونکہ اس کے ہاں خود اس موضوع پر بے شمار ذخیرہ کتابوں میں مدّون موجود تھا۔ فرقِ مختلفہ اور پھر مذاہبِ اربعہ کے اختلاف نے احادیث کی تصحیح و تغلیط کا پہلے ہی بازار گرم کر رکھا تھا۔ سُنّیوں کے نزدیک شیعوں کی حدیثیں غلط اور موضوع تھیں اور شیعوں کے نزدیک سُنّیوں کی۔ یہی حال جبریہ، قدریہ، معتزلہ، جہمیہ فرقوں کے

ساتھ تھا۔ پھر سُنیّوں میں بھی ایک حدیث حنفیوں کے ہاں صحیح تھی تو شافعیوں کے ہاں غلط تھی۔ دوسری حدیث مالکیوں کے ہاں صحیح تھی تو حنبلیوں کے ہاں ضعیف اور موضوع تھی اس لئے ملّا کا مذہب گیارہ سو سال سے جس اکھاڑے کو جماتے چلا آرہا تھا آج اس سے انکار کیسے کرسکتا تھا۔ مرزا صاحب کو کڑی کا صرف ایک آخری جزو وضع کرنا پڑا یعنی جب یہ سوال پیدا ہوا کہ صحیح حدیثیں کون سی ہیں اور غلط کون سی تو انہوں نے کہدیا کہ جس حدیث کو میں صحیح کہوں وُہ صحیح ہے اور وہی دین میں سند ہے اور جسے میں غلط کہوں وُہ غلط ہے۔

سند میں ہوں آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن و حدیث پر کس طرح بجر بٹو گھمایا گیا ہے اور اپنے فیصلوں کو دین کی سند بنادیا گیا ہے جس کیلئے کسی دوسری سند کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی کا نام درحقیقت نبوّت تھا مگر احتیاطاً اسے ظلّی نبوّت سے تعبیر کیا گیا اس فرق کے ساتھ کہ اصل کی حیثیت محض سایہ کی رہ جائے اور سایہ ہی اصل قرار پاجائے۔ احادیث کا ذخیرہ ایک بے پناہ جنگل تھا جس میں سے ہر مسلک کے لئے چسپاں ہوجانے والی روایات چھانٹی جاسکتی تھیں۔ چنانچہ مرزا صاحب نے ان ہی احادیث کی مدد سے اپنی ظلّی اور بروزی نبوت کے اور کہیں مسیحیتِ موعود اور کہیں مجددیت و مہدویت کے مختلف دعوے کئے اور ملّا ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا وہ چلّایا بھی تو صرف یہ کہہ کر کہ مرزا صاحب کی پیش کردہ حدیثیں موضوع ہیں ضعیف ہیں، غلط ہیں۔ ان کے مقابلہ میں دوسری صحیح حدیثیں موجود ہیں جن سے ان تمام باتوں کی تردید ہوتی ہے۔ مگر مرزا صاحب نے کمال حقارت کے ساتھ للکار کر اس کا منہ بند کردیا کہ :۔

جو شخص حَکَم ہو کر آیا ہے اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے خدا سے علم پاکر قبول کرلے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم

پا کر رد کر دے۔ (تحفۂ گولڑویہ صـ ۱)

یعنی حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کی سند خود میرزا صاحب کا وہ علم ہے جو انہوں نے خدا کی طرف سے پایا، لہٰذا ذخیرۂ احادیث میں سے جو بقول قادیانیت:

حدیثوں کی کتابوں کی مثال تو مداری کی پٹاری کی ہے جس طرح مداری جو چاہتا ہے اس میں سے نکال لیتا ہے اسی طرح ان سے جو چاہو نکال لو۔

(الفضل قادیان بابت ۱۵ جولائی ۱۹۲۴ء)

میرزا صاحب نے جو چاہا نکال لیا اور صحیح قرار دے دیا۔ کون تھا جو ان کی زبان پکڑ سکتا تھا حدیث کے پردہ میں میرزا صاحب نے اپنا سکّہ چلا دیا۔ اور مجددیت، مہدویت اور ظلی اور بروزی نبوّت منواتے چلے گئے۔ یہ تھیں وہ سیڑھیاں جن سے میرزا صاحب نبوّت کے بامِ بلند تک پہنچ گئے۔

میرزا صاحب کے بعد مودودی صاحب

آج بعینہٖ انہی سیڑھیوں سے سیّد ابوالاعلیٰ صاحب مودودی بھی مشقِ نبوّت فرما رہے ہیں۔ مودودی نے بھی پہلے یہی کہا کہ وحی دو قسم کی ہے ایک کا مجموعہ قرآن ہے اور دوسری کا مجموعہ حدیث پھر یہ کہا کہ حدیثیں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی، اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ صحیح حدیثیں وہ ہیں جنہیں مزاج شناسِ نبوّت صحیح کہہ دے اور غلط وہ جنہیں وہ غلط ٹھہرا دے۔ اس طرح کتاب وسنّت اور قرآن وحدیث کی رٹ لگاتے ہوئے وہ اُسی مقام تک پہنچ چکے ہیں جہاں قرآن اور حدیث خود ان کے فیصلوں کے تابع ہو جاتے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں:-

جس شخص کو اللہ تعالیٰ تَفَقُّہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے کہ جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بحیثیت مجموعی شریعتِ حقّہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتی ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کون سی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کون سی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی

مزاج شناسِ رسولؐ

ردّ و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین نبوّت کا مزاج ہے جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ نبیٔ اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت بتا دیتی ہے کہ ان میں کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنّتِ نبویہ سے اقرب ہے یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنّت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ

ف مرزا صاحب کا دعویٰ بھی یہی تھا کہ میں نے رسول اللہ کی ایسی اطاعت کی ہے کہ اس سے میرے اندر ایسا علم پیدا ہو گیا ہے کہ جس کی بنا پر میں اسناد سے بے نیاز ہو کر خود معیار بن گیا ہوں اور اسی کو ملکۂ نبوّت کہتے ہیں۔

وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح، روحِ محمدی میں گم اور اس کی بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلہ کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔

(تفہیمات حصہ اول صفحہ ۳۲۳، ۳۲۴)

آپ میرزا صاحب کے مذکورہ بالا اقتباس اور مودودی صاحب کی ان تصریحات کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھئے اور سوچئے کہ مودودی صاحب کا یہ مسلک کسی طرح بھی میرزا صاحب کے اس مسلک سے مختلف ہے؟ "مزاج شناسیٔ نبوّت" اور "بصیرتِ نبوی" ایسی چیزیں ہیں جن پر کوئی دلیل یا سند نہ پیش کی جا سکتی ہے نہ مانگی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے کسی ایک کا اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ میری مزاج شناسیٔ نبوّت یا بصیرتِ نبوی کا یہی فیصلہ ہے۔ اور اس کا یہ فیصلہ "بیک جنبشِ ابرو دین" بن سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جو صرف ایک نبی ہی کو حاصل ہو سکتا ہے کہ وہی اپنی بات کو بحیثیت دین کے بغیر کسی سند و دلیل کے منوا سکتا ہے۔

---

[1] میرزا صاحب نے اسی کا نام ظلی اور بروزی نبوّت رکھا ہے۔ ۱۲

مقامِ نبوّت

چودہ سو سال سے اُمّت میں آج تک کسی کو یہ مقام حاصل نہیں ہوا۔ اُمّت میں بڑے بڑے اولوالعزم خلیفہ، بادشاہ، امام، فقیہ، اولیاءاللہ ہو چکے ہیں مگر مرزا صاحب اور مودودی صاحب سے پہلے کسی نے اپنے لئے یہ پوزیشن حاصل کرنے کی جرأت نہیں کی۔ ان دونوں میں فرق اتنا ہی ہے کہ اوّل الذکر اپنی اس پوزیشن کو ظلّی اور بروزی نبوّت سے تعبیر کرتا ہے اور ثانی الذکر مزاج شناسیٔ نبوّت "یا" بصیرتِ نبوی" بلکہ اپنی روح کو روحِ محمدی میں گم ہو جانے اور اپنی نظر کو بصیرتِ نبوی کے ساتھ متّحد ہو جانے سے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ محض تعبیرات کا فرق ہے۔ اس تعبیری فرق سے حقیقت نہیں بدلی جا سکتی۔ اس تفصیل کے بعد ہم ناظرین سے پوچھتے ہیں کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ ان دونوں مدّعیوں میں کیا فرق ہے۔ کیا دونوں کا مطمحِ نظر اور منزلِ مقصود ایک ہی نہیں ہے؟

طلوعِ اسلام بار بار متنبّہ کرتا رہا اور اب پھر ملّت کو متنبّہ کرتا ہے کہ خدا کے لئے ان چور دروازوں کو بند کرو۔ دین کی بنیاد صحیح قرآن اور فقط قرآن ہے جو ابدالآباد تک کیلئے واجب العمل ہے۔ روایات اس عہدِ مبارک کی تاریخ ہیں کہ رسول اللہ صلعم والذین معہٗ نے اپنے عہد میں قرآنی اصول کو کس طرح متشکّل فرمایا تھا۔ یہ اس عہدِ مبارک کی شریعت ہے۔ قرآنی اصول کی روشنی میں کسی فردِ واحد کو جزئیات مستنبط کر کے اپنے عہد کے لئے شریعت بنا دینے کا حق نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی اتباعِ محمدی (بقول مرزا) یا کتنا ہی مزاج شناسیٔ رسول (بقول مودودی) کا دعویدار کیوں نہ ہو۔ بلکہ یہ حق

صحیح مسلک

صرف قرآنی خطوط پر قائم شدہ مرکزِ ملّت اور اسکی مجلسِ شوریٰ کا ہے کہ وہ قرآنی اصول کی روشنی میں صرف اُن جزئیات کو مرتّب و مدوّن کر سکے جن کی قرآن نے کوئی تصریح نہیں کی پھر یہ جزئیات ہر زمانے میں ضرورت پڑنے پر تبدیل کی جا سکتی ہیں۔ یہی اپنے زمانہ کے لئے

شریعت ہیں۔

یہ نیا فتنہ مرزا صاحب کی نبوّت نے جو فتنہ برپا کیا تھا اس وقت اُس کے خلاف ملت کی طرف سے بڑی سختی کے ساتھ صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہے لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ جتنے عرصہ میں وہ اس پرانی نبوّت کے فتنہ کا استیصال کریں گے، اُس وقت تک پنجاب کی یہ نئی نبوّت اپنے شباب کو پہنچ چکی ہوگی۔ مسلمانوں نے نہ اس پرانی نبوّت کے خلاف بروقت آواز اُٹھائی اور نہ وہ اب اس نئی نبوّت کا کچھ احساس کر رہے ہیں۔ پرانی نبوّت کا مدعی بھی شروع میں شریعتِ محمدی کے احیاء کا مدعی تھا اور مسلمان اسی دھوکا میں اسکے اصلی عندیہ سے بے خبر رہے یہ نئی نبوّت بھی نظامِ شریعت کے قیام کی آڑ میں مضبوط ہوتی چلی جارہی ہے اور ملّت کو اس کا اس وقت احساس ہوگا جب یہ پوری طرح اپنی جڑیں پکڑ چکے گی۔ یہ نبوت اس پہلی نبوّت سے بھی زیادہ خطرناک ہوگی اُس لئے کہ اُس نبوّت نے اپنی نشر و اشاعت محض نجی طور پر کی تھی، لیکن نبوّتِ جدیدہ حکومت کا اقتدار حاصل کرنے کی فکر میں ہے سوچئے کہ اگر زمامِ اقتدار ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں آجائے جو یہ کہے کہ صحیح وہ ہے جسے میری نگاہ صحیح کہدے اور غلط وہ جسے میں غلط قرار دے دوں تو کیا اس کے بعد یہاں قرآن اور حدیث کی کوئی حقیقت بھی باقی رہ جائے گی؟

چھوڑ دیئے طلوعِ اسلام کو کہ وہ تو ان لوگوں کے نزدیک منکرِ حدیث ہے مگر ہم پوچھتے ہیں حامیانِ حدیث سے کہ کیا اس نظریہ کے بعد ان کی حدیث کی بھی کوئی حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ طلوعِ اسلام تو اتنا ہی کہتا ہے کہ صحیح اور غلط کا معیار قرآن ہے صحیح وہ ہے جسے قرآن صحیح کہدے اور غلط وہ جو اس کے ہاں سے غلط قرار پا جائے۔ اسے تو آپ منکرِ حدیث کہتے ہیں لیکن اس کے برعکس ایک شخص یہ کہتا ہے کہ تمہارے اپنے معیاروں کے مطابق صحیح

قرار دیئے ہوئے احادیث کے مجموعے صحیح نہیں قرار دیئے جا سکتے تا جب تک ان کی صحت کے متعلق میری بارگاہ سے فتویٰ نہ صادر ہو جائے اِن ذخیروں میں سے جس کو میں صحیح کہہ دوں، وہ صحیح ہے اور جسے میں غلط قرار دیدوں وہ غلط ہے تو اس شخص کو آپ سب سے بڑا حامیٔ حدیث اور مُحیِ السُّنّت قرار دے رہے ہیں۔

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بما نامِ فسق!

لہٰذا ختمِ نبوّت کے محافظین اور حامیانِ حدیث دونوں کیلئے سوچنے کا مقام ہے کہ یہ نیا فتنہ انہیں کہاں تک پہنچائے گا نیز وہ لوگ جو پاکستان میں نظامِ شریعت کے قیام کے متمنّی ہیں سوچیں کہ نظامِ شریعت کے قیام کی آڑ میں یہاں کس قسم کی مستبد ڈکٹیٹرشپ کی تیاریاں ہو رہی ہیں — وہ ڈکٹیٹرشپ جس میں ڈکٹیٹر کا فیصلہ ایک انسانی حکم نہیں ہوگا بلکہ خدا اور رسول کا حکم قرار دیا جائے گا اور جس سے سرتابی دنیا میں پھانسی کے تختے اور آخرت میں نارِ جہنم کی مستوجب ہو گی!

مزاج شناس کا تعیّن

(دسمبر ۱۹۵۲ء)

طلوعِ اسلام برسوں سے اس حقیقت کو بے نقاب کر رہا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے پیشِ نظر ایک ایسی ڈکٹیٹر شپ کا قیام ہے جس کے احکام سے کسی کو مجالِ سرتابی نہ ہو۔ اس ڈکٹیٹر شپ کا صغریٰ وکبریٰ یوں قائم کیا جاتا ہے۔

(۱) حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔

(۲) خدا کی حکومت سے مراد "کتاب وسنت" کی اطاعت ہے۔

(۳) کتاب کی تفسیر سنتِ رسول ہے۔ لہٰذا کتاب کی اطاعت سے مراد سنتِ رسول اللہ کی اطاعت ہے۔

(۴) سنتِ رسول اللہ احادیث کے مجموعوں کے اندر ہے۔

(۵) لیکن احادیث کے مجموعوں میں صحیح اور غلط ہر قسم کی حدیثیں موجود ہیں۔

(۶) اس امر کا فیصلہ کہ کون سی حدیث صحیح ہے اور کون سی غلط صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو "مزاج شناسِ رسول" ہو حتیٰ کہ جن مسائل میں قرآن وسنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی کے سامنے فلاں مسئلہ پیش ہوتا تو آپ اس کا فیصلہ

یوں فرماتے۔ (تفہیمات از مودودی صاحب صد ۳۲۴، ۳۲۳)

خود مودودی صاحب

طلوعِ اسلام یہ کہتا تھا کہ جماعتِ اسلامی کے نزدیک یہ "مزاج شناس" ان کے امیر ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہیں۔

اس پر بعض لوگ اعتراض کرتے تھے کہ یہ محض سُوءِ ظن ہے۔ مودودی صاحب محض ایک نظریہ بیان کر رہے ہیں لیکن اب اس کی تصدیق ہو گئی کہ طلوعِ اسلام کا خیال حقیقت پر مبنی تھا۔ چنانچہ مودودی صاحب کے دستِ راست امین احسن اصلاحی صاحب نے تحقیقاتی عدالت میں بیان دیتے ہوئے بتایا کہ وہ مودودی صاحب کو "مزاج شناسِ رسول" سمجھتے ہیں۔

ہمیں اس سے غرض نہیں کہ لوگ اپنی مفاد پرستیوں کے لئے کیا کچھ کرتے ہیں۔ جب مذہب پیشہ بن جائے تو اس میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے لیکن ہمیں دکھ اس احساس سے ہوتا ہے کہ ـــ بازی بازی باریش بابا ہم بازی ـــ مسلمان جب مفاد پرستی پر اترتا ہے تو اس کے ہاتھوں نہ خدا بچتا ہے اور نہ اس کا رسول! ہمارے بادشاہوں نے جب اپنی ملوکیت کے شکنجوں

مفاد پرستیاں

کو مضبوط کرنا چاہا تو اپنے آپ کو ظل اللہ قرار دے لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس قسم کے یہ خود تھے اسی قسم کے خدا کا تصوّر مسلمانوں میں رائج ہو گیا یعنی ایک شخصی مطلق العنان مستبد حاکم کا تصور جسے نہ قانون سے کچھ تعلق ہے، نہ قاعدے سے واسطہ۔ جسے چاہتا ہے باندھ لیتا ہے جسے چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے (قس علیٰ ہذا)۔

اس کے بعد ہمارے دور میں ایک شخص نے نبوّت کا دعویٰ کیا تو اپنے آپ کو ذاتِ رسالتمآب کا ظل اور بروز بنا کر پیش کر دیا اور قطعاً نہ سوچا کہ اس کی اس جسارت سے حضور رسالتمآب کی (معاذاللہ) کس قدر توہین ہوتی ہے۔ حضورؐ کی ذاتِ گرامی شرفِ انسانیت کے اُس مقامِ بلند پر ہے جہاں انسان کا تصوّر بھی نہیں جاسکتا لیکن اس دعوے کے بعد دنیا نے اسی ظِل "پر اصل" کا قیاس کرنا

شروع کر دیا اور یوں حضورِ نبی مرتبت کو اس پست سطح پر لا کر کھڑا کر دیا جس کے خیال سے ہی جُھر جُھری آجاتی ہے۔

اور اب یہ صاحب اٹھے ہیں تو اس دعوے کے ساتھ کہ میں "مزاج شناسِ رسول" ہوں اگر کوئی ایسی بات سامنے آجائے جس میں قرآن و سنت سے کوئی چیز نہ ملتی ہو تو میرے پاس آجاؤ۔ جو کچھ میں کہوں اس کے متعلق یہ سمجھ لو کہ اگر رسول اللہ اس وقت موجود ہوتے تو وہ وہی کہتے۔

استغفر اللہ! معاذ اللہ! کتنی بڑی ہے یہ گستاخی اور کس قدر شرمناک ہے یہ بے باکی۔! گستاخی اور بے باکی! اُس ذاتِ اقدس و اعظم کے خلاف جس کے مرتبہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

(۲)

باب چہارم

مودودی صاحب اور قرآن

مودودی صاحب کی قرآن فہمی

(روزے کے احکام)

(اکتوبر ۱۹۵۳ء)

بعض لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ ملّا کو قرآن سے اس قدر ضد کیوں ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ قرآن ملّا کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ وہ جب بھی قرآن کے قریب جاتا ہے اس میں اس قدر الجھاؤ، جھول، تناقص اور اشکال نظر آتے ہیں کہ وہ اسی میں عافیت سمجھتا ہے کہ خود بھی اس پرانی ڈگر پر چلا جائے اور لوگوں کو بھی اسی پر چلنے کی تلقین کرتا رہے۔ یہ بات نہیں کہ قرآن کوئی ایسی مشکل کتاب ہے جس کے سمجھنے میں اس قدر دشواریاں لاحق ہوتی ہیں۔ قرآن تو خود روشنی ہے لیکن جس طرح روشنی سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے، اسی طرح قرآن کی روشنی سے بھی وہی شخص راہنمائی حاصل کر سکتا ہے جو قرآن کے سمجھنے میں عقل اور فکر سے کام لے۔

ملّا اور قرآن

ملّا کے نزدیک مذہب کو عقل سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ جو ہوتا چلا آیا ہے اُس پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہنا صحیح راہِ نجات ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ملّا اور عقل

دو متضاد چیزیں بن کر رہ گئیں ہیں۔ اس لئے جب ملا اپنی آنکھوں پر تقلید کی پٹی باندھ کر قرآن کی طرف بڑھتا ہے تو اسے وہاں سے (قرآن کی مثال کی رُو سے) اُسی طرح آتشیں کوڑے پڑتے ہیں جس طرح آسمانی خبریں لانے کے مدعی کاہنوں کو پڑا کرتے تھے۔ اس سے پہلے مُلا کو ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی کہ وہ قرآن کی طرف رخ کرے لیکن چونکہ اس دور میں قرآن کا چرچا عام ہو رہا ہے، اس لئے ملا کو بھی مجبوراً قرآن کے حوالے دینے پڑتے ہیں لیکن اس معاملہ میں وہ کس قسم کی قلابازیاں کھاتا ہے، اس کا کچھ اندازہ کرنا ہو تو آپ امیرِ جماعتِ اسلامی سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا وہ مضمون پڑھیے جو ایک "نیا فتنہ" کے عنوان سے اپریل و مئی ۱۹۵۲ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون مابعد الطبیعاتی موضوع سے متعلق نہیں جس میں مودودی صاحب کے فہم کو دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا۔ موضوع تھا "روزے کے احکام" جو قرآن نے ایسے واضح اور سہل انداز میں بیان کئے ہیں کہ ان میں کسی الجھاؤ یا پریشانی کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، جب انسان کی آنکھوں پر تقلید کی پٹی بندھی ہو تو قرآن کی روشنی اسے کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

روزے کے احکام

یہ مضمون کسی صاحب کے غلط استدلال کے جواب میں ہے۔ اس لئے مودودی صاحب نے تمہیداً یہ لکھا ہے کہ روزوں کے بارے میں قرآن سے جو غلط استدلال انہوں نے کیا ہے، اس کی غلطی واضح کرنے کیلئے سب سے پہلے ہم خود قرآن کی شہادت پیش کرتے ہیں زیرِ بحث آیات کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! لکھ دیئے گئے تم پر روزے، جس طرح لکھے گئے تھے تم سے پہلے کے لوگوں پر، تاکہ تم پرہیزگاری کرو۔ روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا۔ پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا کرنا چاہیئے شمار دوسرے دنوں

سے اور جو لوگ اس کی (یعنی روزے کی) طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا۔ پھر جو کوئی رضا کارانہ بجا لائے نیکی تو وہ بہتر ہے اُس کے لئے اور یہ کہ تم روزہ رکھو یہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم علم رکھتے ہو۔ ماہِ رمضان وہ ہے جس میں نازل کیا گیا قرآن، رہنما بنا کر انسانوں کے لئے اور روشن آیات لئے ہوئے ہدایات اور تفریق حق و باطل کی۔ پس جو پالے تم میں سے اس مہینے کو تو چاہیئے کہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہیئے شمار دوسرے دنوں سے۔

آیاتِ قرآنی کا مندرجہ صدر ترجمہ دینے کے بعد مودودی صاحب جو تنقید فرماتے ہیں وہ

مودودی صاحب کی تنقید

غور سے دیکھنے کے قابل ہے اس لئے ہم اقتباسات کی بجائے ان کی پوری کی پوری عبارت نقل کر دینا ضروری سمجھتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

اس عبارت کو جو خالی الذہن ہو کر پڑھے گا، اس کے دل میں لازماً پہلا سوال یہ پیدا ہو گا کہ اگر یہ پوری عبارت ایک ہی سلسلۂ تقریر کی ہے جو بیک وقت ارشاد ہوئی تھی، تو اس میں پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا گیا کہ ماہِ رمضان میں تم کو یہ نعمت دی گئی تھی اس لئے تم میں سے جو اس کو پالے اُسے چاہیئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ آخر یہ کیا اندازِ بیان ہے کہ پہلے کہا کہ "روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا"۔ پھر تین چار فقروں میں روزے کے متعلق بعض احکام بیان کئے۔ پھر بتایا کہ وہ گنے چنے دن رمضان کے ہیں۔ اور رمضان کو اس کام کے لئے اس وجہ سے منتخب کیا گیا ہے اور اس پورے مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ اس مربوط سلسلۂ تقریر میں شاید ایک اناڑی بھی اپنی بات یوں ادا نہ کرتا بلکہ یوں کہتا کہ اگلی قوموں کی طرح تم پر بھی روزے فرض کئے گئے ہیں۔ اور

چونکہ رمضان کے مہینے میں تم کو قرآن کی نعمت دی گئی ہے اس لئے یہ فرض روزے تم اس مہینے میں رکھو۔ اس کے بعد اس کو جو کچھ احکام بیان کرنے ہوتے وہ بیان کر دیتا۔

دوسرا سوال ایک خالی الذہن ناظر کے دل میں یہ پیدا ہو گا کہ اس سلسلہ عبارت میں جب پہلے یہ فقرہ آچکا تھا کہ جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہیئے شمار دوسرے دنوں سے، تو اسی فقرے کو بعد میں پھر دہرانے کی کیا حاجت تھی۔ اور اگر فی الواقع اس کا دہرانا ضروری تھا تو پھر یہ فقرہ بھی کیوں نہ دہرایا گیا کہ جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں اُن پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا؟ حقیقت میں ضرورت تو دونوں میں سے ایک کو بھی دہرانے کی نہ تھی لیکن ایک کو دہرانا اور دوسرے کو نہ دہرانا تو ایک مُعمّا سا محسوس ہوتا ہے۔

تیسرا سوال جو اس کے دل میں کھٹکے گا وہ یہ ہے کہ "ماہِ رمضان وہ ہے" سے پہلے کی عبارت اور اس کے بعد کی عبارت کا مضمون ایک دوسرے سے صریحاً متناقض نظر آتا ہے۔ پہلا مضمون صاف طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ جو شخص طاقت رکھنے کے باوجود روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دے دے لیکن اگر وہ روزہ ہی رکھے تو یہ اسی کے حق میں اچھا ہے۔ اس کے بالکل برعکس دوسرا مضمون یہ ظاہر کر رہا ہے کہ جو شخص ماہِ رمضان کو پائے وہ اس میں ضرور روزہ رکھے اور اس لازمی حکم کو یہ بات مزید تقویت پہنچا رہی ہے کہ اس حکم کے بعد اس رعایت کا تو پھر اعادہ کر دیا گیا ہے جو پہلے مضمون میں مریض اور مسافر کو دی گئی تھی مگر اس رعایت کو ساقط کر دیا گیا ہے جو اوپر روزے کی طاقت رکھنے والے کو دی گئی تھی۔ ایک معمولی عقل و خرد رکھنے والے قانون ساز سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک ہی معاملہ میں وہ بیک وقت دو مختلف احکام دے گا پھر بھلا یہ فعل

اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان کیسے ہو سکتا ہے پہلے دو سوالات تو صرف سوالات ہی ہیں لیکن یہ آخری سوال تو ایک سخت اعتراض ہے جو اس عبارت پر وارد ہوتا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص حدیث سے مدد لئے بغیر اسے کیسے رفع کر سکتا ہے جو لوگ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کو سمجھنے کے مدعی ہیں اور حدیث کو احکامِ دین کا ماخذ اور قرآن کی مستند شرح ماننے سے انکار کرتے ہیں ان سے پوچھئے کہ ان کے پاس ان سوالات اور اس اعتراض کا کیا جواب ہے!

مندرجہ بالا تنقید میں جناب مودودی صاحب (اور تو اور) خود اللہ تعالیٰ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ جس ترتیب سے اللہ نے یہ احکام دیئے ہیں (معاذ اللہ) شاید ایک اناڑی بھی اپنی بات یوں ادا نہ کرتا۔" اس کے علاوہ انہیں ان آیات میں صریحاً تناقص نظر آتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ بہ کمالِ شانِ امارت فرماتے ہیں "۔ ایک معمولی عقل و خرد رکھنے والے قانون ساز سے بھی یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ ایک ہی معاملہ میں وہ بیک وقت دو مختلف احکام دے"۔

آخر میں ان کی تنقید کی تان یہاں آکر ٹوٹی کہ — قرآن پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ صرف حدیث سے رفع ہو سکتے ہیں بالفاظِ دیگر مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ قرآن جس شکل میں آج ہمارے پاس موجود ہے" وہ اس قسم کا ہے کہ اگر اسے خارجی سہارے نہ دیئے جائیں تو وہ (معاذ اللہ) اناڑیوں کی سی باتیں کرتا ہے" متضاد اور متناقص احکام صادر کرتا ہے اور اس قسم کا قانون دیتا ہے جس کی توقع ایک معمولی عقل و خرد رکھنے والے انسان سے بھی نہیں ہو سکتی۔ قرآن کے ان تمام عیوب و اسقام کو رفع کرنے کے لئے ہمیں اور گوشوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور وہ گوشے ہیں ، روایات کے مجموعے[1]۔

---

[1] فٹ نوٹ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیے۔

قرآن پر اعتراض

قبل اس کے کہ ہم قرآن کی زیرِ نظر آیات کو (مودودی صاحب کے الفاظ میں نہیں بلکہ) خود قرآن کے الفاظ میں پیش کر کے یہ بتائیں کہ وہ احکام کس قدر صاف اور واضح ہیں، ہم قارئین کی توجہ اس اہم حقیقت کی طرف مرکوز کرنا چاہتے ہیں کہ وہ دیکھیں کہ مودودی صاحب کے نزدیک خالص قرآن کی پوزیشن کیا ہے۔ کیا قرآن کے متعلق اسلام کے بدترین دشمن ——— مسیحی مشنریوں اور آریہ سماجی پنڈتوں نے اس سے کچھ مختلف کہا ہے جو مودودی صاحب ارشاد فرما رہے ہیں۔ بہرحال مودودی صاحب نے فرمایا یہ ہے کہ قرآن کے اس تناقص و تعارض کا

لہ خدا بھلا کرے محدثین کا جنہوں نے روایات کے مجموعے جمع کر کے (معاذ اللہ) خدا کی بگڑی ہوئی بات کو بنا دیا اور اس کے ان تمام نقائص کو دور کرنے کا سامان فراہم کر دیا، ورنہ رسول اللہ نے تو لا تکتبوا عنی غیر القرآن (مجھ سے قرآن کے سوا اور کوئی بات قلمبند نہ کرو) کا عاقبت نااندیشانہ حکم صادر فرما کر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کتاب اللہ کا بیڑا ہی غرق کر دیا تھا۔ آپ مودودی صاحب کا شکریہ ادا کیجئے کہ انہوں نے ایک انوکھی تحقیق سے اُمتِ اسلامیہ کو نوازا ہے یہ اور بات ہے کہ بمصداق "دروغ گو را حافظہ نباشد" ترجمان القرآن کے اسی پرچے میں صرف بارہ صفحے کے بعد ص۱۰۶ پر مودودی صاحب اس غلط تحقیق انیق کی یوں تردید فرما دیتے ہیں "کسی مفصل بحث کے بجائے آپکی تشفی کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن مجید اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے۔ اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کی ہدایت کے لئے ضروری تھا واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے" اب مودودی صاحب سے پوچھئے کہ ان دونوں میں سے کون سی بات صحیح ہے۔ ص۹۴ والی بات یا ص۱۰۶ والی؟ سچ ہے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ - ۶/۹۱

حل حدیث سے ملتا ہے وہ حل کیا ہے؟ اس کے متعلق وہ ارشاد فرماتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ حدیث کس طرح ہمیں قرآنِ مجید کے اس مقام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جن لوگوں کے سامنے قرآن کے یہ احکام نازل ہوئے تھے ان کا بیان یہ ہے کہ اس عبارت کا ایک حصہ جو "اے لوگو" سے شروع ہو کر "اگر تم علم رکھتے ہو" پر ختم ہوتا ہے، ابتداءً نازل ہوا تھا اور دوسرا حصہ اس کے ایک سال بعد نازل ہوا۔ پہلے سال روزے فرض کرتے وقت یہ رعایت رکھی گئی تھی کہ آدمی روزے کی طاقت رکھنے کے باوجود اگر روزہ نہ رکھے تو فدیہ دیدے مگر دوسرے سال اس رعایت کو منسوخ کر دیا گیا البتہ مسافر اور مریض کے لئے سابق رعایت بحال رکھی گئی۔

اس بیان سے نہ صرف یہ کہ سارے اشکالات رفع ہو گئے بلکہ یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ دوسرے سال آخری اور قطعی حکم دیتے ہوئے یہ تمہید کیوں اٹھائی گئی کہ یہ رمضان کا وہ مہینہ ہے جس میں تمہیں قرآن جیسی نعمت دی گئی۔ اب بات سمجھ میں آگئی کہ پہلے اللہ کی اس نعمت کا احساس دلایا گیا، پھر حکم دیا گیا کہ اس نعمت کے شکریے میں تم کو اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ حدیث کی رو سے ہمیں حل کیا ملا؟ حل یہ ملا کہ:۔

(۱) پہلے سال روزے فرض کرتے وقت یہ رعایت رکھی گئی تھی کہ آدمی روزے کی طاقت رکھنے کے باوجود اگر روزہ نہ رکھے تو فدیہ دے دے۔

حکم کی منسوخی

مگر

(۲) دوسرے سال اس رعایت کو منسوخ کر دیا گیا۔

ذرا آپ سوچئے کہ اس سے اس قانون ساز کے متعلق جسے ہم عالم الغیب کہتے ہیں،

کیا تصور پیدا ہوتا ہے اُس نے جب پہلے سال روزے فرض کئے تو یوں حکم دیا کہ تم پر روزے فرض ہیں لیکن جو تم میں سے روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں وہ روزے کے بجائے فدیہ دیدیں یعنی بالفاظ دیگر جو روزہ رکھ سکنے کی طاقت رکھیں وہ تو فدیہ دیدیں اور روزہ وہ رکھیں جنہیں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو حکم قرآنی کی اس تشریح کو جو مودودی صاحب نے خیر سے حدیث کی مدد سے کی ہے کسی سلیم العقل انسان کے سامنے رکھیئے اور پھر اس سے پوچھئے کہ قرآن کے متعلق وہ کیا اندازہ قائم کرتا ہے ؟

اب آگے بڑھیئے۔ فرماتے ہیں کہ دوسرے ہی سال اللہ تعالیٰ نے اس رعایت کو منسوخ کردیا یعنی ایک ہی سال کے تجربہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے محسوس کرلیا کہ میں نے کس قسم کا حکم دے دیا تھا۔ وہ معاذ اللہ اپنی غلطی پر متنبہ ہوا اور اپنے پہلے حکم کو واپس لے لیا۔

تدریج لیکن مودودی صاحب اس عمل تنسیخ کی حکمت بھی بیان فرماتے ہیں۔ وہ محدثین و مفسرین کی تشریح کے مطابق لکھتے ہیں کہ نماز اور روزہ دونوں کی موجودہ صورت بتدریج قائم کی گئی ہے۔ جب نبی صلعم مدینہ تشریف لائے تو آپ ہر مہینے تین دن کے روزے رکھتے تھے اور ایک روزہ محرّم کی دسویں کو رکھا کرتے تھے پھر اللہ نے رمضان کے روزے فرض کئے مگر یہ رعایت رکھی کہ جو روزہ نہ رکھے وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے اس کے بعد حکم آیا کہ رمضان کے روزے رکھے جائیں اور تندرست مقیم آدمی کیلئے فدیہ کی رعایت منسوخ کردی گئی[1]

[1] مودودی صاحب کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ فدیہ کی رعایت تندرست اور مقیم کیلئے منسوخ ہوئی مریض اور مسافر کیلئے باقی رہی کیا ہم اُن سے اتنا پوچھ سکتے ہیں کہ قرآن میں مریض اور مسافر کے لئے فدیہ کی رعایت کہاں ہے۔ قرآن ان کے لئے دوسرے دنوں میں گنتی پوری کردینے کا حکم دیتا ہے، فدیہ کی رعایت کہیں نہیں دیتا۔ ۱۲۔

مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ اس عمل تنسیخ کی حکمت یہ تھی کہ روزہ کے احکام بتدریج نازل ہوئے تھے یعنی پہلے کچھ رعایتیں دی گئیں اور جب لوگ آہستہ آہستہ اس کے عادی ہو گئے تو پھر وہ رعایتیں منسوخ کر دیں۔ روزے ۲ھ میں فرض ہوئے تھے جب تمام روئے زمین پر مسلمانوں کی تعداد تین چار سو سے زیادہ نہ تھی ان مسلمانوں کیلئے اس رعایت کو ضروری سمجھا گیا اور وہ بھی صرف ایک ہی سال کے لئے لیکن اس کے بعد خود رسول اللہ کی زندگی میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ اسلام لائے لیکن ان کے لئے تدریج کی حکمت ضروری نہ سمجھی گئی ان میں سے ہر شخص کو وہ روزے رکھنے پڑے جن میں رعایت منسوخ ہو چکی تھی معلوم نہیں ان تین چار سو مسلمانوں کے لئے اس رعایت کی کیا ضرورت تھی اور بعد میں آنے والوں کے لئے اسے کیوں نہ ضروری سمجھا گیا۔ اگر مقصود یہ تھا کہ لوگ آہستہ آہستہ روزوں کے عادی ہو جائیں تو ہر نومسلم کے لئے اس رعایت کی ضرورت تھی اور اگر یہ لاکھوں مسلمان ایمان لانے کے بعد پہلے سال کے روزے بلارعایت رکھ سکتے تھے تو ۲ھ والے مسلمان ایسا کیوں نہیں کر سکتے تھے ؟

دوسرا اعتراض

احکامِ خداوندی پر اعتراضات کے سلسلہ میں مودودی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس عبارت میں پہلے ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا گیا کہ ماہِ رمضان میں تم کو یہ نعمت دی گئی تھی اس لئے تم میں سے جو اس کو پائے اسے چاہیئے کہ وہ اس مہینے کے روزے رکھے آخر یہ کیا انداز بیان ہے کہ پہلے کہا کہ روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا پھر تین چار فقروں میں روزوں کے متعلق بعض احکام بیان کئے پھر بتایا کہ وہ گنے چنے دن رمضان کے ہیں۔ اسی انداز بیان کو مودودی صاحب نے "اناڑی پن" سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس اشکال کا جو حل حدیث نے دیا ہے اس سے مودودی صاحب کے الفاظ میں یہ بات بھی سمجھ

میں آگئی کہ دوسرے سال آخری اور قطعی حکم دیتے ہوئے یہ تمہید کیوں اٹھائی گئی کہ یہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں تمہیں قرآن جیسی نعمت دی گئی، مودودی صاحب کی اس تشریح سے بات یہ بنی کہ

(۱) پہلے سال روزوں کا حکم دیتے ہوئے رمضان کے مہینے کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن

(۲) دوسرے سال کے احکام میں رمضان کا ذکر کیا گیا۔ اور یہ ذکر اس لئے کیا گیا کہ رمضان میں قرآن نازل ہوا تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ یا تو پہلے سال کے روزے رمضان کے مہینے میں فرض نہیں ہوئے تھے اور رمضان کی تخصیص دوسرے سال کی گئی اور اگر پہلے سال بھی روزے رمضان میں تھے تو اس وقت ابھی قرآن نازل نہیں ہوا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ہی غلط ہیں خود مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ پہلے سال بھی رمضان ہی میں روزے فرض ہوئے تھے۔ اور اس سے بھی غالباً انہیں انکار نہیں ہوگا کہ جس رمضان (سنہ ۲ھ) میں روزے فرض ہوئے ہیں قرآن اس سے بہت پہلے نازل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلے ہی سال کے حکم میں تمہید اس سے کیوں نہ اٹھائی گئی کہ روزے رمضان کے مہینے کے فرض ہیں اور رمضان کے مہینے کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں قرآن نازل ہوا۔

متضاد احکام؟ سب سے بڑا اعتراض جو مودودی صاحب کے ذہن میں گھوم رہا ہے کہ قرآن نے پہلی آیت میں مسافر، مریض اور طاقت رکھنے والے سے متعلق رعایت کو بیان کیا ہے لیکن اگلی آیات میں مریض اور مسافر کی رعایت کو تو دہرایا گیا ہے لیکن طاقت رکھنے والے کی رعایت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ لہٰذا یہ متناقض احکام ہیں اور ان میں تطبیق کی صورت یہی ہے کہ طاقت رکھنے والے کی رعایت کو منسوخ تصور کیا جائے۔

بالفاظِ دیگر مودودی صاحب اصول یہ متعین فرماتے ہیں کہ اگر ایک مقام پر قرآن نے کسی معاملہ کی پانچ جزئیات کا ذکر کیا ہے اور دوسری جگہ تین جزئیات کا تو اس سے سمجھنا یہ چاہیئے کہ باقی ماندہ دو جزئیات منسوخ ہو چکی ہیں۔ مثلاً دین کی بنیاد ایمان پر ہے قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر اس کی تصریح فرما دی ہے کہ ایمان کے اجزاء پانچ ہیں یعنی اللہ، ملائکہ، کتب، رسل اور یومِ آخرت پر ایمان لانا ——— لیکن دوسرے مقامات پر کہیں صرف اللہ اور رسول پر ایمان کا ذکر ہے (۴/۱۵۲) کہیں صرف اللہ اور آخرت پر ایمان کا (۵/۶۹) اور کہیں فقط اللہ پر ایمان کا (۴/۱۴۳)۔ مودودی صاحب کے مندرجہ بالا اصول کے مطابق ایمان کے وہ اجزاء جن کا ذکر قرآن کی دیگر آیات میں نہیں، سب منسوخ ہیں۔ ایمان کے بعد دین کا بنیادی مسئلہ حرام اور حلال ہے۔ اس کے متعلق سورۂ مائدہ کی تیسری آیت میں جن چیزوں کو حرام کہا گیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے (۱) اَلْمَیْتَۃُ (مردار) (۲) وَالدَّمُ (خون) (۳) وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ (خنزیر کا گوشت) (۴) وَمَآ اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ جیسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے۔ (۵) وَالْمُنْخَنِقَۃُ (گلا گھونٹ کر مارا ہوا) (۶) وَالْمَوْقُوْذَۃُ (چوٹ لگ کر مرا ہوا) (۹) وَمَآ اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ (جسے درندوں نے کھا لیا ہو بجز ان کے جنہیں تم نے ذبح کر لیا ہو) (۱۰) وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ (اور جسے بتوں کے تھانوں پر ذبح کیا گیا ہو) (۱۱) وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ۔ (اور جسے تم پانسوں سے تقسیم کرو) لیکن سورہ انعام اور سورۂ بقرہ دونوں میں صرف چار چیزوں کا ذکر ہے یعنی مردار۔ بہتا ہوا خون خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے ناموں کی طرف منسوب (۶/۱۴۶ و ۲/۱۷۳) علاوہ ازیں سورہ مائدہ اور سورہ بقرہ میں صرف دم (خون) کا لفظ آیا ہے لیکن سورہ انعام میں دم مسفوح (بہتا ہوا خون) بیان ہوا ہے۔ نیز سورہ انعام اور سورۂ بقرہ میں حرام چیزوں کے بیان کے بعد

بھی یہ ارشاد ہے۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ (یعنی جو شخص مجبور ہو جائے اور اپنی خواہش خلاف ورزیٔ قانون کی نیت سے ایسا نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں) لیکن سورۂ مائدہ میں اس رعایت کا کوئی ذکر نہیں۔ مودودی صاحب کے اصول کے مطابق یہ رعایت تو ضرور منسوخ سمجھی جانی چاہیئے کیونکہ اس کا ذکر سورۂ مائدہ میں نہیں آیا نیز خون کے ساتھ مفسوخ کی شرط بھی منسوخ سمجھی جانی چاہیئے۔ کیونکہ سورۂ بقرہ اور سورہ مائدہ میں خالی خون کا ذکر ہے۔

قرآن کا انداز

قرآن سے اسی قسم کی اور بھی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں مشکل یہ ہے کہ ان لوگوں کو اس کا بھی پتا نہیں کہ قرآن کا اندازِ بیان کیا ہے۔ اس کا انداز یہ ہے کہ وہ کہیں ایک ہی چیز کا ذکر اجمالاً کرتا ہے کہیں اس کی تفصیل دیتا ہے۔ کہیں اس تفصیل کے کوئی اجزاء بیان کرتا ہے کہیں کوئی اور اجزاء اور اس طرح "تصریف آیات" (آیات کو بار بار لانے) سے مکمل حکم سامنے آتا ہے۔ احکام تو ایک طرف انبیاء سابقہ کے تذکار جلیلہ اور امم سابقہ کے قصص کے بارے میں بھی اس کا یہی انداز ہے مودودی صاحب اور ان جیسے اور حضرات چاہتے یہ ہیں کہ قرآن کا اسلوب اس قسم کا ہونا چاہیئے تھا جس قسم کا اسلوب انہیں پسند ہے اگر قرآن کا اسلوب بیان ویسا نہیں ہے تو یہ اناڑی پن کی دلیل ہے کیونکہ اس سے تضاد لازم آتا ہے اس اناڑی پن کو دور کرنے کے لئے روایات کی تلاش ہوتی ہے اور تضادات کو رفع کرنے کے لئے آیات کو منسوخ بتایا جاتا ہے اور کبھی نہیں سوچتے کہ ہم یہ باتیں کس سے متعلق کہہ رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (انہیں خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں۔

تکرار

مودودی صاحب کو یہ بھی اعتراض ہے کہ چند ملحقہ آیات میں ایک ہی چیز کو

دہرایا کیوں ہے یوں سمجھئے کہ احکام دوسرے پارہ میں ہیں اسی پارہ کے شروع میں تحویلِ قبلہ سے متعلق آیات ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ تم اپنا رخ مسجدِ حرام کی طرف پھیر دو ان آیات میں دیکھئے کہ اس حکم کو کہ تم اپنا رخ مسجدِ حرام کی طرف پھیر دو کتنی بار اور کتنی متصل آیات میں دہرایا گیا ہے پہلی آیت ۱۴۴ میں فرمایا۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔

اس کے بعد آیت ۱۴۹ میں فرمایا۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

اور اس کے بعد انہی الفاظ کو اس سے اگلی آیت یعنی ۱۵۰ میں پھر دہرایا کہ

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

اور اس کے ساتھ ہی فرمایا:۔

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔

اگر (مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق) ایک حکم کو مسلسل آیات میں دہرانا "اناڑی پن" ہے تو معلوم نہیں وہ مندرجہ بالا آیات کے متعلق کیا ارشاد فرمائیں گے۔؟

———(۰)———

مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق ان تمام اعتراضات و اشکالات کا حل (جو ان کے ارشاد کے مطابق قرآن پر وارد ہوتے ہیں) یہ ہے کہ طاقت رکھنے والے کی رعایت سے متعلق حکم کو منسوخ مانا جائے۔ یعنی انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ قرآنِ کریم میں ایسے احکام بھی ہیں جو صرف پڑھنے کے لئے رکھے گئے ہیں (تاکہ ان سے تلاوت کا ثواب حاصل ہو) لیکن ان کا حکم منسوخ ہے کیا وہ بتائیں گے کہ ناسخ اور منسوخ کے اس عقیدہ کی قرآنی سند کون سی

ناسخ و منسوخ

ہے۔اگر وہ یہ کہیں کہ اس کی سند سورۂ بقرہ کی یہ آیت ہے
مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ۔ الآیہ (۲/۱۰۶)
تو یہ جواب خود ان کی اپنی اس تفسیر کے خلاف جاتا ہے جو وہ تفہیم القرآن میں لکھ چکے ہیں۔ اس کے متعلق انہوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ

> یہ ایک خاص شبہ کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے تو ان کے بعض احکام کی جگہ اس میں دوسرے احکام کیوں دیئے گئے ہیں۔ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں۔
> (تفہیم القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۱۰۱)

یعنی مودودی صاحب کی اس تفسیر کی رو سے (اور قرآن کا یہی صحیح مفہوم بھی ہے کہ) قرآن کریم نے کتبِ سابقہ کے بعض احکام کو منسوخ کیا ہے اور اسی امر کا تذکرہ یہاں کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کی آیات ناسخ ہیں اور کتبِ سابقہ کے متعلقہ احکام منسوخ۔ یہ نہیں کہ قرآن ہی کے اندر بعض آیات منسوخ ہیں اور بعض آیات ناسخ۔ قرآن کے متعلق یہ عقیدہ خدا اور اس کے کلام پر ایمانِ محکم کی ساری عمارت کو مسمار کر دیتا ہے اور دراصل اسی مقصد کیلئے اسے عجمی سازشوں نے وضع کیا تھا۔ بہرحال جب خود مودودی صاحب کو اقرار ہے کہ قرآن کی مذکورہ صدر آیت (بابت ناسخ و منسوخ) کتبِ سابقہ کے منسوخ احکام سے متعلق ہے نہ کہ خود قرآن کے احکام سے، تو وہ براہِ کرم بتائیں کہ اس عقیدہ کی قرآنی سند کیا ہے کہ روزوں کے احکام سے متعلق ایک آیت دوسرے سال منسوخ کر دی گئی۔

کم فہمی مودودی صاحب نے جو اللہ میاں کو اناڑی، عقل و خرد سے بے بہرہ، متضاد اور متناقض احکام کا صادر کرنے والا، بے ربط اور بے ترتیب آیات نازل کرنے والا قرار دیا ہے اس کی بنیاد صرف اس قدر ہے کہ وہ عربی کے ایک لفظ (یطیقونہ) کا صحیح مطلب سمجھ نہیں سکے اور اپنی اس جہالت کی بنا پر خدا اور قرآن کو وہ کچھ قرار دے دیا ہے جس کی جرأت کوئی زندیق یا دیانندی ہی کر سکتا ہے اگر وہ اس لفظ کا صحیح مفہوم سمجھ لیتے تو انہیں خدا اور قرآن کے متعلق اس قدر گستاخیوں کی ضرورت پیش نہ آتی اور اس غلطی کی وجہ بھی وہی اندھی تقلید ہے کہ جو روایتوں اور تفسیروں میں لکھا ہوا پایا اسے صحیفۂ خداوندی سے بڑھ کر مستند اور مقدس سمجھ لیا گیا۔ دیکھئے کہ بات کس قدر صاف ہے روزے کے احکام یہ ہیں۔

(۱) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ○ ۲/۱۸۳

اے مسلمانو! جس طرح ان لوگوں پر تم سے جو پہلے گزر چکے ہیں روزہ فرض کیا گیا تھا اسی طرح تم پر بھی فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم تقویٰ شعار بن سکو۔

(۲) اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ

یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ

پھر جو کوئی تم میں بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اس کے لئے اجازت ہے کہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر روزے کے دنوں کی گنتی پوری کر دے۔

(۴) وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَھُوَ خَیْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔

اور جو لوگ ایسے ہوں کہ وہ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں تو ان کے لئے روزہ کے
بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے پھر اگر کوئی اپنی خواہش سے کچھ زیادہ
کرے تو یہ اس کے لئے مزید اجر کا موجب ہوگا لیکن اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے
لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

(۵) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ..... فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ
فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ پس جو کوئی تم میں سے اس
مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو تو وہ اس مہینے کے روزے رکھے اور جو کوئی تم میں سے
مریض ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔

ان آیات سے ظاہر ہے:۔

روزے کے احکام

(۱) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں۔
(۲) روزے اس کے لئے ہیں جو اس مہینے میں اپنے گھر میں موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض صحت یاب ہونے پر، مسافر سفر سے واپسی پر روزوں کی گنتی پوری کر دے۔

(۳) اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے جو نہ مریض ہے (عام عرفی معنوں میں) اور نہ مسافر ہے مگر کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں مثلاً ایک بوڑھا آدمی گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ روزہ بمشکل رکھ سکتا ہے اب ظاہر ہے کہ اس سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزہ رکھ لے۔ اس لئے کہ جتنے دن گزرتے جائیں گے بڑھاپا زیادہ غالب

آنا جائے گا اس کے لئے اس کے سوا کوئی دوسری صورت تھی ہی نہیں کہ اسے روزے معاف کر کے اس سے کچھ فدیہ لے لیا جائے۔ قرآن نے یہی حکم دیا ہے۔

غور کیجئے تو اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔ فرمایئے کہ اس میں کون سے اعتراضات تھے جن کے حل کرنے کے لئے مودودی صاحب کو قرآنی آیات کو منسوخ کرنے کی ضرورت پڑ گئی۔

یُطِیْقُوْنَہٗ کا ترجمہ

ہم نے "وَعَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ" کا ترجمہ کیا ہے ——— "وہ لوگ جو بہ دشواری روزہ رکھ سکیں"۔ اور مودودی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے ——— "اور وہ لوگ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہوں" ——— سوال یہ ہے کہ "یُطِیْقُوْنَہٗ" کا کون سا ترجمہ صحیح ہے۔ ہمارے ہاں اُردو میں لفظ طاقت کا جو مفہوم ہے، عربی میں اس کا وہ مفہوم نہیں۔ مودودی صاحب نے اُردو کے مفہوم کو سامنے رکھ کر آیت کا ترجمہ کر دیا جس سے قرآن کا سارا مطلب ہی خبط ہو گیا۔ طاقت کا عربی مفہوم سمجھنے کیلئے عربی لغت کو دیکھئے محیط المحیط (جلد دوم صفحہ ۱۳۱۰) میں ہے:

طاقت کے معنی ہیں کسی چیز پر قدرت رکھنا۔ لیکن یہ ایک ایسی مقدار کا نام ہے جسے انسان بہ مشقت کر سکے۔ اور دراصل یہ اس طوق کے ساتھ تشبیہ ہے جو کسی چیز کو محیط ہو۔ چنانچہ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (۲/۲۸۶) کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو۔

اسی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب (ج ۱۲ صفحہ ۱۰۳) میں ہے کہ

طاقت اُس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر "المنار" (ج ۲ صفحہ ۱۵۵) میں لکھتے ہیں۔

اَلطَّاقَةُ دراصل مُکْنَت اور قُدْرَت کے ادنیٰ درجہ کا نام ہے چنانچہ عرب کہ

اطاق الشئ صرف اُس وقت کہتے ہیں جبکہ اس کی قدرت انتہائی ضعیف ہو یعنی دشواری کے ساتھ اس کو برداشت کر سکے چنانچہ یُطِيقُونَهٗ سے مراد بوڑھے ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کی بیماریوں کے اچھا ہونے کی توقع نہ ہو اور وہ لوگ ہیں جوان کے مثل ہوں مثلاً وہ کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پر مشقت کاموں پر رکھی ہے...... اسی بناء پر امام راغب نے کہا ہے کہ طاقت اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا کسی انسان کے لئے بمشقت ممکن ہو۔

اسی کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے۔

طاقت کے معنی وہ کام ہیں جنہیں بہ تکلف یا بہ مشقت کیا جائے اور وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيقُونَهٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بناء پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے۔

(تفسیر کشاف ص ۲۵۵ ج ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ

عربی زبان میں "الوسع" کا لفظ اُس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور "طاقت" کا لفظ اُس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو لہٰذا (آیۂ زیرِ نظر کے) معنی یہ ہوں گے کہ "اور اُن لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں (روح المعانی ص ۵۹ ج ۲)

آپ نے دیکھ لیا کہ طاقت کا عربی زبان میں کیا مفہوم ہے اور مودودی صاحب اس کا کیا ترجمہ کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ملا کی یہ پرانی عادت ہے کہ یہ اوّل خود ہی غلط مفروضہ قائم کرتا ہے اور پھر اس غلط مفروضہ پر غلطیوں کا ایک انبار جمع کرتا چلا جاتا ہے یہی کچھ اس

آیت کے مفہوم کی تحریف میں مودودی صاحب نے کیا ہے کہ اول تو خود ہی آیت کا غلط ترجمہ کیا اور پھر خود ہی اعتراضات کے طومار جمع کرتے چلے گئے جن کے سامنے نہ (معاذ اللہ) خدا کی کوئی حیثیت رہی نہ اس کی کتاب کی۔

اجمال کی تفصیل جیسا کہ طلوعِ اسلام میں ہمیشہ لکھا جاتا ہے کہ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ اس کی جزئیات خود متعین کرے۔ چنانچہ عَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ میں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بمشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور و خوض کیا جا سکتا ہے چنانچہ القرطبی کی کتاب جامع احکام القرآن (صفحہ ۲۶۸، ۲۶۹) میں ہے کہ

> تمام علما کا اس پر اتفاق ہے کہ [۲۷] بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمہ کچھ بھی نہیں۔ البتہ امام مالکؒ نے اتنا کہا ہے کہ یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں تو یہ میرے نزدیک پسندیدہ ہے اور انسؓ ابن عباسؓ قیس ابن السائب اور ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنیفہؒ) امام احمدؒ اور امام اسحٰقؒ کا قول بھی یہی ہے نیز ابن عباس سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنی اُمّ ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا اپنے بچہ کو دودھ پلاتی تھی کہ تو اُن لوگوں میں سے ہے جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے تیرے ذمہ فدیہ ہے قضاء

نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہؒ نے اس فہرست میں اور بھی اضافہ کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

"الذین یطیقونہ" سے یہاں مراد بوڑھے ضعیف لوگ ہیں اور وہ اپاہج لوگ ہیں جن کے امراض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو اور ایسے ہی ان کے مثل جو لوگ ہوں مثلاً مزدور پیشہ لوگ جن کی معاش خدا نے ہمیشہ پُرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے جیسے کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور ان ہی میں وہ مجرم بھی داخل ہیں جن کو قید خانوں میں مشکل کاموں کا حکم دیا جاتا ہو اور اُن پر روزہ رکھنا گراں ہوں تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جس کے دور ہونے کی اُمید نہ ہو روزہ رکھنا گراں گزرتا ہے جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی اُمید نہ ہو ایسے ہی وہ شخص جن کی مشقت کا سبب بار بار (مکرر) رہتا ہو جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلادیں اتنا کھانا جو ایک درمیانی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔

خلاصہ ان تفصیل سے حسبِ ذیل فہرست مرتب ہوتی ہے۔

(۱) بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔

(۲) حاملہ عورت۔

(۳) دودھ پلانے والی عورت۔

(۴) اپاہج۔

(۵) پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی اُمید نہ ہو۔

(۶) ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر کمزور ہی پیدا ہوئے۔

(۷) وہ مزدور پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پُرمشقت کاموں میں ہو۔

(۸) وہ مجرم جنہیں جیل خانوں میں مُشقت کے کام کرنے پڑتے ہوں۔

آپ غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے روزے کے معاملہ میں کس قدر رعایت رکھی تھی لیکن مُلّا نے اس رعایت کو منسوخ کر کے کس قدر دشواریاں پیدا کر دی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے تھے، روزے رکھ کر ایسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو بعض اوقات ان کی جان تک لے لیتی ہیں۔ اور اگر وہ روزہ چھوڑتے ہیں تو مُلّا ان کے پیچھے ڈنڈا لیکر اس بُری طرح سے پڑتا ہے کہ ان پر زندگی اجیرن بن جاتی ہے یہ ہے فرق خدا کی طرف سے عطا کردہ دین اور مُلّا کے خود ساختہ مذہب میں۔ دین تمام انسانی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر احکام صادر کرتا ہے اور مُلّا کا مذہب اندھے کی لاٹھی ہے۔

مُلّا کی خود ساختہ سختیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ رفتہ رفتہ مذہب ہی سے برگشتہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہی وقت ہے کہ اُن کے سامنے خدا کا دیا ہوا دین (قرآن کی اصولی تعلیم اور اس کی روشنی میں عقلِ انسانی کی رو سے طے کردہ جزئیات) پیش کیا جائے تاکہ وہ اعلیٰ وجہ البصیرت دیکھ سکیں کہ دین کی بندشیں ایسی نہیں جن سے اس طرح بھاگا جائے۔

غلام اور لونڈیاں

(نومبر ۱۹۴۸ء)

قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب نے حسبِ ذیل خط مودودی صاحب کو لکھا۔

خط میں آپ کے اس مطالبہ سے متفق ہوں کہ پاکستان میں شریعت کا نظام نافذ ہونا چاہیئے۔ اس باب میں دو ایک باتیں دریافت طلب ہیں جن کی وضاحت کے لئے یہ عریضہ ارسالِ خدمت ہے امید ہے کہ آپ جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔

(۱) سوال یہ ہے کہ کیا نظامِ شریعت میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانے کی اجازت ہوگی؟ کیا ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت کرنے کا بھی حق حاصل ہوگا؟ کیا ان لونڈیوں سے بیویوں کے علاوہ تمتع جائز ہوگا اور اس پر تعداد کی تو کوئی قید نہ ہوگی؟۔

(۲) کیا اس نظامِ شریعت میں لونڈی و غلام کی خرید و فروخت (علاوہ اُن لونڈی اور غلام کے جو جنگی قیدی ہوں) بھی پاکستان کے اندر جائز ہوگی جس طرح آج کل حجاز میں بردہ فروشی ہوتی ہے۔

اس کے جواب میں مودودی صاحب کی طرف سے ذیل کا گرامی نامہ موصول ہوا ہے۔

اس کا جواب مکرمی و محترمی! السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہٗ! آپ کا عنایت نامہ ملا۔ جو سوالات آپ نے کئے ہیں اُن کا مختصر جواب تو "ہاں" اور "نہیں" کی

شکل میں دیا جاسکتا ہے لیکن اس سے آپ کی تسکین نہیں ہوگی۔ اس سلئے میں ذرا تفصیل کے ساتھ آپ کو جواب دیتا ہوں۔

نظامِ شریعت میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت ایسی صورت میں دی گئی ہے جب کہ وہ قوم جس سے ہماری جنگ ہوئی ہو نہ تو قیدیوں کے تبادلے پر راضی ہے نہ فدیہ لے کر قیدی چھوڑے اور نہ فدیہ دے کر اپنے قیدی چھڑائے۔

آپ خود غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں تو اس صورت میں جو قیدی کسی حکومت کے پاس رہ جائیں، وہ یا تو انہیں قتل کرے گی یا انہیں عمر بھر اس قسم کے "انسانی باڑوں" میں رکھے گی جنہیں آج کل (CONCENTRATION CAMPS) کہا جاتا ہے اور کسی قسم کے انسانی حقوق دیئے بغیر ان سے جبری محنت لیتی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت زیادہ بے رحمانہ بھی ہے اور خود اس ملک کے لئے بھی زیادہ مفید نہیں ہے جس میں اس قسم کے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک خارجی عنصر کی حیثیت سے موجود ہے۔ اسلام نے ایسے حالات کے لئے جو شکل اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ ان قیدیوں کو فرداً فرداً مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کی ایک قانونی حیثیت مشخص کر دی جائے اسی طرح جو انفرادی رابطہ ایک ایک شخص کا ایک مسلم خاندان سے پیدا ہوگا۔ اس میں اس کا امکان زیادہ ہے کہ ان سے انسانیت اور شرافت کا برتاؤ ہو اور ان کا ایک اچھا خاصا حصہ بتدریج مسلمانوں کی سوسائٹی میں جذب ہو جائے۔

جن مسلمانوں کو ایسے اسیرانِ جنگ پر حقوقِ ملکیت حاصل ہوتے ہیں ان کے لئے شریعت نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ اگر کوئی لونڈی یا غلام ان سے درخواست کرے کہ میں محنت مزدوری کر کے اپنے فدیہ کی رقم فراہم کرنا چاہتا ہوں تو وہ اس کی درخواست کو رد کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ از روئے قانون ایک خاص مدت کیلئے اس کو مہلت دینی ہوگی اور اس مدت میں اگر وہ اپنی رقم

ادا کر دے تو اسے آزاد کر دینا پڑے گا۔

اس قسم کے لونڈیوں اور غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لیکر دوسرے شخص تک منتقل کر دیتا ہے۔ یہ قانون میں گنجائش جس مصلحت سے رکھی گئی ہے اس کو آپ پوری طرح سے اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جب کہ کسی دشمن فوج کے سپاہی کو بطور قیدی رکھنے کا اتفاق ہو۔ فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور اسی طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کے لئے یہ گنجائش نہ چھوڑی جاتی کہ جس قیدی مرد یا عورت سے وہ عہدہ برآ نہ ہو سکے اس کے حقوقِ ملکیت دوسرے کی طرف منتقل کر دے تو یہ لوگ بلائے جان بن جائے۔

جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لئے (جبکہ ان کا تبادلہ ہوا ہو اور نہ فدیہ کا معاملہ طے ہو سکے) اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں وہ دی جائیں اس کو ان کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے کا قانونی حق دیدیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلنے کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتیں قانونی حیثیت سے "ملک یمین" اور "عقد نکاح" میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ بلکہ ملک یمین تو باقاعدہ حکومت کے توسط سے حاصل ہوتی ہے جو عورت کسی کے ملکِ یمین میں دی جائے اس کے ساتھ کسی دوسرے شخص کا جنسی تعلق جائز نہیں ہے۔ جو اولاد اس سے ہوگی اس کا نسب اصل مالک ہی سے ثابت ہوگا اور وہ اپنے باپ کی اسی طرح جائز وارث ہوگی جس طرح کسی آزاد بیوی کی اولاد جس لونڈی سے اولاد ہو جائے اسے بیچنے کا مالک کو حق نہیں رہتا اور مالک کے مرنے کے بعد وہ عورت خود بخود آزاد ہو جاتی ہے۔ لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کی قید اس لئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے

جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آسکتی ہیں۔ بالفرض اگر ایسی عورتوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو جائے، تو سوسائٹی میں انہیں کھپانے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے جبکہ لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کا تعین پہلے ہی کر دیا گیا ہو۔ لیکن بعد کے ادوار میں امراء اور رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنا دیا وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشا کے بالکل خلاف تھا۔ کوئی رئیس اگر عیاشی کرنا چاہے اور قانون کے منشاء کے خلاف قانون کی گنجائشوں سے فائدہ اٹھانے پر اُتر آئے تو نکاح کا ضابطہ ہی کب اس کے لئے رکاوٹ بن سکتا ہے۔ وہ روز ایک نئی عورت سے نکاح کر سکتا ہے اور دوسرے دن اُسے طلاق دے سکتا ہے۔

حجاز میں جو بردہ فروشی آج کل ہوتی ہے اس کی تفصیل مجھے معلوم نہیں لیکن اصولی طور پر میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ جنگ کے سوا کسی دوسرے طریقے سے آزاد آدمیوں کو پکڑنا اور اُن کی خرید و فروخت کرنا شریعت میں حرام ہے۔ والسلام

بقلم ابوصالح اصلاحی بحکم حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

مکتوب الیہ کا استفسار

محترم مودودی صاحب نے میرے استفسارات کا جواب نفی یا اثبات میں نہیں دیا لیکن اُن کے خط سے ظاہر ہے کہ اُن کے نزدیک اسلام میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت ہے ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان لونڈیوں سے تمتع بھی جائز ہوگا اور اس پر تعداد کی کوئی قید نہیں ہوگی۔

اس کی تائید میں انہوں نے جو دلائل بیان فرمائے ہیں کم از کم میں تو ان سے مطمئن نہیں ہوا۔ میرا تو اس تصور سے دل کانپتا ہے کہ اسلام جو دنیا سے غلامی مٹانے کا مدعی ہے وہ خود انسانوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت دیتا ہو۔ لیکن چونکہ یہ معاملہ مذہب سے تعلق

دکھتا ہے اس لئے گزارش ہے کہ براہ کرم مطلع فرمائیں کہ کیا میں مودودی صاحب کے خط سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ درست ہے اور آیا اسلام کی یہی تعلیم ہے؟ جواب خواہ براہ راست مجھے تحریر فرمادیں خواہ وہ طلوعِ اسلام میں درج فرما دیں۔

والسلام۔

طلوعِ اسلام کی طرف سے جواب

ہمارے بھائی نے مودودی صاحب کے خط سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ بالکل درست ہے وہ اس کے قائل ہیں کہ اسلام میں اسیرانِ جنگ کو غلام اور اُن کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت بھی کیا جا سکتا ہے اور ان لونڈیوں سے بلا قیدِ نکاح و تعداد جنسی تعلقات بھی قائم کیے جا سکتے ہیں۔ باقی رہے ان کے دلائل تو وہ یقیناً ارسطو کے ان دلائل سے زیادہ وقیع اور قوی نہیں ہیں جو وہ نفس غلامی کے جواز بلکہ وجوب میں دیا کرتا تھا کہتے ہیں اس کے پاس ستر غلام تھے اور وہ غلامی کے وجوب میں اتنے ہی دلائل رکھتا تھا جنہیں ناقابلِ تردید سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یونان کو ارسطو کے دلائل لے ڈوبے اور اسلام کو مودودی صاحب جیسے فقہا کی منطق۔

عذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

ہمیں اس اضطراب کی علت بھی معلوم ہے جس کی وجہ سے مودودی صاحب کو اس سیدھے سادے جواب کے لئے دلائل و مصالح کے سہارے تلاش کرنے پڑے۔ خواہ وہ دلائل و مصالح خود دوسرے سہاروں کے محتاج ہی کیوں نہ ہوں اور وہ علت یہ ہے کہ ایک طرف ان کا دامن روایات کی خاردار جھاڑیوں سے الجھا رہتا ہے اور دوسری طرف وہ "ماڈرن" بھی بننا چاہتے ہیں لہٰذا کشمکش لازم ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!

طلوعِ اسلام خدا کے عطا فرمودہ دین کو دین سمجھتا ہے جو حقائق کا صحیح ترجمان ہونے کی وجہ سے قدامت وجدت کی کشمکشوں سے بلند ہے وہ جس قدر فراست بھی حاصل کر سکنے کی استطاعت رکھتا ہے خدا کی کتاب منیر سے حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اسے ان امور میں کبھی الجھاؤ پیدا نہیں ہوگا!

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا   فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا۔

قرآن کا فیصلہ

قرآن میں اسیران جنگ کے متعلق سورہ محمدؐ کی ایک ہی آیت میں حکم ہے اور اس آیت کے چار لفظوں نے معاملہ کو صاف کر کے رکھ دیا ہے۔

اس نے کہا ہے کہ جنگ میں جو قیدی تمہارے ہاتھ آئیں

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً ۴۷/۴

انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دو یا احسان رکھ کر

الّا اللہ خیر سلاً۔ باقی رہی وہ مدت جس میں وہ بطور قیدی تمہارے پاس رہیں تو ظاہر ہے کہ وہ انسان ہیں اور ان سے انسانوں جیسا سلوک روا رکھا جائے گا کسی سے انسانیت سے گرا ہوا سلوک، خود مسلمان کے شعار کے خلاف ہے کسی انسان پر دوسرے انسان کا حق ملکیت یکسر غیر فطری ہے اسلام جو شرفِ انسانیت اور احترام آدمیت کی تعلیم دینے کے لئے آیا تھا۔ اس کا مقام اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ ایک انسان کو دوسرے انسان کی ملکیت میں دے دینے کی اجازت دیدے اور اس کے لئے راہیں کشادہ کر دے۔ غلامی اسی کو کہتے ہیں۔ اور اسلام کا دامنِ تقدس ان اتہامات سے یکسر پاک ہے جو اس کے دشمنوں نے وضعی روایات کے راستے

پر لگے اور جو آج ہماری شومیِٔ قسمت سے ہمارا دین بن چکے ہیں سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۱۰۱/۶

قرآنی احکام

قرآن میں مِلکِ یمین (غلاموں اور لونڈیوں) کے متعلق جس قدر احکام ہیں۔ وہ اُن غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں جو اس وقت عربوں کے ہاں موجود تھے اور جنہیں آہستہ آہستہ ہی ان احکامات کی رو سے جذوِ سوسائٹی بنایا جا سکتا تھا۔ اس نے انہیں اس طرح بتدریج معاشرۂ اسلامی میں جذب کیا اور آئندہ کے لئے غلامی کے دروازے اس حکم کی رو سے بند کر دیئے جس کا ذکر اُوپر آچکا ہے لیکن مسلمانوں کی ملوکیت نے ان دروازوں کو ایک ایک کر کے پھر سے کھول لیا اور قیامت بالائے قیامت کہ اس ننگِ انسانیت مسلک کو وضعی روایات کی رو سے منسوب کر دیا اُس ذاتِ اقدس و اعظم کی طرف جس کے ظہور کا مقصد ہی قرآن نے یہ بتایا تھا کہ وہ ان اغلال و سلاسل کو توڑنے کے لئے آیا ہے جس میں انسانیت جکڑی ہوئی آرہی تھی وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۱۵۷/۷

مودودی صاحب کی دلیل

مودودی صاحب غلامی کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ آج کل جنگ کے قیدی جس قسم کے (CONCENTRATION CAMPS) میں رکھے جاتے ہیں۔ اور ان سے وہاں جس قسم کا انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے اس سے بہتر ہے کہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنا لیا جائے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!

اوّل تو یہ کہ انہوں نے فرض کر لیا ہے کہ قرآنی نظام میں کبھی قیدیوں کے عبوری زمانہ میں کیمپوں کی یہی حالت ہو گی جیسی آج کل کی ابلیسی سیاست میں ہوتی ہے۔ اس نظام میں ،

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے انسانوں سے انسانوں جیسا ہی سلوک کیا جائے گا کہ وہ نظامِ ظلم کو روکنے کے لئے قائم ہوتا ہے پھر یہ بھی دیکھیئے کہ بجائے اس کے کہ ہم اُن (CAMPS) کی اصلاح کا کوئی طریقہ سوچیں جو مسلمانوں کے ہاں اسیرانِ جنگ کیلئے تیار کئے جائیں گے، ہم کہتے ہیں تو یہ کہ اسلام نے اس خرابی کا حل یہ بتایا ہے کہ ان کے مردوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں کیا عمدہ اصلاح ہے؟ انسانیت اس پر ناز کرے گی اور دنیا کے قیدی اس احسانِ عظیم پر سجدہ ریز، جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے کہ ان کی بیبیاں، بہنیں، بیٹیاں ان "مصلحین" کی ہوس رانیوں اور عیش جوئیوں کا سامان بن رہی ہیں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

> فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے اور اسی طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا کوئی کھیل نہیں ہے۔

یعنی قیدیوں سے کام لینا مشکل ہے اور اسی ان کی عورتوں کو گھروں میں رکھنا بعید پر خطر لیکن انہیں جب غلام بنا لیا جائے تو پھر یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے اور اُن کی عورتوں سے جب اُن کے مردوں کے سامنے اُن کی اپنی مرضی کے خلاف جنسی تعلقات قائم کر لئے جائیں تو اس سے وہ تمام خطرات رفع ہو جائیں گے جو دشمن قوم کے افراد ہونے کی جہت سے ان کی طرف سے وارد ہو سکتے تھے!

دوسری دلیل

پھر فرماتے ہیں:-

> جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کیلئے اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں وہ دی جائیں اس کو ان کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دیدیا جائے اگر ایسا نہ کیا جاتا

تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلانے کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتیں۔

یعنی اگر ایک شخص دس دس بیس بیس عورتیں سنبھال لے اُن سے اُن کی مرضی کے خلاف جنسی تعلّقات پیدا کرلے اور پھر جب جی چاہے انہیں کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دے اور اس کی دوسرے سے قیمت بھی وصول کر لے تو یہ سب کچھ پاکیزگی اخلاق میں داخل ہے اور اگر ان عورتوں کو اس طرح آپس میں نہ بانٹا جائے تو وہ سوسائٹی میں مستقل بداخلاقی پھیلانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اب اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ اوّل الذکر بداخلاقی اس لئے حسنِ اخلاق میں داخل ہوگئی کہ آپ نے اسے مشروع قرار دیدیا اور موخرالذکر اس لئے حرام کاری قرار پاگئی کہ آپ کی بارگاہ سے اسے جواز کا فتویٰ نہیں مل سکا۔ آریہ سماجی نیوگ کی تائید میں بھی یہی دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ جس قسم کے تعلق کو سوسائٹی جائز قرار دیدے وہ جائز ہوتا ہے اس پر کسی اور کو اعتراض کا کیا حق حاصل ہے؟

ان کا فلسفہ

لونڈیوں کی تعداد کو بے قید چھوڑ دینے کا فلسفہ بیان فرمانے کے بعد مودودی صاحب ارشاد فرماتے ہیں:۔

لیکن بعد کے ادوار میں اُمراء اور رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنایا وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب قوم کے ہاں لونڈیاں دھڑا دھڑ آرہی ہوں۔ ان کی تعداد کی بھی کوئی حد مقرر نہ ہو وہ ایک دوسرے کی طرف منتقل بھی کی جا سکتی ہوں تو پھر وہ کون سی عیاشی ہے جسے آپ شریعت کی منشاء کے خلاف کہہ سکتے ہیں۔ جسے لونڈی مل جائے اور "شریعت" اس سے جنسی تعلّقات کی اجازت دیتی ہو تو پھر اُس لونڈی سے تمتّع عیاشی کا حیلہ کس طرح بن جائے گا۔ عیاشی کے سامان تو خود فراہم کر دیئے جائیں اور اُن سے

مستفید ہونے والوں پر الزام بھی دھرا جائے۔ باقی رہا ہر روز ایک نئی عورت سے نکاح کرنا اور دوسرے روز طلاق دے دینا، سو یہ بھی اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جب نظامِ شریعت قرآن پر مبنی نہ ہو۔ قرآنی نظام میں طلاق دے دینا ایسا کھیل نہیں ہے۔ اِس میں یہ مذاق نہیں ہوگا کہ طلاق، طلاق، طلاق کہا اور بیوی کو ٹھوکر مار کر نکال باہر کیا۔

مودودی صاحب نے لونڈیوں پر بڑا احسان یہ ظاہر فرمایا ہے کہ جس لونڈی سے اولاد ہو جائے اسے بیچنے کا مالک کو کوئی حق نہیں رہتا، اور مالک کے مرنے کے بعد وہ عورت خود بخود آزاد ہو جاتی ہے لیکن کسی اور کو معلوم ہو یا نہ ہو ناہیں تو یقیناً معلوم ہوگا کہ ان کی شریعت نے یہ تدبیر بھی خود ہی بتا دی ہے کہ لونڈیوں سے جنسی تعلقات بھی قائم کئے جائیں اور پھر یہ خدشہ بھی نہ رہے کہ ان کے اولاد پیدا ہو جائے گی اور اس طرح اسے بیچنے کا حق باقی نہ رہے گا۔[1]

سنیئے، وہ تدبیر کیا ہے؟ صحیح بخاری کتاب البیوع، باب بیع الرقیق۔ (مطبوعہ مصر، جلد دوم ص۱۸) میں یہ حدیث بیان کی گئی ہے۔

---

[1] طلوعِ اسلام پر وہ وقت بڑا اذیت وکرب کا ہوتا ہے جب اُسے کوئی ایسی بات درج کرنی پڑے جسے دنیا کے سامنے پیش کرنے سے ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جائیں لیکن کیا کیا جائے بعض صورتیں ایسی پیش آجاتی ہیں کہ ان میں یہ ناگوار فریضہ ناگزیر ہوتا ہے۔ چنانچہ موضوعِ زیرِ نظر میں ہم عمداً اس سے گریز کرتے رہے ہیں کہ وہ روایات درج نہ کرنی پڑیں جو لونڈیوں کے بارے میں ہماری کُتبِ احادیث میں موجود ہیں لیکن ایک دو روایات تو ضرور نقل کرنی ہی پڑ گئیں۔ ان کے بغیر اصل بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔

عزل

ان ابا سعید الخدری اخبرہ انہ بینما ھو جالس عند رسول اللہ قال یا رسول اللہ انا نصیب سبیا فنحب الاثمان فکیف ترٰی فی العزل فقال اوانکم لتفعلون ذالک لا علیکم ان لا تفعلو ذالکم فانھا لیست نسمۃ کتب اللہ ان تخرج الا ھی خارجۃ۔

ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک روز جب کہ رسول اللہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے حضور سے عرض کیا کہ ہم قیدی عورتوں کے ساتھ جماع کرتے ہیں مگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ حاملہ نہ ہوں کیونکہ ہم انہیں بیچنا چاہتے ہیں تو عزل کرنے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ حضور نے فرمایا کیا تم ایسا کرتے ہو؟ تم پر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ جو بچہ پیدا ہونے والا خدا نے مقرر کیا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گا۔

عزل کے متعلق صحیح بخاری۔ کتاب النکاح، باب نعزل۔ (جلد سوم ص۱۹۳) میں جابر بن عبداللہ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ:۔

قال کنا العزل علی عھد النبی والقرآن ینزل

ہم حضور کے زمانہ میں عزل کیا کرتے تھے اور قرآن نازل ہوا کرتا تھا۔

غیر فطری مجامعت

اور اگر حمل ہو جائے تو؟ اسی صحیح بخاری (جلد دوم ص۱۰) میں یہ حدیث بھی موجود ہے کہ:۔

لا باس ان یصیب من جاریۃ الحامل ما دون الفرج

اس میں بھی حرج نہیں کہ اپنی حاملہ لونڈی سے شرمگاہ کے علاوہ دوسری جگہ سے مجامعت کر لی جائے۔

معاذاللہ! معاذاللہ!! یہ ہیں وہ احادیث جنہیں ختمی مرتبت علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کی ذاتِ گرامی اور صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور نہیں شرمایا جاتا کہ کل قیامت کو خدا اور اس کے رسولِ امین کے سامنے کیا جواب دیں گے۔

بہرحال یہ ہے وہ "نظامِ شریعت" جسے مودودی صاحب یہاں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اسے اپنے ہاں رائج کریں گے اور قومِ مخالف کے جنگی قیدیوں کو غلام اور اُن کی مستورات کو لونڈیاں بنائیں گے تو آپ انہیں روک نہیں سکتے کہ وہ آپ کے قیدیوں کو غلام بنائیں اور آپ کی شریف بیبیوں کے ساتھ اسی طرح جنسی تعلقات قائم کر کے انہیں آگے منتقل کرتے رہیں۔ یہ سلسلہ جب عام ہو جائے گا تو مودودی صاحب اور ان کے ہم نوا حضرات خوش ہوں گے کہ خدا کا دین کس طرح ساری دنیا میں خود بخود پھیل رہا ہے۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

تکملہ یہ کچھ تھا جو اس موضوع پر ۱۹۴۸ء میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد مودودی صاحب نے اس موضوع پر اور کچھ بھی لکھا۔ طلوعِ اسلام ٹرسٹ نے ان تمام مباحث کو ایک کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے جس کا نام ہے۔

"قتلِ مرتد، غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت"

اس میں علاوہ "غلام اور لونڈیوں" کے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ "قتلِ مرتد" اور "یتیم پوتے کی وراثت" کے متعلق بھی مودودی صاحب کے عقائد کس طرح قرآن کے یکسر خلاف ہیں۔ اس باب میں اُن میں اور ایک کٹر ملا میں کوئی فرق نہیں۔

ماڈرن مُلّا

اکتوبر ۱۹۵۱ء

کاروباری دنیا کے خاص انداز ہوتے ہیں جنہیں بزنس کی ٹکنیک کہا جاتا ہے دورِ حاضرہ میں بزنس کی ٹکنیک یہ ہے کہ مال خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اس کا پیکنگ نہایت شاندار ہونا چاہیئے اور چار آنے کی چیز پر بارہ آنے اشتہار پر صرف کر دینے چاہئیں۔ اشتہار میں جدت ہونی چاہیئے اور فرسودہ طریقوں کی مذمت کے بعد بتانا یہ چاہیئے کہ ہمارا مال دورِ حاضرہ کی (LATEST) تراکیب کے مطابق تیار کیا گیا ہے اس لئے یہ بالکل (UP TO DATE) ہے۔

مُلّا بہت پرانا کاروباری ہے اس کے معاش کا ذریعہ ہی مذہب ہے اس دور میں مذہب کی فرسودگی کے خلاف عام جذبۂ بیزاری پیدا ہوا تو مُلّا کے کاروبار میں کساد بازاری شروع ہو گئی۔ ان میں سے چالاک دکان داروں نے اس مسئلے پر غور کیا تو وہ اس راز کو پا گئے کہ اس زمانے میں جب تک اسی زمانے کی بزنس ٹکنیک سے کام نہیں لیا جائے گا کاروبار چل نہیں سکے گا چنانچہ انہوں نے آہستہ آہستہ اس ٹکنیک کو اختیار کرنا شروع کیا سب سے پہلی چیز جو اس کاروبار کی راہ میں حائل ہو رہی تھی وہ مُلّا کا پرانا اسٹائل تھا۔ ان ہوشیار دُکان داروں نے

بزنس ٹکنیک

اس فرسودہ اسٹائل کی جگہ نئے صحافتی اسٹائل کو اختیار کیا اور اس طرح اسی پرانے مال کو نئے پیکنگ کا پیرہن پہنا دیا۔ سٹائل کے ساتھ ملّا کے پرانے لٹریچر کا انداز اشاعت بھی دقیانوسی (نوکشوری) ڈھنگ کا ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے لٹریچر کا لباس GET UP بھی نہایت جاذبِ توجہ تیار کروایا۔ اس کے بعد ایڈورٹیزمنٹ کی باری آئی۔ اس کے لئے انہوں نے ملّا کی جامد دقیانوسیت کو کوسنا شروع کر دیا تاکہ عوام کو یہ معلوم ہو کہ ان کا مال مُلّا کا پرانا مال نہیں، بالکل تازہ اور نیا مال ہے۔ اسی طرح انہوں نے وہی پرانا سڑا ہوا مال محض پیکنگ اور اشتہار کے ترددپیدا کر کے بیچنا شروع کر دیا اور ان کی تجارت بڑی کامیاب رہی۔

ان کامیاب دکانداروں میں اسلامی جماعت سب سے پیش پیش ہے۔ انہوں نے دورِ حاضرہ کی بزنس ٹکنیک کا نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے اور اسے نہایت چابک دستی اور پُرکاری سے اپنایا ہے۔ آپ ان کی تحریروں کو دیکھئے، اسلوبِ بیان صحافتی، پیش کرنے کا انداز بالکل دورِ حاضرہ کے مطابق، ملّا ازم کی کورانہ تقلید اور قبرستانی جمود کے خلاف طعن و تشنیع، سطح بین نگاہیں فوراً اس دامِ تزویر میں پھنس جاتی ہیں لیکن جب اس حسین و دلکش پیکنگ کو کھول کر دیکھئے تو وہی مُلّا ازم اور وہی اس کی سڑاند۔ مثلاً آپ اگست ۱۹۵۱ء کا ترجمان القرآن اٹھائیے۔ یہ مجموعہ ہے ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی اُن تقاریر کا جو ریڈیو سے وقتاً فوقتاً نشر ہوتی رہیں۔ ان میں ایک عنوان ہے "معراج کی رات"۔ اس عنوان کے ماتحت ایک تقریر کی تمہید کے الفاظ یہ ہیں:۔

پیکنگ

> معراج کا واقعہ حضرت محمدؐ کی زندگی کے سب سے زیادہ مشہور واقعات میں سے ہے لیکن یہ جس قدر مشہور ہے اسی قدر افسانوں کی تہیں اس پر چڑھ گئی ہیں۔ عام لوگ عجوبہ پسند ہوتے ہیں۔ ان کی عجائب پسندی کو بس اپنی تسکین کا سامان چاہیئے،

اس لئے معراج کی اصل اور اس کی غرض اور اس کے فائدوں اور نتیجوں کو تو انہوں نے نظر انداز کر دیا اور ساری گفتگو اس پر ہونے لگی کہ آنحضرتؐ جسم کے ساتھ آسمان پر گئے تھے یا صرف روح گئی تھی۔ براق کیا تھا اور فرشتے کس شکل کے تھے ؟ حالانکہ واقعہ تاریخ انسانی کے اُن بڑے واقعات میں سے ہے جنہوں نے زمانہ کی رفتار کو بدلا اور تاریخ پر اپنا مستقل اثر چھوڑا۔

اس تمہید کی اٹھان پر غور کیجئے۔ نظر آتا ہے کہ کہنے والا علاّ ازم کی افسانہ پرستی اور اعجوبہ پسندی سے سخت بیزار ہے، واقعہ معراج میں براق اور فرشتوں کی شکل وصورت کی دقیانوسی چیستانوں میں نہیں الجھنا چاہتا۔ بلکہ اِس کی اُس غایتِ کبریٰ سے بحث کرنا چاہتا ہے جس نے تاریخِ انسانیت پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔

لیکن مال کیسا جاذبِ نگاہ ہے یہ پیکنگ اور کتنی دلکش اور رنگین ہے اشتہار کی یہ سلائڈ۔ بھولا خریدار اس سر بند پیکیٹ کو خرید لیتا ہے اور جب گھر آکر کھولتا ہے تو اس میں سے حسب ذیل مال نکلتا ہے۔

معراج کا سفر نامہ

حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے ۱۲ سال گزر چکے تھے باون ۵۲ برس کی عمر تھی۔ حرم کعبہ میں سو رہے تھے۔ یکایک جبرئیلؑ فرشتے نے آکر آپ کو جگایا۔ نیم خفتہ و نیم بیدار حالت میں اٹھا کر آپ کو زم زم کے پاس لے گئے۔ سینہ چاک کیا اور زم زم کے پانی سے اس کو دھویا۔ پھر اسے حلم اور بردباری اور دانائی اور ایمان و یقین سے بھر دیا۔ اس کے بعد آپ کی سواری کے لئے ایک جانور پیش کیا جس کا رنگ سفید اور قد خچر سے کچھ چھوٹا تھا۔ برق کی رفتار سے چلتا تھا اور اسی مناسبت

بُراق سے اس کا نام بُراق تھا۔ پہلے انبیاء بھی اسی نوعیت کے سفر میں اسی سواری پر جایا کرتے تھے۔ جب وہ سوار ہونے لگے تو وہ جھکا جبریلؑ نے تھپکی دیے کر کہا! دیکھ کیا کرتا ہے۔ آج تک محمدؐ سے بڑی شخصیت کا کوئی انسان تجھ پر سوار نہیں ہوا ہے پھر آپ اس پر سوار ہوئے اور جبریلؑ آپ کے ساتھ چلے۔ پہلی منزل مدینہ کی تھی جہاں اُتر کر آپ نے نماز پڑھی۔ جبریل نے کہا اس جگہ آپ ہجرت کر کے آئیں گے۔ دوسری منزل طورِ سینا کی تھی جہاں خدا حضرت موسیٰؑ سے ہم کلام ہوا تیسری منزل بیتِ لحم کی تھی جہاں حضرت عیسٰیؑ پیدا ہوئے چوتھی منزل پر بیت المقدس تھا جہاں براق کا سفر ختم ہوا۔

اس سفر کے دوران میں ایک جگہ کسی پکارنے والے نے پکارا آپ نے کوئی توجہ نہ کی جبریل نے بتایا یہ یہودیت کی طرف بلا رہا تھا۔ دوسری طرف سے آواز آئی اِدھر آؤ آپ اس کی طرف بھی ملتفت نہ ہوئے جبریل نے کہا کہ یہ عیسائیت کا داعی تھا۔ پھر ایک عورت نہایت ہی بنی سنوری نظر آئی اور اس نے اپنی طرف بلایا۔ آپ نے اس سے بھی نظر پھیر لی۔ جبریل نے کہا یہ دنیا تھی۔ پھر ایک بوڑھی عورت سامنے آئی۔ جبریل نے کہا دنیا کی عمر کا اندازہ اس کی عمر سے کر لیجئے۔ پھر ایک اور شخص ملا جس نے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر آپ اسے بھی چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ جبریل نے کہا یہ شیطان تھا جو آپ کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔

بیت المقدس پہنچ آپ براق سے اتر گئے اور اسی مقام پر اسے باندھ دیا جہاں پہلے انبیاء اس کو باندھا کرتے تھے ہیکلِ سلیمانی میں داخل ہوئے تو سب پیغمبروں کو موجود پایا جو ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دنیا میں پیدا ہوئے تھے آپ

کے پہنچتے ہی نماز کے لیے صفیں بندھ گئیں سب منتظر تھے کہ امامت کے لئے کون آگے بڑھتا ہے جبریل نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا اور آپ نے سب کو نماز پڑھائی پھر آپ کے سامنے تین پیالے پیش کئے گئے ایک میں پانی، دوسرے میں دودھ تیسرے میں شراب آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا، جبریل نے مبارک باد دی کہ آپ فطرت کی راہ پا گئے۔

اس کے بعد ایک سیڑھی آپ کے سامنے پیش کی گئی اور جبریل اس کے ذریعے سے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے۔ عربی زبان میں سیڑھی کو معراج کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے یہ سارا واقعہ معراج کے نام سے مشہور ہوا ہے۔

سیڑھی

پہلے آسمان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ محافظ فرشتوں نے پوچھا کون آتا ہے۔ جبریل نے اپنا نام بتایا۔ پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے جبریل نے کہا محمدؐ۔ پوچھا کیا انہیں بلایا گیا ہے کہا ہاں! تب دروازہ کھلا اور آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ یہاں آپ کا تعارف فرشتوں اور انسانی ارواح کی اُن بڑی شخصیتوں سے ہوا جو اُس مرحلہ پر مقیم تھیں؛ ان میں نمایاں شخصیت ایک ایسے بزرگ کی تھی جو انسانی بناوٹ کا مکمل نمونہ تھے۔ چہرے مہرے اور جسم کی ساخت میں کسی پہلو سے کوئی نقص نہ تھا۔ جبریل نے بتایا یہ آدم ہیں، آپ کے مورثِ اعلیٰ۔ ان بزرگ کے دائیں بائیں بہت لوگ تھے، وہ دائیں جانب دیکھتے تو خوش ہوتے اور بائیں جانب دیکھتے تو روتے۔ پوچھا یہ ماجرا کیا ہے بتایا گیا یہ نسل آدم ہے۔ آدم اپنی اولاد کے نیک لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور بُرے لوگوں کو دیکھ کر روتے ہیں۔

تفاصیل پھر آپ کو تفصیلی مشاہدہ کا موقع دیا گیا۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ کھیتی کاٹ رہے ہیں اور جتنی کاٹتے جاتے ہیں اتنی ہی وہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔
پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔
پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جن کی سرگرانی انہیں نماز کے لئے اُٹھنے نہ دیتی تھی۔
کچھ اور لوگ دیکھے جن کے کپڑوں میں آگے اور پیچھے پیوند لگے ہوئے تھے اور وہ جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں کہا گیا یہ وہ ہیں جو اپنے مال میں سے زکوٰۃ، خیرات کچھ نہ دیتے تھے۔
پھر ایک شخص کو دیکھا کہ لکڑیوں کا گٹھا جمع کر کے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ نہیں اٹھتا تو اس میں کچھ اور لکڑیاں بڑھا لیتا ہے پوچھا یہ کون احمق ہے؟ کہا گیا یہ وہ شخص ہے جس پر امانتوں اور ذمّہ داریوں کا اتنا بوجھ تھا کہ اٹھا نہ سکتا تھا مگر یہ ان کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ ذمّہ داریوں کا بار اپنے اوپر لادے چلا جاتا تھا۔
پھر دیکھا کہ کچھ لوگوں کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کترے جا رہے ہیں پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ غیر ذمّہ دار مقرر ہیں جو بے تکلّف زبان چلاتے اور فتنہ برپا کیا کرتے تھے۔
ایک اور جگہ دیکھا کہ ایک پتھر میں ذرا سا شگاف ہوا اور اس میں سے ایک بڑا موٹا سا بیل نکل آیا، پھر وہ بیل اُسی شگاف میں واپس جانے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ جا سکا۔
پوچھا یہ کیا معاملہ ہے کہا گیا یہ اُس شخص کی مثال ہے جو غیر ذمّہ داری کے ساتھ ایک فتنہ انگیز بات کر جاتا ہے۔ پھر نادم ہو کر اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے مگر نہیں کر سکتا۔
ایک اور مقام پر کچھ لوگ تھے جو اپنا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے تھے پوچھا یہ

کون ہیں؟ کہا گیا یہ دوسروں پر زبان طعن دراز کرتے تھے۔

انہی کے قریب کچھ اور لوگ تھے جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے منہ اور سینے نوچ رہے تھے پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں کرتے اور ان کی عزت پر حملے کیا کرتے تھے۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے ہونٹ اونٹوں کے مشابہ تھے اور وہ آگ کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ یتیموں کا مال ہضم کرتے تھے پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے پیٹ بے انتہا بڑے اور سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ آنے جانے والے ان کو روندتے ہوئے گزرتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ سود خور ہیں۔

پھر کچھ اور لوگ نظر آئے جن کے ایک جانب نفیس چکنا گوشت تھا اور دوسری جانب سڑا ہوا گوشت جس سے سخت بدبو آرہی تھی۔ وہ اچھا گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جنہوں نے حلال بیویوں اور شوہروں کے ہوتے ہوتے حرام سے اپنی خواہشِ نفس پوری کی۔

پھر دیکھا کچھ عورتیں اپنی چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ عورتیں ہیں جنہوں نے اپنے شوہروں کے سر ایسے بچے منڈھ دیئے جو اُن کے نہ تھے۔

تُرش رُو فرشتہ انہی مشاہدات کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک ایسے فرشتہ سے ہوئی جو نہایت تُرش رُوئی سے ملا۔ آپ نے جبریل سے پوچھا اب تک جتنے فرشتے ملے تھے سب خندہ پیشانی اور بشاش چہروں کے ساتھ ملے ان حضرت کی خشک مزاجی کا کیا سبب ہے۔ جبریل نے کہا اس کے پاس ہنسی کا کیا کام؟ یہ تو دوزخ کا داروغہ ہے یہ سُن کر آپ نے دوزخ دیکھنے کی خواہش

ظاہر کی اس نے یکایک آپ کی نظر کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا اور دوزخ اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ نمودار ہو گئی۔

اس مرحلے سے گزر کر آپ دوسرے آسمان پر پہنچے یہاں کے اکابر میں دو نوجوان سب سے ممتاز تھے تعارف پر معلوم ہوا یہ یحییٰ اور عیسےٰ ہیں۔

تیسرے آسمان پر آپ کا تعارف ایک بزرگ سے کرایا گیا جن کا حسن عام انسانوں کے مقابلے میں ایسا تھا جیسے تاروں کے مقابلہ میں چودھویں کا چاند معلوم ہوا یہ یوسف علیہ السلام ہیں۔

چوتھے آسمان پر حضرت ادریسؑ پانچویں پر حضرت ہارون چھٹے پر حضرت موسیٰ آپ سے ملے ساتویں آسمان پر پہنچے تو ایک عظیم الشان محل (بیت المعمور) دیکھا جہاں بے شمار فرشتے آتے اور جاتے تھے اس کے بعد آپ کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو خود آپ سے بہت مشابہ تھے تعارف پر معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ ہیں۔

پھر مزید ارتقاء شروع ہوا یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ گئے جو پیش گاہِ ربّ العزت اور عالمِ خلق کے درمیان حدّ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے نیچے سے جانے والے یہاں رک جاتے ہیں اور اوپر سے احکام اور فرامین براہِ راست یہاں آتے ہیں اسی مقام کے قریب آپ کو جنت کا مشاہدہ کرایا گیا اور آپ نے دیکھا کہ اللہ نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ کچھ مہیا کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی ذہن میں اس کا تصور تک گزر سکا۔

سدرۃ المنتہیٰ پر جبریل ٹھہر گئے اور آپ تنہا آگے بڑھے ایک بلند ہموار سطح پر پہنچے

تو بارگاہِ جلال سامنے تھی ہمکلامی کا شرف بخشا گیا جو باتیں ارشاد ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔

(۲) سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں تعلیم فرمائی گئیں۔

(۳) شرک کے سوا دوسرے سب گناہوں کی بخشش کا امکان ظاہر کیا گیا۔

(۴) ارشاد ہوا کہ جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کے حق میں ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں مگر جو برائی کا ارادہ کرتا ہے، اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا جاتا۔ اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔

پچاس نمازیں پیشئ خداوندی سے واپسی پر نیچے اترے تو حضرت موسیٰ سے ملاقات ہوئی انہوں نے رُوداد سُن کر کہا میں بنی اسرائیل کا تلخ تجربہ رکھتا ہوں میرا اندازہ ہے کہ آپ کی اُمت پچاس نمازوں کی پابندی نہیں کر سکتی جایئے اور کمی کے لئے عرض کیجئے آپ گئے اور اللہ جلّ شانہٗ نے نمازیں کم کر دیں۔ پلٹے تو حضرت موسیٰ نے پھر وہی بات کہی ان کے کہنے پر آپ بار بار اُوپر جاتے رہے اور ہر بار دس نمازیں کم کی جاتی رہیں آخر پانچ نمازوں کی فرضیت کا حکم ہوا اور فرمایا گیا کہ یہی پچاس کے برابر ہیں۔

واپسی واپسی کے سفر میں آپ اس سیڑھی سے اتر کر بیت المقدس آئے۔ یہاں پھر تمام پیغمبر موجود تھے آپ نے ان کو نماز پڑھائی جو غالباً فجر کی نماز تھی پھر براق پر سوار ہوئے اور مکہ واپس پہنچ گئے۔

صبح سب سے پہلے آپ نے اپنی چچازاد بہن اُمِّ ہانی کو یہ رُوداد سنائی پھر باہر نکلنے کا قصد کیا۔ انہوں نے آپ کی چادر پکڑ لی اور کہا خدا کے لئے یہ قصہ لوگوں کو نہ سنایئے گا ورنہ ان کو آپ کا مذاق اُڑانے کیلئے ایک اور شوشہ ہاتھ آجائے گا مگر آپ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے کہ میں ضرور بیان کرونگا حرم کعبہ میں پہنچے تو ابوجہل سے آمنا سامنا ہوا۔ اس نے کہا کوئی تازہ خبر؟ فرمایا ہاں پوچھا کیا؟ فرمایا یہ کہ میں آج کی رات بیت المقدس گیا تھا کہا بیت المقدس ؟ راتوں رات ہو آئے اور صبح یہاں موجود ہو فرمایا ہاں؟ کہا قوم کو جمع کروں سب کے سامنے یہی بات کہو گے فرمایا بے شک۔ ابوجہل نے آوازیں دے دے کر سب کو جمع کر لیا اور کہا لو اب کہو آپ نے سب کے سامنے پورا قصہ بیان کر دیا لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ دو مہینے کا سفر ایک رات میں ناممکن احمال پہلے تو شک تھا اب یقین ہو گیا کہ تم دیوانے ہو گئے ہو۔

آناً فاناً یہ خبر تمام مکہ میں پھیل گئی۔ بہت سے مسلمان اسکو سنکر اسلام سے پھر گئے۔ لوگ اس اُمید پر حضرت ابوبکر کے پاس پہنچے یہ محمدؐ کے دست راست ہیں۔ یہ پھر جائیں تو اس تحریک کی جان ہی نکل جائے انہوں نے یہ قصہ سن کر کہا اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان کیا ہے تو ضرور سچ ہو گا اس میں تعجب کی کیا بات ہے میں تو روز سنتا ہوں کہ ان کے پاس آسمان سے پیغام آتے ہیں اور اسکی تصدیق کرتا ہوں پھر حضرت ابوبکرؓ حرم کعبہ میں آئے۔ رسول اللہؐ موجود تھے اور ہنسی اڑانے والا مجمع بھی۔ پوچھا کیا واقعی آپ نے ایسا فرمایا ہے جواب دیا ہاں۔ کہا بیت المقدس میرا دیکھا ہوا ہے آپ وہاں کا نقشہ بیان کریں آپ نے فوراً نقشہ بیان کرنا شروع کر دیا اور ایک ایک چیز اس طرح بیان کی گویا بیت المقدس سامنے موجود ہے اور دیکھ دیکھ

کہ اس کی کیفیت بتا رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی اس تدبیر سے جھٹلانے والوں کو ایک ضربِ شدید لگی۔ وہاں بکثرت ایسے آدمی موجود تھے جو تجارت کے سلسلہ میں بیت المقدس جاتے رہتے تھے وہ سب دلوں میں قائل ہو گئے ۔۔۔ نقشہ بالکل صحیح ہے۔ اب لوگ آپ کے بیان کی صحت کا مزید ثبوت مانگنے لگے فرمایا میں جاتے ہوئے فلاں مقام پر فلاں قافلہ پر سے گذرا جس کے ساتھ یہ سامان تھا قافلے والوں کے اونٹ براق سے بھڑکے ایک اونٹ فلاں وادی کی طرف بھاگ نکلا میں نے قافلہ والوں کو اس کا پتا بتایا۔ واپسی میں فلاں وادی میں فلاں قبیلہ کا قافلہ مجھے ملا سب لوگ سو رہے تھے میں نے اُنکے برتن سے پانی پیا اور اس بات کی علامت چھوڑ دی کہ اس سے پانی پیا گیا ہے۔ ایسے ہی کچھ اور اَتے پتے آپ نے دیئے اور بعد میں آنے والے قافلوں سے ان کی تصدیق ہوئی۔ اس طرح زبانیں بند ہو گئیں مگر دل یہی سوچتے رہے کہ یہ ہو کیسے سکتا ہے؟ آج بھی بہت سے لوگ سوچ رہے ہیں کہ یہ کیسے ہوا۔

یہ ہے معراج نبوی کا وہ بصیرت افروز اور حقائق پرور بیان جسے ملاکی افسانہ پرستیوں اور عجوبہ پسندیوں نے مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل کر رکھا تھا اور جو دورِ حاضرہ کی اس مجددیت کے صدقے میں پھر سے اُمتِ مرحومہ کے سامنے آیا۔ ذرا ان حقائق و غوامض پر غور فرمایئے۔

غور طلب حقائق

زمزم کے کنارے حضور کا سینہ چاک کیا جاتا ہے۔ سواری کے لئے خچر سے کچھ چھوٹا سفید رنگ کا جانور پیش کیا جاتا ہے۔ جب حضور اس پر سوار ہونے لگتے ہیں تو وہ چمکتا

ہے لیکن حضرت جبریل کے بتانے سے کہ سوار کون ہے؟ چپ کھڑا ہو جاتا ہے۔
بیت المقدس پہنچ کر اس جانور کو باندھ دیا جاتا ہے (اور برق کی رفتار سے اُڑنے والا
ایک رسی سے بندھ کر بے بس کھڑا ہو جاتا ہے) واپسی پر اس سے قافلہ والوں کے
اونٹ بدک گئے ہیں اور حضور اہلِ کارواں کو گم گشتہ اونٹ کا پتا بتاتے ہیں حضور کو پیاس
لگی ہے تو راستہ میں ایک قبیلہ کے قافلہ کے برتن سے پانی پیتے ہیں بیت المقدس
سے سیڑھی کے ذریعہ آسمان پر چڑھتے ہیں اور سیڑھی کے ہی ذریعہ واپسی پر نیچے
اُترتے ہیں۔ آسمانوں کے محافظ فرشتے دروازہ نہیں کھولتے جب تک جبرئیل حضور
کا تعارف نہیں کراتے (انہیں خدشہ ہے کہ جبریل یونہی کسی غیر معتبر آدمی کو ساتھ لے کر
نہاں خانۂ اسرارِ الٰہیہ میں نہ گھس آئے) آسمانوں پر جن آیاتُ اللہِ الکُبریٰ کا مشاہدہ ہوتا ہے
ان میں وہ لوگ ہیں کہ جن کے سر کچلے جا رہے ہیں، زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کاٹے
جا رہے ہیں پتھر میں سے موٹا سا بیل نکلتا ہے اور اس میں واپس نہیں گھس سکتا۔
کچھ لوگ ہیں جن کے پیٹ سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں کچھ عورتیں ہیں جو
چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں۔ خدا پچاس نمازوں کا حکم دیتا ہے اور وہ حضرت
موسیٰ کے کہنے پر عمل کرنے سے پانچ رہ جاتی ہیں۔

وہی افسانہ تراشیاں

آپ ان تفاصیل پر غور فرمائیے کیا کہیں کسی قسم کی
افسانہ تراشی اور عجوبہ پسندی کی کوئی جھلک بھی آپ کو دکھائی دیتی ہے؟ یہ تمام
تفاصیل محض سنی سنائی باتوں پر مشتمل نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک ایک بات اُس
"معراج نامے" میں موجود ہے جسے ہمارے ہاں کی بڑی بوڑھیاں قرآن شریف
کے ساتھ جُز دان میں بند کر کے رکھا کرتی تھیں اور جو زیارتیں دکھانے والی"

عورتوں کی گداگری کا آسرا بنا کرتی تھیں۔

وہی مال ہے بس پیکنگ اور اشتہار میں فرق ہے۔ یہ ہے بزنس کی وہ ٹکنیک جس میں ایک ہوشیار دکاندار کی کامیابی تجارت کا راز پوشیدہ ہے۔ وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ پ۳ع۵ اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے۔

مودودی صاحب اور حدیث

مِثلُہٗ مَعَہٗ

(قرآن کے ساتھ قرآن جیسی ایک اور چیز بھی!)

اکتوبر ۱۹۵۶ء کے طلوعِ اسلام میں حسبِ ذیل شذرہ قارئین کی نگاہ سے گذر چکا ہے۔

"ترجمان القرآن بابت جولائی راگست ستمبر ۱۹۵۶ء میں حکیم حیدر زماں صاحب صدیقی کا ایک مضمون بعنوان "مزارعت پر تحقیقی نظر" شائع ہوا ہے اس کی تمہید میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ اسلام میں احکام کا ماخذ صرف قرآن ہے اس پر ترجمان القرآن دمرتبہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب) کی طرف سے حسب ذیل نوٹ شائع ہوا ہے۔

حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے یعنی وہ انہیں مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آگیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے، تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے اس بارے میں مندرجہ ذیل دلائل و نظائر قابلِ غور ہیں:۔

(۱) مشہور حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! میں تم میں دو

چیزیں چھوڑ چلا ہوں ان دونوں پر عمل کرتے رہو گے تو گمراہ نہ ہو گے اللہ کی کتاب اور میری سنّت ۔

(۲) مقدام بن معدی کرب سے سنن میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا لوگو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل کچھ اور بھی اسی "کچھ اور" کو حدیث، سنّت اور وحی خفی سے تعبیر کیا جاتا ہے ان دونوں روایتوں کا اندازِ بیان بتلا رہا ہے کہ مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے ۔

یہ سوال کہ احکام کا مستقل ماخذ کیا ہے بعد کی چیز ہے ۔ ترجمان القرآن کے اس حاشیہ سے تو اس سے بھی کہیں اہم بات پیدا ہوتی ہے یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس چیز پر ایمان رکھے جو رسول اللہ صلعم کو خدا کی طرف سے دیا گیا تھا اُس وقت تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ اس سے مطلب قرآن ہے یعنی جو شخص قرآن پر ایمان لے آئے وہ اس چیز پر ایمان لے آتا ہے جو مَا اُنزِلَ اِلَیکَ سے مفہوم تھا لیکن ترجمان القرآن کے اس حاشیہ سے یہ ظاہر ہے کہ مَا اُنزِلَ اِلَیکَ صرف قرآن تک ہی ختم نہیں ہو جاتا اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے جو اس کے تحت میں آتا ہے ۔ لہٰذا کسی شخص کے مسلمان ہونے کیلئے ضروری ہو گیا کہ وہ مَا اُنزِلَ اِلَیکَ کے دوسرے حصّے پر بھی ایمان لائے کیونکہ وہ اس کے ساتھ اسی جیسا منزّل من اللہ ہے ظاہر ہے کہ دین کے ایسے معاملے میں جس کا تعلّق کفر اور ایمان سے ہے کوئی ابہام نہیں رہ جانا چاہیئے ۔ بلکہ جس طرح ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن اُس کتاب کا نام ہے جو اَلحَمد سے شروع

ہوکر وَالنَّاس تک ختم ہوجاتی ہے؛ اسی طرح قرآن کے ساتھ قرآن جیسے دوسرے منزل من اللہ حصے کے متعلق بھی یہ قطعی طور پر متعین ہونا چاہیئے کہ وہ کیا ہے۔ مدیر ترجمان القرآن نے اس کے متعلق کہا ہے کہ اسے حدیث، سنت اور وحی خفی سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس سے یہ متعین نہیں ہوتا کہ قرآن کی طرح وہ کون سا صحیفہ ہے جو قرآن کی رو سے منزل من اللہ ہے اور جسے منزل من اللہ سمجھنا مسلمان ہونے کیلئے لازمی ہے۔

چونکہ اس سوال کا تعلق چالیس کروڑ مسلمانوں کے کفر اور ایمان سے ہے؛ اس لئے اس کا تعیّن نہایت ضروری ہے اور اس کی ذمہ داری مدیر ترجمان القرآن کے سر ہے۔ کیا وہ براہ کرم مسلمانوں کو کافر ہونے سے بچانے کی خاطر اس کا قطعی تعیّن فرما دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے خدا کی سند بھی ہونی ضروری ہے۔

جب اس تشذرہ کے جواب میں مدیر ترجمان القرآن کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا اور نہ ہی ترجمان القرآن میں اسی موضوع پر کچھ مزید شائع ہوا تو ہم نے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر انہیں ایک خط کے ذریعہ یاددہانی کرائی۔ اس خط کے جواب میں محترم مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس طرح کے سوالات کی جواب دہی میں اپنا وقت صرف کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ اگر آپ ترجمان القرآن کا مطالعہ فرماتے رہے ہیں تو آپ کو میری روش کا اندازہ خود ہی ہو چکا ہوگا۔"

چونکہ جیسا کہ طلوعِ اسلام کے مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے، ہمارے نزدیک مسئلہ زیرِ نظر دینی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے؛ اس لئے ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اس کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے۔ مودودی صاحب کے مراسلہ صدر جواب

کے بعد ہمارے لئے ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ ہم مسئلہ پیش نظر کے متعلق مودودی صاحب کی سابقہ تحریروں کی طرف رجوع کریں ان کی سابقہ تحریروں میں سے اِس وقت ہمارے سامنے تفہیمات حصّہ اوّل ہے جس میں انہوں نے حدیث کی دینی حیثیت کے متعلق مختلف مقامات پر شرح و بسط سے بحث فرمائی ہے۔ (تفہیمات دراصل ترجمان القرآن میں شائع شدہ مضامین ہی کا مجموعہ ہے) مسئلہ زیرِ نظر کو ہم انہی تحریروں کی روشنی میں جانچتے ہیں تاکہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔

قرآنِ کریم میں ہے :-

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷/۲)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے اور وہ ایمان لائے اس پر جو محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے اور وہ اُن کے ربّ کی طرف سے ایک حقیقت ہے تو اللہ اُن کی برائیاں اُن سے دور کر دے گا اور ان کی حالت درست رکھیگا۔

قرآن پر ایمان

اس سے ظاہر ہے کہ مَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ (جو کچھ محمدؐ پر نازل کیا گیا تھا) پر ایمان لانا شرطِ اسلام ہے اور وہ خدا کی طرف سے حق ہے اب سوال یہ ہے کہ مَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ سے کیا مراد ہے؟ قرآن کا ایک ایک ورق اس پر شاہد ہے کہ اس سے مراد قرآنِ کریم ہے۔

يٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ .... تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (۳۶/۱-۵)

(یہ قرآنِ حکیم خدائے عزیز و رحیم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے)

رسول اللہ پر یہ قرآن خدا کی طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوا۔

قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌ بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ وَاُوْحِىَ اِلَىَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ .... (۶/۱۹)

(ان سے کہو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے اور میری طرف یہ قرآن بذریعہ وحی اتارا گیا ہے تا کہ میں اس کے ذریعہ تم کو اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے (غیر فطری اعمال کے نتائج سے آگاہ کروں۔)

یعنی رسول اللہ پر قرآن بذریعہ وحی نازل ہوا اور قرآن ہی کے ذریعہ لوگوں کو اسلام کی تبلیغ کی جائیگی انہیں بھی جو رسول اللہ کے مخاطب تھے اور ان تمام انسانوں کو بھی جو حضور کے بعد آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح طور پر فرمادیا کہ قرآن رسول اللہ کے اپنے خیالات کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتا ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى ۝ (۵۳/۳)

رسول اپنی خواہش نفس سے باتیں نہیں کرتا، بلکہ یہ قرآن وہ وحی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔

رسول اللہ کو اسی قرآن کی اتباع کا حکم دیا گیا تھا۔ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۳۳/۲) جو کچھ تیرے رب کی طرف سے وحی کیا گیا ہے اس کی اتباع کر۔ خود رسول اللہ کی زبانِ مبارک سے یہ کہلوایا کہ میں اسکے علاوہ جو مجھ پر وحی کیا گیا ہے، اور کسی چیز کی اتباع نہیں کرتا۔ (اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ ۹/۴۲) اسی قرآن کی پیروی کا حکم تمام مسلمانوں کو دیا گیا اور خاص طور پر کہہ دیا گیا کہ اسکے سوا اوروں کی پیروی مت کرو۔

اتّباع صرف قرآن کی ہے

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء (۷/۳)

(جو تمہارے ربّ کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تم اس کی اتباع کرو اور اسکے علاوہ اور آقاؤں کی پیروی مت کرو۔)

اس قرآن کے متعلق فرمایا گیا کہ اس کی مثل کوئی ایک بات (حدیث) بھی نہیں لائی جا سکتی۔

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ۔ (۵۲/۳۴)

(اگر یہ لوگ سچے ہیں تو ان سے کہو کہ اس کی مثل کوئی ایک بات (حدیث) بھی لا کر بتائیں)

اور اسی قرآن کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۹/۱۵ ہم نے اس نصیحت کی کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنیوالے ہیں۔

مودودی صاحب کا ارشاد

یہ ہے قرآن کی تعلیم اس کے برعکس محترم مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں رسول اللہ کو قرآن کے علاوہ اور بھی بہت کچھ وحی کے ذریعہ ملتا تھا جو قرآن کے ساتھ بالکل قرآن کے مثل تھا اور اس کی اتباع بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح قرآن کی۔ اس دوسرے حصّہ کا نام روایات ہے یعنی ان کے نزدیک وحیٔ خداوندی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ ایک حصّہ قرآن کریم میں درج کر دیا جاتا تھا اور دوسرا حصّہ روایات میں آجاتا تھا۔

آپ سارا قرآن چھان ماریئے آپ کو کہیں یہ نہیں ملے گا کہ وحی کے دو حصّے تھے ایک قرآن اور ایک روایات خود مودودی صاحب کی تحریروں میں بھی ہمیں ان کے اس عقیدہ کی تائید میں قرآن کی کوئی سند نہیں مل سکی۔ اس عقیدہ کا مدار ایک روایت پر ہے جس میں لکھا ہے کہ حضور کو قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل (مِثْلَهُ مَعَهُ)

اور کچھ بھی بذریعہ وحی ملا اور وہ روایات ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم ایک مختصر سی کتاب ہے جو حضورؐ کی تیئس سالہ نبوت کی زندگی میں جزءً جزءً نازل ہوتا رہا اس سے واضح ہے کہ نبئ اکرمؐ پر ہر وقت وحی نازل نہیں ہوا کرتی تھی خود روایات بتاتی ہیں کہ جب وحی نازل ہوا کرتی تھی تو اُس وقت حضورؐ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوا کرتی تھی جو وحی کے ختم ہو جانے کے بعد باقی نہیں رہا کرتی تھی۔ جب حضورؐ پر وحی نازل ہو چکتی تو آپ فرماتے کہ یہ سورت یا یہ آیت نازل ہوئی ہے انہیں قرآن کے فلاں مقام پر رکھو تو چنانچہ اسی وحی کو کاتبانِ وحی سے لکھوا دیا جاتا اور حفّاظ کو یاد کرا دیا جاتا اس وحی کے بعد دن رات کے باقی حصّے میں حضور جو کچھ ارشاد فرماتے انہیں نہ کاتبانِ وحی سے لکھوایا جاتا نہ حفاظ کو یاد کرایا جاتا نہ حضورؐ کبھی یہ حکم دیتے کہ اسے قرآن کے فلاں مقام میں درج کر لو اس سے ظاہر ہے کہ وحی اور حضورؐ کی باقی زندگی ایک دوسرے سے متمیّز تھیں۔ وحی اللہ کی طرف سے

وحی اور غیر وحی کا فرق

نازل ہوتی تھی۔ اِسی کا مجموعہ قرآن ہے۔ اسی پر ایمان لانے کا حکم تھا یہی لکھی جاتی تھی اسی کو حفظ کرایا جاتا تھا اسی کی اتباع خود رسول اللہؐ فرماتے تھے اور اسی کی اتباع اور مسلمانوں سے کراتے تھے۔ نہ اس میں کسی غلطی کا اِمکان تھا نہ سہو نہ فروگذاشت کی گنجائش لیکن وحی کے علاوہ جو کچھ حضور فرماتے تھے وہ منزّل من اللہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ حضور کی اپنی طرف سے ہوتا تھا اگرچہ حضور بصیرتِ ایمانی کے بلند ترین مقام پر تھے اور آپ کی سیرتِ طیبہ مکارمِ اخلاق اور خُلقِ عظیم کا مظہرِ اتم تھی لیکن بشریت کے تقاضے بہرحال حضورؐ کے ساتھ تھے حضورؐ کی زندگی کے ان دو حصّوں کو خود قرآن کریم نے متمیّز کر کے دکھا دیا

ہے جب فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ..... ۱۸/۱۱۰" میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں اس فرق کے ساتھ کہ مجھ پر وحی ہوتی ہے۔ اور دوسری جگہ ہے کہ

قل ان ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ (۳۴/۵۰)

ان سے کہو کہ اگر میں غلطی کر دوں تو اس کی ذمہ داری خود مجھ پر ہے۔
اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ اس قرآن کی بدولت ہے جو میرا ربّ میری طرف وحی کرتا ہے۔

لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں! یہ بھی غلط ہے نبیٔ اکرم زندگی کے ہر

رسولؐ ہر حال میں رسول تھے!

سانس میں رسول تھے آپ کی ہر بات وحی ہوتی تھی اس کا ایک حصہ قرآن میں درج کرادیا جاتا تھا اور دوسرا حصہ ویسے رہنے دیا جاتا۔ یہ دوسرا حصہ کتبِ روایات میں ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

قرآن کریم میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول اور نبی ہونے کی حیثیت ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے ذازکیا اُس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا ـــ حتّٰی کہ آپ کے نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آگئے تھے۔ (تفہیمات حصہ اول صـ۲۴۱)

اس کے بعد آیۂ "وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی" (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) کے حوالے سے فرماتے ہیں :۔

"ہر وہ بات جس پر نُطقِ رسول کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ آیات مذکورہ کی بنا پر وحی ہو گی اور ہوائے نفس سے پاک ہوگی۔ یہ تصریح قرآن میں اس لئے کی گئی ہے کہ رسول کو جن لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے .... وہ جان لیں کہ رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہے ..... میں کہتا ہوں کہ آنحضرتؐ جس وقت جس حالت میں جو کچھ بھی کرتے تھے، رسول کی حیثیت سے کرتے تھے۔

(ایضاً صـ۳۴۲۰۴۳)

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

کتاب کے ساتھ رسول اللہ کو اسی غرض سے بھیجا گیا تھا کہ آپ ایک ماہرِ فن استاد کی ضرورت کو پورا کریں۔ آپ نے استاد کی حیثیت سے جو کچھ بتایا اور سکھایا ہے۔ وہ بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے۔ اس کو غیر از قرآن کہنا صحیح نہیں۔ (صـ۳۴۶)

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک :۔

(۱) نبیؐ اکرم نے بعثت کے بعد جو بات جس وقت جس حالت میں بھی فرمائی وہ بحیثیت رسول کے تھی۔

(۲) حضورؐ کی ہر بات اسی طرح خدا کی طرف سے ہوتی تھی جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے اور

(۳) ان دونوں میں کوئی فرق نہیں وہ باتیں "غیر از قرآن" ہیں ہی نہیں۔

ایک اعتراض

ان تینوں مقدمات کو سامنے رکھ کر آگے بڑھیئے اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوا کہ حضور کی کئی ایک باتوں پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ٹوکا۔ چنانچہ ان کا ذکر خود قرآنِ کریم میں ہے مثلاً آپ نے ایک قسم کا شہد کھانے سے قسم کھائی تو ارشاد ہوا کہ:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ (سورۃ تحریم)

اے نبی! جسکو اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے اسے تم کیوں حرام کرتے ہو؟

ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ کا اپنے اوپر شہد کو حرام قرار دے لینا من جانب اللہ تھا تو خدا نے اس پر اعتراض کیوں کیا؟ یعنی پہلے خدا نے خود ہی رسول اللہ سے کہہ دیا کہ شہد کو اپنے اوپر حرام کر لو اور جب آپ نے اس حکم کی تعمیل کر لی تو پھر خود ہی اس پر تادیب بھی نازل کر دی۔

یا مثلاً دوسری جگہ ہے عَفَا اللَّهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ (توبہ)

اے نبی! خدا نے تمہیں معاف کر دیا تم نے انہیں اجازت کیوں دے دی تھی؟۔ اب ظاہر ہے کہ حضور کا اجازت دے دینا از روئے وحی تھا تو اس پر وحی بھیجنے والے خدا نے تہدید کیوں فرمائی؟ اسی طرح ایک اور واقعہ میں قرآن میں آیا ہے کہ عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ أَن جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ (سورۃ عبس) یعنی اے رسول! تمہیں یہ بات بہت ناگوار گزری کہ وہ اندھا اس وقت تمہارے پاس کیوں آگیا۔ اس سے تمہاری پیشانی پر بل آ گئے۔ سو اگر حضورؐ کی پیشانی پر بل وحی کے مطابق آئے تھے تو پھر وحی نے اس پر تنبیہہ کیوں کی۔

سنیئے کہ اس کے جواب میں مودودی صاحب کیا فرماتے ہیں؟ لکھتے ہیں کہ:۔

رسول اللہ کے معاملات کو اس کے بشری عقل اور اس کے انسانی اجتہاد پہ نہیں چھوڑا گیا۔ بلکہ جہاں خدا کے مقرر کیے ہوئے خطِ مستقیم سے اس نے بال برابر بھی جنبش کی ہے وہیں اس کو ٹوک کر سیدھا کر دیا گیا۔ (صد ۲۶۲)

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

منصبِ نبوت پر مامور ہونے کی وجہ سے نبیؐ اکرم کے لئے لازم ہے کہ اُن کا اجتہاد بھی ٹھیک وحیٔ الٰہی کے مطابق ہو اگر وہ اپنے اجتہاد میں وحیٔ خفی کے اشارے کو دیکھ کر مرضیٔ الٰہی کے خلاف بال برابر بھی جنبش کریں تو اللہ تعالیٰ وحیٔ جلی سے اس کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ (صد ۲۷۸)

پھر ارشاد ہے:۔

اگر رسول بمقتضائے بشریت کبھی اپنے اجتہاد میں غلطی کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کر دیتا ہے۔ (صد ۲۶۷)

(۱) رسول خود اجتہاد فرمایا کرتے تھے۔

(۲) بمقتضائے بشریت اپنے اجتہاد میں غلطی بھی کر جاتے تھے۔

(۳) لیکن جہاں رسول اپنے اجتہاد میں غلطی کرتے تھے انہیں فوراً ٹوک دیا جاتا تھا۔

(۴) وحی کی دو قسمیں ہیں، وحیٔ خفی اور وحیٔ جلی۔ وحیٔ خفی کے اشارات کو صحیح طور پر سمجھنے میں رسول سے سہو ہو جاتا تھا تو وحیٔ جلی کے ذریعہ اس کی اصلاح کر دی جاتی تھی۔

اب ان تین مقدمات کو سامنے لائیے جو پہلے گزر چکے ہیں اور ان کے مدِمقابل مندرجہ بالا نتائج کو رکھیئے اور پھر تضاد ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) رسول اللہ کی ہر بات اسی طرح منجانب اللہ ہوتی تھی جس طرح قرآن من جانب اللہ تھا۔	(۱) رسول کے اجتہادات اپنی طرف سے ہوتے تھے جن میں غلطی بھی ہو جاتی تھی۔
(۲) رسول اللہ جس وقت جس حالت میں جو بات بھی کرتے تھے، رسول کی حیثیت سے کرتے تھے	(۲) حضور خدا کے متعیّن کردہ خطِ مستقیم سے جنبش کر جاتے تھے تو فوراً آپکی اصلاح کر دی جاتی تھی۔
(۳) حضور کے اجتہادات اور قرآن میں کوئی فرق نہیں۔	(۳) قرآن وحیٔ جلی ہے اور باقی وحیٔ خفی۔

یہ نکتہ ذرا باریک ہے اسے غور سے سمجھئے اگر رسول اللہ کی ہر ایک بات منجانب اللہ تھی اسی طرح جس طرح قرآن منجانب اللہ ہے تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حضور اجتہادات میں غلطی کر جاتے تھے یا وحیٔ خفی کا اشارہ سمجھنے میں سہو ہو جاتا تھا۔ جب حضور کی ہر بات، ہر عمل، ہر فیصلہ منجانب اللہ تھا تو پھر اس میں غلطی کیسی اور وحیٔ خفی کا اشارہ سمجھنے اور نہ سمجھنے کا سوال کیا؟ لیکن مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق خدا اور رسول میں معاملہ یوں تھا کہ:۔

(۱) رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہوتی تھی۔

(۲) لیکن جب خدا دیکھتا کہ رسول فلاں معاملہ میں غلطی کر گیا ہے تو فوراً اس کی اصلاح کر دیتا۔

اگر کسی کے سر میں ذرا بھی عقلِ سلیم ہے تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ ان دو باتوں میں کوئی ربط دکھائی دیتا ہے۔

پھر اس کے بعد دریافت طلب امر یہ ہے کہ مودودی صاحب نے وحی کی جو دو قسمیں ارشاد فرمائی ہیں (وحیٔ خفی اور وحیٔ جلی)، تو اس تقسیم کا کوئی ذکر قرآن میں بھی ہے؟

یا (معاذاللہ) خود خدا بھی اپنی وحی کے متعلق نہیں جانتا تھا کہ اس کی دو قسمیں ہیں۔

خداداد بصیرت — اب آگے بڑھیئے آپ اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب کے عقیدہ کے مطابق نبی اکرمؐ کی ہر بات وحی ہوتی تھی لیکن وہ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ:-

> "رسول کو درمیانی واسطہ اس لئے بنایا گیا ہے کہ وہ اصولی قانون کو اپنی اور اپنی اُمت کی عملی زندگی میں نافذ کر کے ایک نمونہ پیش کر دیں اور اپنی خداداد بصیرت سے ہمارے لئے وہ طریقے متعین کر دیں جنکے مطابق ہم اس اصولی قانون کو اپنی اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ میں نافذ کرنا چاہیئے۔ (صـ۲۳۷)

یعنی دین کے اصول قرآن کریم میں تھے اور رسول اللہؐ نے ان قوانین کو اپنی خداداد بصیرت سے عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ اوپر کہا گیا تھا کہ رسول اللہؐ نے یہ کام وحی کے ذریعہ کیا تھا لیکن یہاں کہا گیا ہے کہ حضور نے اپنی خداداد بصیرت سے کیا تھا۔ اگر منجانب اللہ وحی اور خداداد بصیرت دو الگ الگ چیزیں ہیں، تو مودودی صاحب کا تضاد واضح ہے۔ لیکن اگر مودودی صاحب کے نزدیک منزّل من اللہ وحی بصیرت ہی کا دوسرا نام ہے، تو یہ عقیدہ غور طلب ہے۔ بصیرت کم وبیش ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ لیکن یہ خاصۃ مافوق البشر نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ نبی کی بصیرت دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ ہوتی ہے تو فرق کمیّت (QUANTITY) کا ہوا کیفیت QUALITY کا نہ ہوا۔ اس سے یہ لازم آئے گا کہ بصیرت اور وحی میں فرق (QUALITATIVE

ہے، (QUANTITATIVE) نہیں۔ نوع کے اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں یعنی وحی بصیرت کی ہی بڑھی ہوئی ایک شکل کا نام ہے۔ یہ تصور برگساں کے ہاں تو ضرور ملتا ہے لیکن قرآن کی رُو سے ایسا تصور غلط ہے۔ قرآن وحی کو ایک الگ خاصہ قرار دیتا ہے جس میں رسول کے علاوہ کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہوتا۔ لہٰذا وحیؔ اور بصیرت مستقلاً دو الگ الگ خاصے ہیں۔ سو اگر رسول کے اجتہادات بذریعہ وحی ہوتے ہیں تو ان میں رسول کی اپنی بصیرت کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور اگر وہ رسول کی بصیرت کا نتیجہ ہوتے ہیں تو وہ وحی نہیں ہوتے۔

مودودی صاحب دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

"قرآن ۲۳ سال کی مدت میں مختلف مواقع پر مختلف حالات اور ضروریات کیمطابق۔ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے اسی طرح احادیث میں حضور کے وہ اقوال جمع کئے گئے ہیں جو ۲۳ سال کے طویل زمانہ میں آپ نے مختلف مواقع پر مختلف حالات میں حسبِ ضرورت ارشاد فرمائے ہیں (صہ ۱۵۹)

لیجئے! یہاں قرآن اور احادیث کا فرق خود سامنے آگیا۔ قرآن ۲۳ سال کے عرصہ میں حضورؐ پر نازل ہوا تھا اور احادیث وہ اقوال ہیں جو رسول اللہ نے حسبِ ضرورت ارشاد فرمائے لیکن آگے چل کر پھر اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اُن آیات میں جس چیز کو وحی کہا گیا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد کتاب اللہ ہے اور کتاب کے سوا کوئی وحی نبی پر نازل نہیں ہوتی لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیاء کرامؑ پر صرف کتاب ہی نازل نہیں کی جاتی بلکہ ان کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ ہمیشہ وحی نازل

کرتا رہتا ہے اور اس وحی کی روشنی میں وہ سیدھی راہ چلتے ہیں (ص ۲۷۴)

پہلے لکھا تھا کہ احادیث وہ اقوال ہیں جو رسول اللہ نے حسب ضرورت ارشاد فرمائے۔ اب فرماتے ہیں کہ نہیں احادیث رسول اللہ کے اقوال نہیں ہیں، بلکہ یہ بھی منجانب اللہ وحی ہیں۔

وحی کی دو قسمیں

مودودی صاحب نے یہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیاء کرام پر صرف کتاب ہی نازل نہیں کی جاتی بلکہ اُن کی ہدایت اور راہ نمائی کے لئے اللہ تعالیٰ ہمیشہ وحی نازل کرتا ہے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس دعوٰی کی دلیل میں آپ نے قرآن سے کون سی سندات پیش کی ہیں۔ سن لیجئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ سے فرمایا کہ ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کرو۔ حضرت یوسفؑ کو خوابوں کی تعبیر بتائی جاتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے طور پر باتیں کی جاتی ہیں جن میں آپ کی بکریوں اور لاٹھی کا تذکرہ بھی ہے۔ پھر حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف بھیجا جاتا ہے اور تمام ہدایات دی جاتی ہیں کہ وہ کس طرح بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر نکل آئیں۔ ان واقعات کے تذکرہ کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

> "کیا ان میں سے کوئی وحی بھی ایسی ہے جو کتاب کی صورت میں ہدایتِ عام کے لئے نازل ہوئی ہو؟ یہ مثالیں اس امر کے ثبوت میں کافی ہیں کہ انبیاء کی طرف اللہ ہمیشہ متوجہ رہتا ہے اور ہر ایسے موقع پر جہاں بشری فکر و رائے کی غلطی کا امکان ہو اپنی وحی سے ان کی راہ نمائی کرتا رہتا ہے اور یہ وحی اُس وحی سے ماسوا ہوتی ہے جو ہدایتِ عام کے لئے ان کے واسطے سے بھیجی جاتی اور کتاب میں درج کی جاتی ہے تاکہ لوگوں کے لئے ایک الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل

کا کام دے۔ (ص ۲۷۵)

سب سے پہلے تو یہ امر دریافت طلب ہے کہ مودودی صاحب کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ باتیں جن کا ذکر انہوں نے فرمایا ہے اُن انبیاء کرامؑ کی کتابوں میں درج نہیں تھیں۔ یہ اُن کا محض قیاس ہے اور قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ چونکہ یہ باتیں اُن انبیائے کرام کی ذات سے متعلق تھیں اور ہدایتِ عام کے لئے نازل نہیں ہوئی تھیں اسلئے انہیں اُن کی کتابوں میں درج نہیں ہونا چاہیئے تھا لیکن دیکھیئے کہ قرآن کریم اس دلیل کی کس طرح تردید کر رہا ہے کئی ایک واقعات ایسے تھے جن کا تعلق نبی اکرمؐ کی ذات سے تھا لیکن بایں ہمہ وہ قرآن میں درج ہیں مثال کے طور پر حضور کی ازواجِ مطہرات کے ضمن میں سورۂ احزاب کی وہ آیات ملاحظہ کیجئے جن میں ارشاد ہے کہ :۔

اے نبیؐ ہم نے تیرے لئے وہ بیویاں جائز کر دیں جنہیں تو نے اُن کے مہر دے دیئے ہیں اور جس کا تیرا دایاں ہاتھ مالک ہوا اس سے جو اللہ نے تجھ پر (کفار سے) لوٹایا اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے تیرے ساتھ ہجرت کی اور مومن عورت اگر وہ اپنے آپ کو نبی کو ہبہ کر دے اگر نبی اس سے نکاح کا ارادہ کرے (۳۳/۵۰)

یہ احکام نبی اکرمؐ کی ذات سے متعلق تھے اِن کے اخیر میں قرآن نے تصریح کر دی تھی کہ :۔ خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ۔ (۳۳/۵۰) یہ صرف تیرے لئے حکم ہے، مومنین کیلئے نہیں۔ غور کیجیئے جس حکم کے متعلق خود اللہ نے تصریح کر دی ہے کہ وہ صرف نبی اکرمؐ کی ذات کے لئے تھا، مومنین کے لئے نہیں تھا، وہ بھی قرآن میں موجود ہے پھر اس کے بعد کی آیات بھی دیکھئے جن میں مذکور ہے کہ اس کے بعد تیرے لئے اور

عورتیں نکاح میں لانا جائز نہیں اور نہ ہی موجودہ بیویوں کی جگہ دوسری بیویاں نکاح میں لانا جائز ہے۔
یہ حکم بھی خاص رسول اللہ کے لئے تھا۔ اسی طرح سورۂ تحریم میں دیکھئے جہاں اللہ نے وہ
واقعہ بھی درج قرآن کر دیا جس میں رسول اللہ کی ایک بیوی نے کوئی راز کی بات دوسری بیوی
سے کہہ دی تھی اور اللہ نے اُن سے کہا تھا کہ تمہیں توبہ کرنی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ بھی
خالص رسول اللہ کے ذاتی معاملات سے متعلق تھا۔ بایں ہمہ یہ بھی درج کتاب ہے تہجد کے متعلق
قرآن کریم نے خود ہی کہہ دیا کہ نافلۃ لک یہ صرف (اے رسول) تیرے لئے اضافہ ہے،
دوسروں کے لئے نہیں یہ حکم جو صرف رسول اللہ کے لئے مختص تھا قرآن میں درج ہے۔
لہٰذا مودودی صاحب کا بیان فرمودہ یہ اصول بھی غلط ہے کہ جو باتیں عام ہدایت کیلئے
نہیں ہوتی تھیں، وہ درجِ کتاب نہیں کی جاتی تھیں۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ ان باتوں سے عام
ہدایت مقصود ہے تو پھر حضرت نوحؑ، حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰ کی جن باتوں کا ذکر
مودودی صاحب نے فرمایا ہے کیا اُن سے عام ہدایت مقصود نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں،
ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق، وہ باتیں ان انبیاء
کرام کی کتابوں میں درج ہونے کے قابل تو تھیں، کیونکہ ان سے ہدایتِ عامہ مقصود نہ تھی۔
لیکن انہی باتوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں درج کر دیا جو قیامت تک کے انسانوں کے
لئے عام ہدایت کی کتاب ہے ایسا تو ہو سکتا تھا کہ کوئی بات انبیائے سابقہ کی کسی کتاب
میں ہوتی اور قرآن میں اسے درج نہ کیا جاتا کیونکہ وہ اُسی زمانہ کے لئے تھی لیکن یہ واقعہ

ؔ واضح رہے کہ ہم اس وقت مودودی صاحب کے پیش کردہ اصول پر بحث کر رہے ہیں،
ورنہ ہمارے نزدیک ہر وہ چیز جو قرآن میں درج ہے نوعِ انسانی کیلئے باعثِ ہدایت ہے۔

عجیب ہے کہ ایسی باتیں جو اُس زمانے کے لوگوں کی ہدایت کے لئے تو نہ تھیں، اس لئے اُن انبیائے کرام کی کتابوں میں درج نہ کی گئیں، انہیں ہزارہا سال بعد قرآن کریم میں درج کر دیا گیا؟ ہم یہ کچھ لکھ رہے ہیں اور ہمارا دل دکھ رہا ہے کہ اِن لوگوں نے کس طرح قرآن کو کھیل بنا رکھا ہے۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ مودودی صاحب کے اس بیان کے مطابق سارا مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

> یہ وحی اُس وحی سے ماسوا ہوتی ہے جو ہدایتِ عام کے لئے انبیاء کی وساطت سے بھیجی جاتی ہے اور کتاب میں درج کی جاتی ہے تاکہ لوگوں کے لئے ایک الٰہی ہدایت نامہ اور دستورالعمل کا کام دے۔

اس سے ظاہر ہے کہ:۔

(i) ایک وحی وہ ہوتی تھی جو ہدایتِ عام کے لئے نہیں ہوتی تھی وہ صرف رسول کی اپنی ہدایت کے لئے ہوتی تھی اس لئے کتاب میں درج نہیں کی جاتی تھی۔ اور

(ii) دوسری وحی ہدایتِ عام کے لئے ہوتی تھی اور کتاب میں درج کی جاتی تھی، تاکہ لوگوں کیلئے الٰہی ہدایت نامہ اور دستورالعمل کا کام دے۔

پہلی قسم کی وحی جس کا تعلق نبیؐ اکرم کی ذات تک تھا حضور کی وفات سے ختم ہو گئی۔ اب نوعِ انسانی کے لئے الٰہی ہدایت نامہ اور دستورالعمل دوسری قسم کی وحی ہے جو قرآن کریم میں درج ہے یہی ہم کہتے ہیں کہ نوعِ انسان کیلئے ہدایت نامہ اور دستورالعمل خدا کی کتاب ہے یہ بحث کہ رسول اللہ کی اپنی ہدایت کے لئے اس سے الگ وحی ہوتی تھی

یا نہیں محض نظری ہے ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے لئے بھی ہدایت نامہ اور دستور العمل یہی قرآن تھا کیونکہ قرآن میں بالتصریح حکم ہے کہ رسول اللہ اسی کا اتباع کریں اور اسی سے ہدایت حاصل کریں لیکن اگر مودودی صاحب قرآن کے اس واضح ارشاد کے علی الرغم یہی ماننے پر ضد کرتے ہیں کہ نہیں! قرآن ہماری ہدایت کیلئے ہے اور رسول اللہ کی ہدایت کے لئے ایک اور وحی ہوتی تھی تو انہیں کون مجبور کر سکتا ہے کہ وہ ضرور قرآن ہی کا ارشاد مانیں! لیکن یہاں تک تو وہ بھی متفق ہیں کہ عام ہدایت کے لئے الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل وہی ہے جو قرآن میں درج ہے۔ وَهُوَ الْمُرَادُ

ہر بات وحی نہیں ہوتی تھی

بہرحال مودودی صاحب کو اصرار ہے کہ رسول اللہ کی ہر بات وحی ہوتی تھی اور وحی کی دو قسمیں ہوا کرتی تھیں آیئے ذرا یہ دیکھیں کہ کیا صحابہ کبارؓ کو بھی اس کا علم تھا کہ رسول اللہ کی ہر بات وحی پر مبنی ہوتی ہے اور وحی کی دو قسمیں ہیں یا وہ بھی اس رازِ درونِ پردہ سے (معاذ اللہ) بے بہرہ تھے نہیں! اور آگے بڑھیئے کہ کیا خود ذاتِ رسالتمآب کو بھی اس حقیقت کا علم تھا کہ حضور کی ہر بات وحی ہوتی ہے اور اس وحی کی دو قسمیں ہیں یا (معاذ اللہ! معاذ اللہ!!) آپ بھی اس سے بے خبر تھے!

مودودی صاحب کے اس دعویٰ کو پھر سے دہرا لیجئے کہ رسول اللہ کی ہر بات وحی ہوتی تھی حضور کوئی بات اپنی طرف سے نہیں فرماتے تھے جو کچھ کرتے تھے، وحی کے مطابق کرتے تھے، اس وحی میں سے ایک حصہ درجِ کتاب ہو جاتا تھا اور دوسرا حصہ ویسے رہنے دیا جاتا تھا اس کے بعد دو چار واقعات کو سامنے لایئے۔

حضرت حباب بن منذر نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی کہ جو مقام انتخاب کیا گیا ہے وحی کی رو سے ہے یا فوجی تدبیر ہے؟ ارشاد ہوا کہ "وحی نہیں ہے" حباب نے کہا تو بہتر ہوگا آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے آپ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اس پر عمل کیا گیا　　(سیرت النبیؐ علامہ شبلی حصہ اول ص ۲۹۵)

مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق (کہ حضور کی ہر بات وحی ہوتی تھی) حضور کا انتخاب مقام وحی کی رو سے تھا لیکن حضرت حبابؓ دریافت فرماتے ہیں کہ آیا یہ انتخاب وحی کی رو سے ہے یا فوجی تدبیر کے مطابق۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت حبابؓ کو اس کا علم نہیں تھا کہ حضورؐ کی ہر بات وحی ہوتی ہے۔ اس پر رسول اللہ فرماتے ہیں کہ نہیں، یہ وحی کی رو سے نہیں ہے اب دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) یا تو (معاذ اللہ) رسول اللہ کو بھی وہ بات معلوم نہ تھی جو مودودی صاحب کو معلوم ہے اور

(۲) اگر رسول اللہ نے سچ فرمایا ہے (اور کون کمبخت ہے جو رسول اللہ کے متعلق بھی یہ گمان کرے کہ (پناہ بخدا) حضور نے سچ نہیں فرمایا تھا) تو پھر جو کچھ مودودی صاحب فرما رہے ہیں اس کے متعلق خود ہی اندازہ فرما لیجئے کہ وہ کیا ہوا؟

اور دیکھئے جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق:-

آنحضرت نے مدینہ میں آکر مشورہ کیا کہ ان کے معاملہ میں کیا کیا جائے۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا کہ سب اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں، فدیہ لے کر چھوڑ دیئے جائیں۔ لیکن حضرت عمرؓ کے نزدیک اسلام کے مسئلہ میں دوست، دشمن، عزیز و بیگانہ، قریب و بعید کی تمیز نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے یہ رائے دی کہ سب قتل کر

دیئے جائیں اور ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو قتل کر دے آنحضرتؐ نے صدیق اکبرؓ کی رائے پسند کی اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔ اس پر خدا کا عتاب آیا اور یہ آیت اتری۔ لَوۡلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۸/۶۸

(اگر خدا کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے کیا اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا) آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ یہ عتابِ ربانی سن کر رو پڑے۔ (ایضاً صفحہ ۲۰۷)

اب دیکھئے کہ مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق بات کیا ہوئی؟

(i) جنگ کے قیدیوں کے متعلق حضور نے صحابہؓ سے مشورہ کیا (اگر رسول کی ہر بات وحی کی رو سے ہوتی تھی تو حضور کو مشورہ کرنے کی کیا ضرورت تھی)۔

(ii) حضور نے مشورہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی رائے پسند فرمائی اور اُسی کے مطابق عمل کیا۔ ظاہر ہے کہ (مودودی صاحب کے بیان کے مطابق) حضور کا یہ عمل وحی کی رو سے تھا۔

(iii) اس پر خدا نے عتاب نازل فرمایا یعنی پہلے تو خود ہی خدا نے وحی کے ذریعہ یہ کہہ دیا کہ حضرت ابوبکرؓ کی رائے اختیار کر لو۔ اور جب آپ نے وہ رائے اختیار کر لی تو پھر آپ پر عتاب نازل کر دیا۔ (معاذ اللہ! معاذ اللہ!)۔

ایک حضرت عائشہؓ کا واقعہ مشہور ہے۔ منافقین کی بہتان طرازی کے بعد آپؐ نے حضرت عائشہ صدیقہ کی درخواست پر انہیں اُن کے میکا بھیج دیا اور خود وحی کا انتظار فرماتے رہے

لہ علامہ شبلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عتاب مال غنیمت کی تقسیم کے متعلق تھا لیکن یہ چیز تو اپنی جگہ پر موجود رہتی ہے کہ حضور کے ایک فیصلہ پر اللہ کی طرف سے ایسا عتاب نازل ہوا کہ حضور رونے لگے۔

اس دوران میں حضور نے لوگوں سے مشورہ بھی کیا چنانچہ قریب ایک ماہ کے بعد جب وحی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی پاک دامنی کی تصدیق کر دی تو حضورؐ نے انہیں بشارت دے دی یعنی مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق پہلے اللہ تعالیٰ نے وحیٔ خفی کے ذریعہ یہ کہہ دیا کہ حضرت عائشہؓ کو ان کے میکا جانے کی اجازت دیدی جائے پھر لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم بھی وحیٔ خفی کے ذریعہ سے دیا اس کے بعد وحیٔ جلی سے اعلان کر دیا کہ حضرت عائشہؓ پاک دامن ہیں!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

اور سنیئے! عرب ایک خاص موسم میں کھجور کے درختوں میں گابھا لگایا کرتے تھے۔ حضور نے ایک مرتبہ فرمایا کہ یوں نہ کرو، یوں کرو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال کھجوروں میں پھل نہ آیا یا بہت کم آیا یعنی یہ تجربہ ناکام رہا۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا کہ:۔

میں نے صرف ایسا گمان کیا تھا تخمینی بات کا مجھ سے مواخذہ نہ کرو لیکن جب میں خدا کی جانب سے کوئی بات بیان کروں تو اس کو اختیار کرو۔ (حجۃ اللہ البالغۃ)

یعنی مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ حضور کی ہر بات وحی کی رو سے ہوتی تھی اور رسول اللہ فرماتے ہیں کہ بعض باتیں میں اپنے گمان کی رو سے کہتا ہوں اور بعض خدا کی جانب سے۔ جو باتیں میں اپنے ظن و تخمین کی بناء پر کہتا ہوں وہ غلط بھی ہو سکتی ہیں۔ انہیں اختیار نہ کیا کرو بلکہ یہاں تک بھی کہ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمُوْرِ دُنْیَاکُمْ۔ دنیاوی معاملات تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔

اور دیکھیئے مقدمات کا فیصلہ رسول اللہ کے اہم فرائض میں سے تھا اگر رسول اللہ کی ہر بات وحی کی رو سے ہوتی تھی تو ظاہر ہے کہ ہر مقدمہ کا فیصلہ جو رسول اللہؐ فرماتے

تھے وحی کی رو سے ہوتا تھا۔ فلہٰذا جھوٹ اور سچ نکھر کر الگ الگ ہو جاتا تھا لیکن سنیئے کہ خود رسول اللہ اس باب میں کیا فرماتے ہیں:۔

حضور نے فرمایا کہ میرے پاس اہلِ مقدمہ آتے ہیں اور ممکن ہے کہ بعض آدمی بہ نسبت دوسروں کے زیادہ چرب زبان ہوں۔ چونکہ میں بھی انسان ہوں اس لئے شاید میں اُس کو سچا جاننے لگوں اور اُس کے موافق فیصلہ دے دوں۔ لہٰذا اگر میں کسی مسلمان کے حق میں ڈگری دیدوں تو اس کو آگ کا ٹکڑا سمجھنا چاہیئے۔ چاہے لے لے چاہے چھوڑ دے۔ (بخاری کتاب المظالم)

رسول اللہ اپنے متعلق یہ فرماتے ہیں اور مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ نہیں! حضور کے تمام فیصلے وحی کی رو سے ہوا کرتے تھے۔

یا مثلاً حضرت زید کا واقعہ دیکھیے جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے نبی اکرم حضرت زیدؓ سے فرماتے ہیں کہ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ ۳۳/۳۷ اپنی بیوی کو طلاق مت دو اس پر حضرت زیدؓ دریافت فرماتے ہیں کہ یہ حکم وحی کا ہے یا آپ کا ذاتی۔ آپ نے فرمایا یہ وحی کا حکم نہیں۔ حضرت زید نے اس حکم کے باوجود اپنی بیوی (حضرت زینبؓ) کو طلاق دیدی اور اس سے نہ خدا ناراض ہوا نہ خدا کا رسول، ورنہ ظاہر ہے کہ وحی کے حکم کی اس طرح کھلی ہوئی مخالفت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

یا اذان کا واقعہ لیجیے صلوٰۃ کے لئے "منادی" کا ذکر قرآن میں موجود ہے لیکن اس کی تصریح نہیں کہ منادی کس انداز کی ہوگی؟ مروجہ اذان کس انداز سے اختیار کی گئی۔ رسول نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ کسی نے کچھ مشورہ دیا کسی نے کچھ۔

آنحضرت نے کسی مشورہ کو پسند نہ فرمایا۔ دوسرے دن حضرت عمر فاروقؓ نے آکر عرض

کیا کہ انہوں نے خواب میں ان الفاظ کو سنا ہے جو اب اذان میں کہے جاتے ہیں۔
نبیٔ اکرم نے انہی الفاظ کو آوازِ بلند پکارنے کو فرمادیا۔

(رحمۃ اللعالمین حصہ اول صفحہ ۲۱۴)

غور فرمائیے اذان کا معاملہ کوئی نجی معاملہ نہیں بلکہ خالص دین کا معاملہ ہے۔ اس کے لئے وحیٔ خفی کچھ نہیں بتاتی۔ نبیٔ اکرم صحابہؓ سے مشورہ فرمانے ہیں پہلے روز کوئی موزوں بات سامنے نہیں آتی تو معاملہ کو ملتوی کر دیا جاتا ہے پھر دوسرے روز حضرت عمرؓ کی رائے کو اختیار کرلیا جاتا ہے اس کے باوجود مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ کی ہر بات وحی کی رو سے ہوتی تھی۔

یہ سوال کہ اگر رسول اللہ کی ہر بات وحی کی رُو سے ہوتی تھی تو آپ صحابہؓ سے مشورے کیوں کیا کرتے تھے بڑا اہم ہے واضح رہے کہ یہ مشورہ محض آپ کی مرضی پر منحصر نہ تھا، بلکہ خدا نے حکم دیا تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو یعنی اللہ تعالیٰ رسول اللہ کو حکم دیتے ہیں کہ معاملات باہمی مشاورت سے طے کیا کرو رسول اللہ اس حکم کے مطابق صحابہؓ سے برابر مشورہ فرماتے رہتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان باتوں میں نہ خدا کی طرف سے وحی ہوتی تھی نہ رسول اللہ اپنی بات کو وحی سمجھتے تھے اس لئے کہ اگر رسول کی ہر بات وحی ہوتی تو پھر مشورہ سے کیا مطلب؟
لیکن دیکھئے مودودی صاحب اس باب میں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

بلاشبہ رسول اللہ کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا مگر وہ اس لئے تھا کہ آپ اپنی امت کیلئے مشاورت کا نمونہ پیش کریں اور خود اپنے عمل سے جمہوریت کے صحیح اصول کی طرف راہنمائی کریں اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ آپ کی

حیثیت دوسرے امراء کی سی ہے۔ دوسرے امراء کے لئے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے
کہ وہ مشورہ سے کام کریں۔ (وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ [۲۲]) اور یہ کہ اگر اہلِ شوریٰ
میں نزاع ہو تو وہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کریں فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ
فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ [۵۹] لیکن رسول اللہ کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے،
وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جب آپ کسی بات کا عزم فرمالیں تو پھر خدا پر بھروسا
کر کے عمل کا اقدام فرمائیے۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ [۳/۱۵۸] اس سے صاف
معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے بلکہ آپ کو مشورہ کا حکم صرف اس
لئے دیا گیا تھا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح جمہوری طرزِ حکومت کی بنیاد
پڑ جائے۔ (ایضاً ص ۴۹۵)

سردست ان تمام مباحث کو الگ رکھ دیجئے کہ آپ کی اور دیگر امراء کی حیثیت میں کیا
فرق تھا۔ فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول [۵۹] کا صحیح مفہوم کیا ہے،
فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ [۳/۱۵۸] سے کیا مراد ہے؟ اس وقت صرف اس توجیہ کو لیجئے
جو مودودی صاحب کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔ یہ واضح ہے کہ:-

(i) اللہ تعالیٰ نے رسول کو حکم دیا کہ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کیا کرو
(ii) رسول اللہ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ فرماتے رہے۔
(iii) ان مشوروں پر عمل ہوتا رہا۔
(iv) بعض باتیں جو مشورہ کی رو سے اختیار کی گئیں اللہ کی منشا کے مطابق نہ نکلیں،
اس لئے خدا کی وحی نے ان پر تنبیہ کی لیکن مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ حضور مشاورت
کے محتاج نہ تھے یہ حکم محض اس لئے دیا گیا تھا کہ آپ کے ہاتھوں جمہوریت کی بنیاد رکھ

لہ ان آیات کی تشریح کے لئے دیکھئے "اسلامی نظام" شائع کردہ طلوعِ اسلام ٹرسٹ۔

دی جائے سوال یہ نہیں کہ آپ مشورہ کے محتاج تھے یا نہیں، سوال یہ ہے کہ آپکو مشورہ کو حکم دیا گیا تھا یا نہیں۔ آپ مشورہ کیا کرتے تھے یا نہیں! اگر ان باتوں کا جواب اثبات میں ہے تو پھر اس الجھن کا کیا حل ہے کہ رسول اللہ کی ہر بات وحی ہوتی تھی لیکن آپ کیا وہ کرتے تھے جو مشورہ سے طے پاتا تھا ان دونوں باتوں میں کوئی ربط، کوئی تعلق کوئی واسطہ بھی ہے؟ غالباً مودودی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے لیکن (معاذ اللہ) محض دکھانے کے لئے مشورہ فرما لیا کرتے تھے تاکہ اُمت میں طرزِ جمہوری کی بنیاد آپ کے مبارک ہاتھوں سے پڑ جائے لیکن پھر وہی دشواری سامنے آجائے گی کہ :-

(۱) اگر آپ (معاذ اللہ) محض دکھانے کے لئے مشورہ فرمایا کرتے تھے (تاکہ جمہوریت کی بنیاد رکھ دی جائے) تو پھر ایسا مشورہ قبول کیوں فرماتے تھے جس پر وحی کی رو سے تنبیہہ بھی آجاتی تھی اور

(۲) اگر آپ صحیح معنوں میں مشورہ فرماتے تھے اور مشورہ قبول بھی کرتے تھے حالانکہ بعض اوقات وہ مشورہ منشائے خداوندی کے خلاف بھی ہوتا تھا تو پھر یہ دعوٰی کس طرح صحیح ہوگا کہ آپ کی ہر بات وحی ہوتی تھی؟

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کی یہ توجیہہ نہ صرف یہ کہ کس قدر بے معنی ہے بلکہ یہ بھی کہ اس سے خود خدا اور اُس کے رسول کے متعلق کیا تصور ذہن میں قائم ہوتا ہے؟

بہرحال مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ :-

(۱) ایک قسم کی وحی سے اللہ تعالیٰ دین کے اصولی احکام نازل کیا کرتا تھا اور یہ وحی کتاب میں درج ہو جاتی تھی اور

(۲) اس کے بعد دوسری قسم کی وحی سے ان احکام کی تفاصیل نازل کیا کرتا تھا لیکن یہ وحی کتاب میں درج نہیں ہوتی تھی اگرچہ یہ بالکل قرآن کے ہم پایہ اور اس کے مثل ہوتی تھی۔

(۳) یہ سب کچھ یعنی تدوین جزئیات وحی کی رو سے بہ حیثیت رسالت ہوتا تھا اور چونکہ حضور کی اطاعت شرطِ اسلام ہے اس لئے ان تمام امور کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہے۔

وحیٔ خفی قرآن میں کیوں نہ رکھ دی گئی؟

یہاں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت لاحق ہوئی کہ اس نے اپنی وحی کو اس طرح دو حصوں میں تقسیم کر دیا جب دونوں چیزیں (اصول اور ان کی تفاصیل) منجانب اللہ تھیں۔ ایک ہی رسول پر نازل ہوتی تھیں اور دین ان دونوں کے مجموعہ کا نام تھا دونوں کو قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہنا تھا تو انہیں ایک ہی جگہ (قرآن میں) کیوں نہ رکھا گیا۔ مودودی فرماتے ہیں کہ تم نہیں جانتے کہ اس میں کتنی بڑی اللہ تعالیٰ کی مصلحت پوشیدہ تھی سنو!

آپ پوچھتے ہیں کہ تفصیلاتِ نماز وغیرہ جو غیر از قرآن ہیں کیوں فریضۂ اولین قرار دی جائیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ کی بتائی ہوئی تفصیلاتِ نماز وغیرہ کو غیر از قرآن کہنا ہی سرے سے غلط ہے اگر کوئی ماہرِ فنِ طبیب فنِ طب کے کسی قاعدے

کو عملی تجربہ کر کے شاگردوں کو سمجھائے تو آپ اسے خارج از فن نہیں کہہ سکتے۔ اگر کوئی پروفیسر اقلیدس کے کسی مسئلہ کو شکلیں کھینچ کر تشریح و تفصیل کے ساتھ سمجھائے تو آپ اسے غیر از اقلیدس نہیں کہہ سکتے۔ ہر علم و فن کی اصولی کتابوں میں صرف اصول اور مہماتِ مسائل بیان کر دیئے جاتے ہیں اور عملی تفصیلات استاد کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ کیونکہ استاد عملی مظاہرہ سے جس بات کو چند لمحوں میں بتا سکتا ہے، اُسی کو اگر الفاظ میں بیان کیا جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں اور پھر بھی شاگردوں کے لیے لفظی بیان کے مطابق ٹھیک عمل کرنا مشکل ہو جائے۔ پھر کتاب کے حُسنِ کلام اور اس کے کمالِ ایجاز کا غارت ہو جانا مزید برآں۔ یہ حکیمانہ قاعدہ جس کو معمولی انسان تک اپنے علوم و فنون کی تعلیم میں ملحوظ رکھتے ہیں، آپ کی خواہش ہے کہ وہ سب سے بڑا حکیم جس نے قرآن نازل کیا ہے، اس کو نظر انداز کر دیتا۔ آپ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں نماز کے اوقات کا نقشہ بتاتا، رکعتوں کی تفصیل بتاتا، رکوع و سجود و قیام کی صورتیں تفصیل کے ساتھ بیان کرتا، بلکہ نماز کی رائج الوقت کتابوں کی طرح ہر صورت کی تصویر بھی مقابل کے صفحات پر بتا دیتا۔ پھر تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام تک نمازوں میں جو کچھ پڑھا جاتا وہ بھی لکھتا اور اس کے بعد وہ مختلف جزئی مسائل تحریر کرتا جن کے معلوم کرنے کی ہر نمازی کو

لہ لیکن آپ اسے اقلیدس کی تصنیف بھی قرار نہیں دے سکتے۔ اقلیدس کی طرف سے وہی ہے جو اس نے اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے۔

لہ یا یوں ہم مصنف، مصنف رہتا ہے اور استاد، استاد۔

ضرورت ہے۔ اس طرح قرآن کے کم ازکم دو تین پارے صرف نماز کے لئے مخصوص ہو جاتے۔ پھر اسی طور پر دو دو تین تین پارے روزہ، حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی مسائل پر بھی مشتمل ہوتے۔ اس کے ساتھ شریعت کے دوسرے معاملات بھی جو قریب قریب زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں جزئیات کی پوری تفصیل کے ساتھ درج کتاب کردیئے جاتے۔ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ آپ کی یہ خواہش تو پوری ہو جاتی کہ شریعت کا کوئی مسئلہ غیر از قرآن نہ ہو لیکن اس سے قرآن مجید کم ازکم انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا اور وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوئے ہیں۔" (صد ۳۴۳-۳۴۶)

غور فرمایا آپ نے اللہ تعالیٰ کی اس "حکمت بالغہ" پر جس کی رو سے اُس نے اپنی وحی کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا اور مسلمانوں کو اُس بوجھ سے بچا لیا جو اس تمام وحی کو ایک جلد (ONE VOLUME) میں منضبط کرنے سے انہیں اٹھانا پڑتا۔ مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق مسلمانوں کو اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اُس نے اپنی ساری وحی کو ایک ہی جلد میں درج نہیں کر دیا۔ ورنہ یہ ضعیف و ناتواں بندے اس کے بوجھ سے دب کر مر جاتے!

جی تو چاہتا ہے کہ مودودی صاحب کی بیان کردہ "حکمت بالغہ" کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے لیکن عدم گنجایش تفصیل و اطناب سے مانع ہے۔ اس لئے اختصار پر قناعت کی جاتی ہے۔ قرآن میں (مثلاً) جتنی مرتبہ صلوٰۃ کی تاکید کی گئی ہے اگر ان تمام مقامات کو یکجا کیا جائے تو وہ ایک پارہ کے حجم سے کم نہ ہوں گے۔ اس تاکید کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے ضخامت کا خیال نہ کیا لیکن اس کی جزئیات کو اس لئے چھوڑ دیا کہ اس سے ضخامت بڑھ جانے کا ڈر تھا۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ کی

جزئیات تو بیان نہ فرمائیں لیکن وضو کی تفصیل درجِ کتاب کر دی۔ اسی طرح زکوٰۃ کے متعلق دیکھئے تاکیدی احکام کو اکٹھا کیجیے تو ایک اچھی خاصی سورت سے کم نہ ہوں گے لیکن سارے قرآن میں اس کے نصاب کا ذکر تک نہیں ان کے برعکس نکاح طلاق، عدت وغیرہ کے احکام دیکھیے تو چھوٹی چھوٹی سی تفاصیل بھی قرآن میں موجود ہیں حتیٰ کہ بچے کو دودھ پلانے کی مدت تک بھی۔ معاشرتی احکام کو دیکھیے تو اس قسم کے امور کی تفاصیل بھی موجود ہیں کہ گھروں میں کس طرح آنا چاہیے کہ کس کس کے ہاں سے کھانا چاہیے۔ باہر والوں کو آواز کس طرح دینی چاہیے۔ اندر سے چیزیں کس طرح مانگنی چاہئیں مجلس میں کس طرح بیٹھنا چاہیے کس کے ہاں کھانا کھا کر جلدی اٹھ جانا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے برعکس ایسے ایسے اہم معاملات کی تفاصیل نہیں نہیں دی گئیں کہ امیر امت کا انتخاب کس طرح ہونا چاہیے۔ مشاورت کا طریق کیا ہونا چاہیے۔ حکومت کی شکل کس انداز کی ہونی چاہیے۔ اور دیکھیے قرآن میں زنا اور سرقہ کی سزاؤں کا ذکر موجود ہے لیکن شراب کی سزا کہیں متعین نہیں کی گئی۔ سوچیے کہ اس سے قرآن کی ضخامت پر کیا اثر پڑ جاتا یا مثلاً قرآن میں ہے کہ ہر شخص اپنے مال میں وصیت کر سکتا ہے لیکن احادیث کی رو سے یہ وصیت صرف تہائی حصہ میں ہو سکتی ہے۔ مودودی صاحب کے ارشاد کی رو سے اگر "تہائی حصہ" کے الفاظ قرآن میں درج کر دیئے جاتے تو اس کی ضخامت بڑھ جاتی یا مثلاً قرآن میں زانیہ اور زانی کی سزا سو سو کوڑے ہیں لیکن حدیث میں ہے کہ شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ سوچیے کہ اتنے الفاظ کے اضافہ سے قرآن کا حجم کس قدر بڑھ جاتا! مودودی صاحب احکام کی تفصیل سے گھبراتے ہیں لیکن قرآن کے ایجاز کا تو یہ اعجاز ہے کہ اس نے وراثت کے احکام چار آیات

میں درج کر دیئے ہیں اور اس جامعیت کے ساتھ کہ وراثت کے متعلق کوئی تفصیل ایسی نہیں جو ان چار آیتوں میں سمٹ کر نہ آگئی ہو لیکن انہی چار آیتوں کی تفصیل جب روایات کی رو سے ہوئی تو سب سے پہلے یہ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ) چوتھی جماعت کے طالب علم جتنا حساب بھی نہیں آتا۔

ہم نے بغرضِ اختصار یہ چند مثالیں اس ضمن میں پیش کر دی ہیں کہ مودودی صاحب کی یہ توجیہہ کہ ان تفصیلی احکام کو اس لئے درجِ قرآن نہیں کیا کہ اس سے ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا کس قدر طفلانہ ہے پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب قرآن اور حدیث دونوں وحی ہیں تو قرآن کو مختصر رکھنے سے فائدہ کیا ہوا جب اس کا دوسرا حصہ (احادیث) اس قدر ضخیم ہو گیا؟

مودودی صاحب کی توجیہہ کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمام تفاصیل بھی درجِ قرآن کر دیتا تو وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوتے ہیں یہی ہم کہتے ہیں کہ جب آپ لوگوں نے قرآن کے اصولی احکام کی تمام تفاصیل بھی منزل من اللہ (وحی) قرار دیدیا تو اس سے وہ تمام فوائد باطل ہو گئے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوتے تھے۔ وہ فوائد یہی تھے کہ قرآن اصولی کتاب تھا جس کی فروعات زمانہ کے ساتھ ساتھ ضرورت کے مطابق بدلتی رہتی تھی۔ جب آپ نے ان فروعات کو بھی وحی قرار دے کر قیامت تک کے لئے غیر متبدل ٹھہرا دیا تو قرآن کو کتابِ اصول رکھنے کے تمام فوائد باطل ہو گئے۔ لیکن مودودی صاحب کی منطق ملاحظہ ہو کہ اگر وحی (جلد اوّل)

اور وحی (جلد دوم) کو الگ الگ دو جلدوں میں رکھا جائے تو تمام فوائد برقرار رہ جاتے ہیں۔ لیکن اگر دونوں جلدوں کو یکجا کر دیا جاتا تو یہ تمام فوائد باطل ہو جاتے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

واضح رہے کہ مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق قرآن کے اصول اور رسول اللہ کی بیان فرمودہ تفاصیل، دونوں منزل من اللہ (وحی) ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کو الگ الگ رکھنا ایسا ہی ہے جیسے ضخامت بڑھ جانے کے خوف سے ایک کتاب کو دو جلدوں (TWO VOLUME) میں شائع کر دیا جائے۔ ایک جلد میں اصول ہیں اور دوسری جلد میں ان اصولوں کی تفصیلات۔ دونوں منزل من اللہ یا مودودی صاحب کے الفاظ میں، ایک تصنیف ہے اور دوسری اس تصنیف کی استادانہ شرح۔ لیکن یہ شرح بھی منجانب اللہ ہے۔ عدم گنجائش پھر مانع ہے کہ ہم شرح و بسط سے بتا سکیں کہ اس تصنیف اور اس کی شرح میں کس قدر باہمی تضاد ہے؟ سردست چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

وحی جلی اور وحی خفی میں تضاد

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے تصنیف (قرآن کریم) میں ہے کہ زانی مرد اور زانی عورت میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے بطور سزا لگاؤ۔ لیکن اس کی شرح (حدیث) کہتی ہے کہ نہیں، زانی اور زانیہ اگر غیر شادی شدہ ہیں تو کوڑے لگاؤ اور اگر شادی شدہ ہیں تو انہیں سنگسار کرو۔

وحی جلی (قرآن) کہتا ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کر دو یا بطور احسان لیکن اس کے بعد اسی کی طرف سے وحی خفی آتی ہے کہ نہیں! جنگ کے قیدیوں کو غلام بناؤ اور اُن کی عورتوں کو لونڈیاں اور ان لونڈیوں کو بلا حد و شمار اپنے حرم میں

داخل کر لو۔

وحیٔ جلی (قرآن) کہتا ہے کہ انسان کو ضمیر کی آزادی حاصل ہے جس کا جی چاہے اسلام سے آئے جس کا جی چاہے کفر اختیار کر لے لیکن وحیٔ خفی کہتی ہے کہ نہیں! اگر کوئی مسلمان اسلام چھوڑ دے تو اس کی سزا قتل ہے۔

وحیٔ جلی کہتی ہے اور بار بار کہتی ہے کہ تم اپنے مال کو وصیت کی رو سے تقسیم کر سکتے ہو لیکن وحیٔ خفی کہتی ہے کہ یہ وصیت صرف ایک تہائی میں ہو گی اور وہ بھی وارث کے لئے نہیں۔

وحیٔ جلی کہتی ہے کہ یتیموں کا خاص طور پر خیال رکھا کرو لیکن وحیٔ خفی کہتی ہے کہ اگر کوئی بچہ اپنے دادا کی زندگی میں یتیم ہو جائے تو اسے دادا کی میراث میں سے ایک پائی بھی نہ دو تمام کی تمام جائداد ان بچوں کو دے دو جن کا باپ زندہ ہے۔

وحیٔ جلی کہتی ہے کہ یہ چار چیزیں ہیں جنہیں خدا نے حرام قرار دیا ہے لیکن وحیٔ خفی حرام اور حلال کی طویل طویل فہرستیں مرتب کر کے دیتی ہے۔

وحیٔ جلی کہتی ہے کہ خدا نے رسول اللہ کو صرف قرآن بطور معجزہ دیا ہے۔ دین کی تبلیغ علیٰ وجہ البصیرت ہو گی، حسی معجزات کی بناء پر نہیں۔ وحیٔ خفی کہتی ہے کہ رسول اللہ کو سینکڑوں (بلکہ ہزاروں) حسی معجزات عطا ہوئے تھے۔

وحیٔ جلی کہتی ہے کہ اللہ کے رسول سچے ہوتے ہیں وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے لیکن وحیٔ خفی کہتی ہے کہ یہ غلط ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا اور جھوٹ بھی ایسا کہ جس کے احساس سے وہ (معاذ اللہ) روزِ محشر خدا کے حضور جانے سے نادم ہوں گے۔

وحی جلی کہتی ہے کہ خدا کی کتاب (قرآنِ کریم) کا ہر حکم اپنی جگہ محکم مستقل اور ابدی ہے لیکن وحی خفی کہتی ہے کہ نہیں، اس میں بہت سے احکام ایسے ہیں جو منسوخ ہو چکے ہیں اور یوں ہی برائے وزنِ بیت اس میں رہنے دیئے ہیں۔

وحی جلی کہتی ہے کہ خدا کی کتاب بالکل محفوظ ہے لیکن احادیث کہتی ہیں کہ ایسی آیات (مثلاً آیتِ رجم) بھی ہیں جو پہلے قرآن میں ہوا کرتی تھیں لیکن بعد میں اس میں نہ رہیں۔

ان چند مثالوں سے آپ اندازہ فرمالیجئے کہ وحی جلی اور وحی خفی کا باہمی تعلق کیا ہے یعنی خدا پہلے ایک حکم دیتا ہے کہ اسے قرآن میں درج کرلو اور اس کے بعد اس کے خلاف حکم دے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اسے قرآن میں درج مت کرنا۔ الگ رکھنا لیکن عمل اسی پر کرنا۔

ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہمارا کلیجہ کانپ رہا ہے کہ اس قسم کے دین کے متعلق دنیا کیا اندازہ لگاتی ہوگی۔ مودودی صاحب اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہیں ذرا غور سے سنیئے۔ دریافت کیا گیا کہ اگر رسول اللہ کی متعین فرمودہ جزئیات عین دین ہیں اور قیامت تک کیلئے غیر متبدل تو یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں (مثلاً) نماز کی جزئیات میں فرق ہے اور یہ فرق خود روایات کی رُو سے ہے تو آج اس امر کا پتا کس طرح لگایا جائے کہ ان میں سے کون سی چیز رسول اللہ کی متعین فرمودہ ہے اس کے جواب میں آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ اختلاف اس امر کا پتا دیتا ہے کہ مختلف لوگوں نے مختلف اوقات میں حضور کا عمل مختلف دیکھا چونکہ یہ امور نماز میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے اور ان میں سے کسی کے کرنے یا کسی کے نہ کرنے سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اور حضور خود صاف

شریعت تھے اس لئے آپ جس وقت چاہتے تھے عمل فرماتے تھے لیکن حضور کے سوا کوئی اور شخص چونکہ صاحبِ شریعت نہ تھا اور نہ اس کا کام اتباع تھا نہ کہ تشریع، اس لئے ہر دیکھنے والے نے آپ کو جیسا فعل کرتے دیکھا اس کی پیروی کی اور اسی کی پیروی کے لئے لوگوں سے کہا۔" (صا۳۳)

مودودی صاحب پہلے فرما چکے ہیں:-

(i) آنحضرت جس وقت جس حالت میں جو کچھ بھی کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے (صا۲۴۳)

(ii) رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ (صا۲۴۳)

(iii) آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ (صا۲۴۴)

اس کے بعد مودودی صاحب کے اقتباسِ بالا کو ملاحظہ فرمایئے جس میں ارشاد ہوتا ہے کہ۔

(i) رسول اللہ کا مختلف اوقات میں مختلف عمل ہوتا تھا۔

(ii) اس قسم کے اختلافی امور نماز میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

(iii) اس لئے جس نے جس طرح دیکھا اسی طرح پیروی کرنے لگ گیا۔

اگر رسول اللہ کا ہر فعل وحی کی رو سے اور رسول کی حیثیت سے ہوتا تھا تو اس سے لازم آیا کہ ایک وقت میں وحی کی رُو سے جزئیات کسی طرح متعین ہوا کرتی تھیں اور دوسرے وقت میں کسی اور طرح لیکن اس کے ساتھ ہی مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ آپ صاحبِ شریعت تھے جس وقت جیسا چاہتے تھے عمل فرماتے تھے اگر حضور جیسا چاہتے تھے عمل فرماتے تھے" تو پھر ان اعمال میں وحی کا کیا دخل ہوتا تھا۔؟ پھر مودودی صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ اختلافی امور نماز میں خاص اہمیت نہیں

رکھتے تھے یعنی یہ تمام امور منجانب اللہ ہوتے تھے اور حضور بحیثیت رسول ان امور کو ادا فرماتے تھے لیکن بایں ہمہ یہ امور نماز میں خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ سوچیئے کہ یہ کس قسم کا دین ہے؟

اس کے بعد یہ چیز بھی غور طلب ہے کہ مودودی صاحب کو یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ نماز میں فلاں فلاں بات تو اہمیت رکھتی ہے اور فلاں فلاں بات خاص اہمیت نہیں رکھتی! اسے کہتے ہیں۔ تلاعب بالدین، یعنی دین کے ساتھ کھیلنا۔

اب اسی ضمن میں ایک اور بات دیکھئے اور سوچئے کہ اسے کیا کہا جائے۔

حدیث شرح نہیں مستقل دین ہے

مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ قرآن اصول کی کتاب ہے اور احادیث ان اصولوں کی تشریح اور تفصیل ہیں۔ اس کے مقابل میں مودودی صاحب کے اس دعویٰ کو سامنے لائیے جس سے اس بحث کا آغاز ہوا ہے یعنی ان کا یہ ارشاد کہ:۔

> حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسّر کی ہے یعنی وہ انہی مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً ذکر قرآن میں آگیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے...... مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔
>
> (ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۰ء)

یعنی ایک جگہ کہتے ہیں کہ قرآن کتاب اصول ہے اور ان اصولوں کی شرح و تفسیر احادیث ہیں۔ لیکن دوسری جگہ کہتے ہیں کہ نہیں! احادیث کی حیثیت شرح و تفسیر کی نہیں۔ مسائل و احکام

میں ان کی حیثیت ایک مستقل ماخذ کی ہے کیا دین کے ایسے اہم بنیادی معاملہ میں ایسے متضاد تصورات کہیں اور بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ کتنی بڑی جرأت ہے ان لوگوں کی؟

اب آگے بڑھیئے۔ وحی کی ان دو قسموں کے تذکرہ کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

حفاظتِ حدیث

جب یہ دونوں چیزیں رسول اللہ کے اتباع اور آپ کے نمونۂ حیات کی تقلید کے ساتھ وابستہ ہیں تو لازم ہوا کہ سیرت نبویؐ کے وہ پاک نمونے اور زبانِ وحی ترجمان کے وہ مقدس احکام بھی قرآن کے ساتھ ساتھ باقی رہیں جن سے رسول اللہ کے ہم عہد لوگوں نے ہدایت پائی تھی، ورنہ بعد کی نسلوں کے لئے ہدایت ناقص رہ جائے گی۔ (ص۲۹۴)

اس سے ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ سنتِ رسول اللہ کا رہنا قطعاً ناگزیر اور ضروری ہے۔ (ص۲۹۶)

چنانچہ اس کے لئے:۔

جس خدا نے اپنی آخری کتاب کی حفاظت کا غیر معمولی انتظام کیا ہے اُس نے اپنے آخری نبیؐ کے نقوشِ قدم اور آثارِ ہدایت کی حفاظت کے لئے بھی وہ انتظام کیا ہے جو اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ (ص۳۱۷)

یعنی:۔

(۱) کتاب اللہ کے ساتھ احادیث کا رہنا قطعی ناگزیر ہے۔

(۲) اگر احادیث ساتھ نہ رہیں تو بعد کی نسلوں کے لئے ہدایت ناقص رہ جاتی ہے۔

(۱۱) اس لیے اللہ تعالیٰ نے جس طرح قرآن کی حفاظت کا انتظام کیا اسی طرح احادیثِ رسول کی حفاظت کا بھی انتظام کر دیا۔

———(•)———

یہ ٹھیک ہے! اللہ تعالیٰ کو ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔ قرآن اور احادیث دونوں اُسی کی کتاب کی دو جلدیں، اُسی کی وحی کے دو حصّے اور اُسی کے دین کے گوشے تھے وہ ایسا کس طرح سے کر سکتا تھا کہ ان میں سے ایک حصّے کی حفاظت کا تو انتظام کر دیتا اور دوسرے حصّے کو ایسے ہی چھوڑ دیتا! اللہ تعالیٰ نے یہ عدیم النظیر انتظام کس طرح سے فرمایا، اس کی تفصیل مودودی صاحب نے خود ہی بیان فرما دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

(اُس زمانہ میں) ضبط اور نقل کا ذریعہ جو کچھ بھی تھا وہ لوگوں کا حافظہ اور زبانیں تھیں۔ قدیم زمانہ میں نہ صرف عرب بلکہ تمام قوموں کے پاس واقعات کو محفوظ رکھنے کا اور بعد کی نسلوں تک پہنچانے کا یہی ایک ذریعہ تھا، مگر عرب خصوصیت کے ساتھ اپنے حافظہ اور صحتِ نقل میں ممتاز تھے۔ (ص ۲۹۷)

اس سے واضح ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک قرآن کی حفاظت کا انتظام بھی صرف حافظہ کی رُو سے کیا گیا تھا۔ قرآن کہیں لکھا ہوا موجود نہ تھا[1] اس لئے کہ اُس زمانہ میں ضبط و نقل کا ذریعہ ہی حافظہ تھا۔ دوسرا کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔

غلط احادیث

بہت اچھا! اللہ تعالیٰ نے احادیث کی حفاظت کا انتظام یہ

---

[1] لیکن قرآن کریم صرف حافظوں میں محفوظ نہیں تھا کتاب کی صورت میں لکھا ہوا موجود تھا اور گھر گھر اس کی تلاوت ہوتی تھی۔

کیا کہ انہیں لوگوں کے حافظہ میں محفوظ کرا دیا اب آگے بڑھیئے فرماتے ہیں :۔

صداقت کے ساتھ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ پہلی صدی کے آخر سے حدیث کے ذخیرے میں ایک حصہ ایسی روایات کا بھی داخل ہونے لگا تھا جو موضوع تھیں۔ اور یہ کہ بعد کی نسلوں کو جو احادیث پہنچیں اُن میں صحیح اور غلط اور مشکوک سب قسم کی ملی جلی تھیں۔ (صا)

یہ ہوا نتیجہ اُس عدیم النظیر انتظام کا جو اللہ تعالیٰ نے احادیث کی حفاظت کے لئے اختیار فرمایا تھا خدائی انتظام ! آخر خدائی انتظام ہی ہوتے ہیں ! اللہ تعالیٰ نے احادیث کی حفاظت کا انتظام اس لئے فرمایا تھا کہ :۔

اگر احادیث محفوظ نہ رہیں تو آنے والی نسلوں کے لئے ہدایت ناقص رہ جائیگی

اور ہوا یہ کہ :۔

پہلی ہی صدی کے بعد آنے والی نسلوں کو جو احادیث پہنچیں ان میں صحیح اور غلط اور مشکوک سب قسم کی حدیثیں ملی جلی تھیں۔

دیکھا آپ نے کہ اللہ نے اپنی ہدایت کو قیامت تک کے انسانوں کے لئے کس طرح محفوظ رکھا اس کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ :۔

(۱) یہ بالکل صحیح ہے کہ احادیث اس حد تک محفوظ نہیں جس حد تک قرآن مجید ہے اور

(۲) یہ بات ناقابلِ انکار ہے کہ علم کا جیسا مستند اور معتبر ذریعہ قرآن مجید ہے ویسا مستند اور معتبر ذریعہ حدیث نہیں ہے۔ (صـ۲۸-۳۲۹)

یہ وہی احادیث ہیں جن کے متعلق ابھی ابھی ارشاد ہوا تھا کہ :۔

رسول اللہ نے جو کچھ استاد کی حیثیت سے بتایا اور سکھایا ہے وہ بھی اسی

طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے اس کو غیر از قرآن کہنا صحیح نہیں ہے۔ (ص ۳۳۶)

اور اللہ نے جن کی حفاظت کا ایسا انتظام کیا تھا" جو اپنی نظیر آپ تھا"

مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ عربوں کا حافظہ بہت قوی تھا اس لئے انہوں نے احادیث کو حفظ کر لیا اور یہی حفظ کردہ احادیث آگے منتقل ہوئیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے ارشادات بلفظہٖ حفظ کر لئے جاتے تھے اور وہی الفاظ آگے منتقل ہوتے چلے جاتے تھے۔ یا رسول اللہ جو کچھ کرتے تھے وہ سب کچھ اسی طرح نقل ہوتا چلا جاتا تھا لیکن ذرا آگے چل کر وہ خود ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ احادیث کے اختلاف کی وجہ کچھ اور بھی لکھتے ہیں:۔

بادی النظر میں یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہیئے جن کے دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں ان میں اختلاف نہ پایا جانا چاہیئے لیکن ہر شخص بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو، یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو اس کو نقل کرنے یا اُس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس قدر متفق نہیں ہو سکتے کہ اُن کے درمیان ایک سر مو فرق نہ پایا جاتے اس واقعہ یا اس تقریر کے اہم اجزاء میں تو سب کے درمیان تو ضرور اتفاق ہوگا مگر فرعی اُمور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائے گا اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش نہیں آیا۔ مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد

ہی (مہینوں اور برسوں بعد نہیں بلکہ چند ہی گھنٹے بعد) لوگوں سے پوچھ لیجئے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا کوئی کسی ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملہ کو لفظ بلفظ نقل کرے گا کوئی اُس مفہوم کو جو اُس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کر دے گا۔ کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا تو تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کر دے گا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح ادا نہ کر سکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہو گا اور وہ تقریر کے اکثر حصے لفظ بلفظ نقل کر دے گا۔ کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی اور وہ نقل اور روایات میں غلطیاں کرے گا۔ (ص ۲۲۹ - ۲۳۰)

یہ دوسری مثال ہے اس عدیم النظیر انتظام کی جو اللہ تعالےٰ نے اپنی وحی کے اس حصہ کو محفوظ رکھنے کے لئے اختیار فرمایا :-

بہرحال مودودی صاحب کو تسلیم ہے کہ احادیث کے جو مجموعے مرتب ہوئے ان میں (اللہ تعالےٰ کی تمام کوششوں کے باوجود) موضوع اور مشکوک احادیث بھی شامل ہو گئیں اس کے بعد اللہ تعالےٰ کے انتظام کی تیسری کڑی سامنے آتی ہے یعنی ائمہ جرح و تعدیل نے ان احادیث کو پرکھا اور معتبر اور غیر معتبر احادیث کو الگ الگ کر دیا۔ نقدِ احادیث کے اس کارنامہ کو اسلام کی تاریخ میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور انہی ائمہ جرح و تعدیل کے فیصلوں کے مطابق احادیث کو قوی اور ضعیف تسلیم کیا جاتا ہے لیکن سنئے کہ مودودی صاحب انتظامِ خداوندی کے اس شعبہ کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے :

جرح و تعدیل دوسرے گروہ کو لیجیے جو دوسری انتہا کی طرف چلا گیا ہے۔ یہ لوگ

محدثین کے اتباع میں جائز حد سے بہت زیادہ تشدد اختیار کرتے ہیں ان کا قول یہ ہے کہ محدثین کرام نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے اب ہمارا کام یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کر دیئے ہیں انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار اور حجیت کا مرتبہ دیں مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلہ میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں۔ محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلم۔ یہ بھی مسلّم کہ نقدِ حدیث کے لئے جو مواد انہوں نے فراہم کیا ہے وہ صدرِ اوّل کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے وہ بہر حال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کے لئے جو حدیں فطرۃ اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے وہ نہیں جا سکتے تھے انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا؟ (صفحہ ۳۱۸)

پھر تحریر فرماتے ہیں:۔

محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے مگر ان میں کون سی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔ (صفحہ ۳۱۹)

غلطیاں بھی محض سہو و خطا کی بنا پر نہیں بلکہ اس بنا پر کہ

نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے ذاتی رجحانات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جاتا ہے یہ امکان محض امکانِ عقلی نہیں بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے (صفحہ ۳۱۹)

اس کے بعد انہوں نے مثالیں دی ہیں جن سے ثابت کیا گیا ہے کہ رُواۃِ احادیث کو ثقہ اور غیر ثقہ قرار دینے میں اَئمۂ جرح وتعدیل کا ذاتی رُجحان کیا کچھ کرتا تھا اسکے بعد ارشاد ہوا۔

اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسماء الرّجال کا سارا علم غلط ہے بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح وتعدیل کی ہے، وہ بھی تو آخر انسان تھے بشری کمزوریاں اُن کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انہوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو اور جس کو انہوں نے غیر ثقہ ٹھیرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو۔ (ص ۳۲۱)

پھر فرماتے ہیں :۔

ان سب چیزوں کی تحقیق انہوں نے اسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے مگر لازم نہیں کہ ہر روایت کی تحقیق میں یہ سب امور اُن کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہو گئے ہوں بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں، وہ درحقیقت منقطع ہو الخ...... یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح اور تعدیل کے علم کو کلیتاً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سُنّتِ نبوی اور آثارِ صحابہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔

(ص ۳۲۲)

جو کچھ مودودی صاحب نے تحریر فرمایا ہے اسکے پیشِ نظر لامحالہ انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ ہم یقینی طور پر کہہ سکیں کہ کون سی بات فی الواقع رسول اللہ کا ارشاد ہے اور کون سی بات ایسی ہے جس میں کچھ اور بھی شامل ہو چکا ہے اس کے بعد انسان اس منطقی نتیجہ

پر پہنچ جاتا ہے کہ:-

(i) احادیث کی حفاظت کا انتظام اللہ نے نہیں کیا کیونکہ خدا کا انتظام ایسا ناقص نہیں ہو سکتا۔ اس نے قرآن کی حفاظت کا انتظام کیا اور دیکھئے کیسا مکمل انتظام کیا۔

(ii) لہٰذا اس سے ظاہر ہے کہ احادیث کا محفوظ رکھا جانا منشائے خداوندی نہ تھا کیونکہ اگر خدا کا یہ منشا ہوتا تو کس کی مجال تھی کہ ان میں ذرا بھی ردّ و بدل یا تحریف و الحاق کر سکتا۔

(iii) چونکہ خدا نے احادیث کو محفوظ رکھنے کا انتظام نہیں کیا اس لئے ظاہر ہے کہ یہ دین کا حصہ نہ تھیں۔ دین قیامت تک غیر متبدل رہنے والی شے ہے اور غیر متبدل شے ہمیشہ محفوظ رکھی جاتی ہے۔

(iv) لہٰذا احادیث کی وقتی حیثیت جو بھی ہو یہ منشائے خداوندی نہیں تھا کہ یہ ابدی طور پر واجب الاتباع رہیں اگر انہیں واجب الاتباع رہنا تھا تو ان کا محفوظ رکھا جانا بھی ضروری تھا۔

لیکن مودودی صاحب اس نقصِ انتظام کا اقرار کرنے کے باوجود مُصر ہیں کہ احادیث قیامت تک کے لئے واجب الاتباع ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر خدا کا انتظام اس باب میں ناکام رہا ہے تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہے کہ ہم انہیں دین ہی تسلیم نہ کریں۔ یہ دین ہیں اور دین ہی رہیں گی۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ غلط اور صحیح کے اس ذخیرے سے یہ معلوم کس طرح کیا جائے کہ کون سی احادیث صحیح ہیں اور کون سی غلط! دیکھئے اس کے جواب میں کیا ارشاد ہوتا ہے:-

مزاج شناس

مگر جس طرح شاہدوں کے بیانات کا جانچنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے اسی طرح روایت بھی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ حدیث کو اصولِ روایت پر وہی شخص جانچ سکتا ہے جس نے قرآن کا علم حاصل کر کے اسلام کے اصولِ اوّلیہ کو خوب سمجھ لیا ہو اور جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شناس ہو جاتا ہے اور اسلام کی صحیح روح اس کے دل و دماغ میں بس جاتی ہے پھر وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اوّل نظر میں سمجھ لیتا ہے کہ آیا رسول اللہؐ ایسا فرما سکتے تھے یا نہیں یا آپ کا عمل ایسا ہو سکتا تھا یا نہیں؟ (ص ۳۰۲)

اس کی تشریح میں دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:۔

یہ دوسری کسوٹی کون سی ہے؟ ہم اس سے پہلے بھی اشارۃً اس کا ذکر کئی مرتبہ کر چکے ہیں جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بہ حیثیتِ مجموعی شریعتِ حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتی ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کون سی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کون سی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی

یہی کسوٹی ردّ و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذاتِ نبوی کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنّتِ رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبیِ اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنّتِ نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنّت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلّی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح، روحِ محمدیؐ میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبوی کے ساتھ متّحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اُسی طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اُس کے فیصلہ کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ غیر معلل، غیر شاذ، متّصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے اس لئے کہ اس جامِ زرّیں میں جو بادۂ معنٰے بھری ہوئی ہے وہ اُسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔

(صـ ۲۴۳۔۲۴۴)

غور فرمایا آپ نے کہ مودودی صاحب کس مقام سے بول رہے ہیں؟ جو کچھ انہوں نے

فرمایا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ:۔

(ا) رسول اللہ کی احادیث خدا کی طرف سے وحی ہیں وہ قیامت تک غیر متبدل ہیں۔ ان کی اتباع خدا کے حکم کی تعمیل اور نبیٔ اکرم کی اطاعت ہے۔

(ii) ان احادیث کا کوئی مستند مجموعہ نہ خدا نے مرتب کیا ہے نہ اسکے رسول نے۔

(iii) محدثین نے ان مجموعوں کو مرتب کیا ہے لیکن اُن کے فیصلے قابلِ سند نہیں ہیں۔

(iv) یہ وہی شخص بتا سکتا ہے کہ جو رسول کا مزاج شناس ہو کہ رسول اللہ نے کیا فرمایا تھا۔

(v) نہ صرف یہ کہ ان مجموعوں میں ارشاداتِ رسول اللہ کون سے ہیں بلکہ اگر کوئی نیا معاملہ پیش آجائے تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اس باب میں رسول اللہ کیا حکم دیتے۔

(vi) لہٰذا خدا کا دین، اس کی عبدیت، رسول اللہ کی اِتباع، اس شخص کے فیصلوں کی اطاعت کا نام ہوا یہ ہے وہ نظامِ اطاعت جو اللہ نے اپنے آخری دین کی حیثیت سے قیامت تک کے لئے نافذ العمل رہنے کے لئے عطا فرمایا تھا۔

مزاج شناس کے اختیارات!

اب اس مزاج شناسِ ذاتِ رسالتمآب" کے اختیارات ملاحظہ فرمایئے۔ فرماتے ہیں:۔

مگر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کو نمونہ قرار دینے اور آپ کے اِتباع کا حکم دینے سے مراد یہ نہیں کہ آپ نے جو کچھ کیا اور جس طرح کیا لوگ بھی بعینہ وہی فعل اُسی طرح کریں اور اپنی زندگی میں آپ کی حیاتِ طیبّہ کی ایسی نقل اتاریں کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق نہ رہے یہ مقصد نہ قرآن کا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ ایک عام اور اجمالی حکم ہے جس پر عمل کرنے کی صحیح صورت ہم کو خود نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم

کی تعلیم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقے سے معلوم ہو جاتی ہے یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں مجملاً میں عرض کرتا ہوں کہ جو امور براہِ راست دین اور شریعت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں تو حضور کے ارشادات کی اطاعت اور آپ کے عمل کی پیروی طَابِقَ النَّعْلُ بِالنَّعْلِ کرنی ضروری ہے" مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل کہ ان میں جو کچھ آپ نے حکم دیا ہے اور جس طرح خود عمل کر کے بتایا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازم ہے۔ رہے وہ امور جو براہِ راست دین سے تعلق نہیں رکھتے مثلاً تمدنی، معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرت کے جزئیات تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے حکمت اور نصیحت کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں اور بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ کے طرزِ عمل سے مکارمِ اخلاق اور تقویٰ و پاکیزگی کا سبق ملتا ہے اور ہم آپ کے طریقے کو دیکھ کر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ روحِ اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے پس اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ حضور کا اِتّباع کرنا چاہے اور اسی غرض سے آپ کی سنّت کا مطالعہ کرے تو اس کے لئے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امور میں آپ کا اِتّباع طَابِقَ النَّعْلُ بِالنَّعْلِ ہونا چاہیئے اور کن امور میں آپ کے ارشادات اور اعمال سے اصول اخذ کر کے قوانین وضع کرنے چاہیں اور کن امور میں آپ کی سنّت سے اخلاق و حکمت اور خیر و صلاح کے عام اصول مستنبط کرنے چاہیں۔ (صـ۲۷۵)

یہ وہی مودودی صاحب ہیں جو ابھی فرما چکے تھے کہ:۔

جس وقت اللہ تعالےٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے

سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا اسی حیثیت میں آپ مبلّغ اور معلّم بھی تھے مربی اور مزکی بھی تھے، قاضی اور حاکم بھی تھے امام اور امیر بھی تھے حتیٰ کہ آپ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے حالات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے۔ (ص ۲۴۱)

یعنی پہلے یہ ارشاد ہوا تھا اور اس کے بعد یہ کہ تمدنی اور معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرت کی جزئیات میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں حضور کی اِتباع طَابِقَ النَّعْلُ بِالنَّعْلِ ہو گی اور بعض ایسی جن میں رخصت ہو گی۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ وہ کون سے امور ہیں جن میں حضور کی اطاعت قدم بقدم کی جائے گی اور کون سے ایسے جن میں آزادی ہو گی؟ وہی مزاج شناسِ ذاتِ رسالتمآب اور کون؟

اسی ضمن میں آگے چل کر فرماتے ہیں۔

اب رہ گئے احکام تو قرآنِ مجید میں ان کے متعلق زیادہ تر کلّی قوانین بیان کئے گئے ہیں اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا اور اپنے عمل اور قول سے ان کی تفصیلات ظاہر فرمائیں اِن تفصیلات میں سے بعض ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل حضور سے ثابت ہے اس کی پیروی کریں مثلاً عبادات کے احکام۔ اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے اصول اخذ کر کے اپنے اجتہاد سے فُرُوع مستنبط کر سکتے ہیں مثلاً عہدِ نبوی کے قوانینِ مدنی اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم کو اسلام کی اسپرٹ معلوم

ہوتی ہے اگر یہ اسپرٹ ہمارے قلب و روح میں جاری و ساری ہو جائے تو ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ زندگی کے جملہ معاملات اور مسائل پر ایک مسلمان کی سی ذہنیت اور ایک مسلمان کی سی بصیرت کے ساتھ غور کریں۔ دنیا کے علمی اور عملی مسائل کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھیں اور ان کے متعلق وہی رائے قائم کریں جیسی ایک مسلمان کو کرنی چاہیئے۔ (ص ۳۲۳)

اس بات کا فیصلہ بھی وہی مزاج شناس کر سکے گا کہ وہ کون سی تفاصیل ہیں جن میں ہم اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں اور وہ کون سی جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں ہوگا یعنی:۔

(i) قرآن کتابِ اصول ہے اس لئے اس سے عملی جزئیات میں ہدایت نہیں مل سکتی۔

(ii) عملی جزئیات احادیث میں ہیں جن کی اطاعت فرض ہے۔

(iii) احادیث صحیح بھی ہیں اور غلط بھی جو صحیح ہیں اُن میں بھی بعض ایسی ہیں جو واجب الاتباع ہیں اور بعض ایسی جن کی اتباع ضروری نہیں ہے اور جن کی اتباع ضروری نہیں ان میں بعض ایسی ہیں جن میں اجتہاد سے استنباط کیا جا سکتا ہے اور بعض ایسی جن میں اجتہاد کی گنجائش نہیں۔

(iv) یہ فیصلہ صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو "مزاج شناس ذات رسالتمآب" ہو کہ کون سی احادیث صحیح ہیں اور اُن میں سے بھی کون سی من وعن واجب الاتباع۔

(v) لٰہذا ظاہر ہے کہ اب اُمتِ مسلمہ کیلئے ہدایتِ خداوندی کا مدار اُس "مزاج شناسِ ذاتِ رسالت مآب" کا فیصلہ رہ گیا ہے نہ کسی سند کے پیش کرنے کی ضرورت ہے نہ دلیل کی۔ یہ خالص ذوق کی چیز ہے جس میں کوئی دوسرا شریک ہی نہیں

ہو سکتا جو کچھ موجود ہے، اس میں سے بھی وہی دین ہو گا جسے یہ شخص دین کہہ دے گا۔
اور جو موجود نہیں ہے، اس کے متعلق بھی یہی بتائے گا کہ اگر رسول اللہ موجود ہوتے
تو آپ کیا فیصلہ دیتے۔ لہٰذا اس "مزاج شناس" کے فیصلے رسول اللہ کے فیصلے ہوں
گے اور چونکہ رسول اللہ کے فیصلے خدا کی وحی ہوتے تھے، اس لئے اس کے فیصلے
بھی وہی حیثیت رکھیں گے۔ اب اس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہوگی اور
اس کی معصیت خدا اور رسول کی معصیت۔ لہٰذا اب دنیا کو اپنی نجات و سعادت
کے لئے اسی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے!

خلاصۂ بحث

چونکہ یہ موضوع بہت اہم ہے، اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ جو کچھ گذشتہ صفحات میں
آپ پڑھ چکے ہیں، اس کا ملخص پیش کر دیا جائے تاکہ بات اچھی طرح
سے ذہن میں مرتسم ہو جائے۔ آغازِ سخن مودودی صاحب کے اس
دعویٰ سے ہوا تھا کہ:۔

(۱) احادیث کی حیثیت محض قرآن کی تشریح اور تفسیر کی　　نہیں بلکہ مسائل و احکام
میں احادیث دین کا مستقل ماخذ ہیں۔ اس لئے کہ:۔

(ب) خدا کی طرف سے دو چیزیں وحی کے ذریعہ ملی تھیں۔ ایک کتاب اللہ دوسرے
احادیثِ رسول اللہ۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) رسول اللہ زندگی کے ہر سانس میں رسول تھے۔ آپ کی ہر بات ہر حال اور ہر
آن میں وحی کی رو سے ہوتی تھی۔

(۲) رسول اللہ اپنے اجتہادات میں غلطی کر جاتے تھے تو اللہ تعالیٰ فوراً اصلاح کر دیتا تھا۔

(۳) رسول اللہ کے اجتہادات آپ کی خداداد بصیرت کی بناء پر ہوتے تھے۔

(۴) احادیث رسول اللہ کے اقوال نہیں، بلکہ قرآن کی طرح وحی ہیں اسی طرح اجتہادات نبوی بھی منزل من اللہ تھے اسے وحی خفی کہا جاتا ہے۔

(۵) احادیث اقوالِ رسول اللہ ہیں۔

(۶) وحی خفی کے ذریعہ جو کچھ ملتا تھا وہ رسول اللہ کی اپنی ہدایت کے لئے تھا عام ہدایت نامہ اور دستور العمل قرآن ہی تھا۔

(۷) قرآن کتابِ اصول ہے۔ احادیث اس کی شرح وتفسیر ہیں۔

(۸) یہ شرح وتفسیر اس لئے قرآن میں درج نہیں کی گئی کہ اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جاتی۔

(۹) چونکہ قرآن اور احادیث دونوں وحی تھے اس لئے اللہ نے جس طرح قرآن کی حفاظت کا انتظام کیا اُسی طرح احادیث کی حفاظت کا بھی انتظام کر دیا

(۱۰) عربوں میں نقل وضبط کا ذریعہ صرف حافظہ تھا اس لئے وحی کی حفاظت حافظہ کی رو سے ہوتی تھی۔

(۱۱) انتظام خداوندی کے باوجود پہلی صدی کے بعد ہی احادیث کے مجموعوں میں موضوع اور مشکوک احادیث داخل ہونا شروع ہو گئیں۔

(۱۲) ائمہ جرح وتعدیل نے احادیث اور اُن کے رُواۃ کے پرکھنے کا بڑا اہم کام کیا۔ لیکن وہ بھی انسان ہی تھے ائمہ اس لئے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ جسے انہوں

نے صحیح کہہ دیا وہ صحیح ہے اور جسے غلط کہہ دیا وہ غلط۔

(۱۳) اب غلط اور صحیح کا فیصلہ وہ شخص کر سکتا ہے جو مزاج شناسِ ذاتِ رسالت مآب ہو یہ بھی وہی بتا سکتا ہے کہ صحیح حدیثوں میں بھی کون کون سی احادیث واجب الاتباع ہیں اور یہ بھی کہ کس کس بات میں اجتہاد کی اجازت ہے اور کس میں نہیں۔

یہ ہیں دلائل اس دعوے کے اثبات کے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن ہی نہیں ملا بلکہ قرآن کے ساتھ قرآن کے ہم پایہ (مِثْلُہٗ مَعَہٗ) دوسری چیز بھی ملی جسے مجموعۂ احادیث کہا جاتا ہے۔

ہم اس باب میں کسی مزید تبصرہ یا تنقید کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مودودی صاحب کی تحریروں کے اقتباسات آپ کے سامنے ہیں اگر آپ اصل عبارات دیکھنا چاہیں تو ان کی تصنیف "تفہیمات" حصہ اول "لے لیجئے اور اس کے بعد از خود کسی نتیجہ پر پہنچ جائیے۔

جہاں تک مودودی صاحب کے اپنے عقیدت مندوں کے حلقہ کا تعلق ہے تو انہیں وہ یہ کہہ کر مطمئن کر سکتے ہیں کہ طلوعِ اسلام آج سے نہیں شروع سے اسلامی جماعت کا مخالف چلا آرہا ہے ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اس نے کیا لکھا ہے؟ جماعت کی عقیدت مندی وہ قلعہ ہوتی ہے جس کے اندر انسان کو اپنی مدافعت کے لئے کچھ کہنے یا کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی جہاں کسی نے کچھ کہا فوراً کہہ دیا کہ یہ لوگ ہماری جماعت کو کمزور کرنا چاہتے ہیں اس سے جماعتی حمیت جوش میں آجاتی ہے اور کسی کو اتنا سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتی کہ کہنے والے کی بات کو سن لیا جائے اور اس پر غیر جانب دارانہ انداز سے غور کر لیا جائے لیکن جو لوگ اس جماعتی عصبیت سے باہر ہیں ہم ان سے عرض کریں گے کہ جو کچھ گذشتہ صفحات میں لکھا گیا ہے اسے نہایت غور سے دیکھیں اور پھر فیصلہ کریں کہ

دینِ خداوندی فی الواقع وہی ہے جسے مودودی صاحب پیش فرما رہے ہیں؟ اور کیا ایسے دین میں انسان خدا کی اطاعت کرتا ہے یا پیشوائیت (PRIESTHOOD) کی آمرانہ قوتوں کی؟ اسی سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آجائے گی کہ یہ لوگ اس پر کیوں مُصر ہیں کہ دینِ خداوندی یہی ہے آپ مودودی صاحب کے پیش کردہ دلائل پر غور کیجئے پھر یہ بھی دیکھئے کہ ان کی تحریروں میں کس قدر تضاد ہے اب صورت حالات یہ ہے کہ اگر مودودی صاحب اس قسم کے کمزور دلائل اور متضاد بیانات کے باوجود اپنے مسلک کو فی الواقع حق و صداقت کا مسلک سمجھتے ہیں تو آپ کی علمی بصیرت کے متعلق جو رائے قائم کی جا سکتی ہے وہ ظاہر ہے اور اگر وہ اپنے مسلک کی کمزوری کو محسوس کرنے کے باوجود اس پر قائم ہیں تو اسے مصلحت کوشی ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ نیتوں کا حال خدا ہی بہتر جانتا ہے اس لئے اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا سکتا لیکن ان دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی شکل ہوئیہ تو واضح ہے کہ مودودی صاحب کا پیش کردہ مسلک اُس دین کا مسلک نہیں ہے جو اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے نبی اکرمؐ کی وساطت سے بھیجا تھا۔

مودودی صاحب کے تضادات

احادیث کو دین قرار دینے میں مودودی صاحب کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ رسول ہر حال اور ہر آن میں رسول ہوتا ہے اس لئے اُس کی ہر بات منجانب اللہ ہوتی ہے۔ جو شخص رسول کی الگ الگ حیثیتیں قرار دیتا ہے، وہ دین کے بنیادی اُصول سے ناواقف ہے۔ چنانچہ اُن کے اپنے الفاظ یہ تھے:-

> لیکن یہ تفریق جو انہوں نے (علامہ اسلم جیراجپوری نے) محمد بن عبداللہ بحیثیت انسان اور محمد رسول اللہ بحیثیت مبلغ ہونے کے درمیان کی ہے قرآنِ مجید سے ہرگز ثابت نہیں۔ قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول

اور نبی ہونے کی حیثیت سے جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا اُس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے آپ کا ہر فعل، ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا حتّٰی کہ آپ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے قرآن کریم میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرتؐ کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسان اور حیثیتِ امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔

(تفہیمات حصہ اول صہ ۲۴۱)

(ہ)

آپ اس دعوے کو غور سے دیکھ لیجئے اور اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ مودودی کے نزدیک رسول کی ایک ہی حیثیت ہے اور قرآن میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرتؐ کی حیثیتِ رسالت اور ذاتی حیثیت میں فرق کیا گیا ہو اس کے بعد آپ انہی مودودی صاحب کا یہ بیان ملاحظہ فرمایئے ارشاد ہے۔

اب اس امر کی تحقیق کیجئے کہ نبی کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے اور جس پر دین کا مدار ہے وہ کس حیثیت سے ہے یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں کہ وہ نبی خاص شخص مثلاً ابنِ عمران یا ابنِ مریم یا ابنِ عبداللہ ہے قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم ہو....... اسی لئے اللہ تعالیٰ بار بار اپنے نبی سے اس حقیقت کا اظہار کراتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے، دراصل نبی بہ حیثیتِ انسان کی اطاعت نہیں ہے بلکہ نبی بحیثیتِ نبی کی اطاعت ہے یعنی اُس علم، اُس ہدایت،

اس حکم اور اس قانون کی اطاعت ہے جسے اللہ کا نبی اللہ کی طرف سے اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ (ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۳۶ء)

غور فرمایا آپ نے! ایک جگہ یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرتؐ کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسان میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ اور دوسری جگہ یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ بار بار اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ نبی کی حیثیتِ رسالت الگ ہے اور ذاتی حیثیت الگ!

مودودی صاحب اپنی کتاب "رسائل و مسائل" میں فرماتے ہیں:۔

"جو امور آپؐ (رسول اللہ) نے عادۃً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کر لیں اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔" (صفحہ ۳)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

سنت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبیؐ نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سب سنت ہے لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے۔ دراصل سنت اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جسے نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار رکھتے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز

کرنا کہ اس عمل کا کون سا جزو سنت ہے اور کون سا جزو عادت بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ (ص ۳۱۰-۳۱۱)

اس سے ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں :-

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضور کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبی پہنتے تھے اور نہ شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی تھیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا منجملہ ان بدعات کے ہے جس سے نظامِ دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔" (ص ۳۱۲)

یہ وہی مودودی صاحب ہیں جو ابھی ابھی یہ فرما رہے تھے کہ :-

جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے آپ کا ہر فعل ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا حتیٰ کہ آپ کی نجی اور شخصی زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے۔

—— (•) ——

آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ رسول کی حیثیت کے سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ میں اس قدر کھلا

ہوا تضاد کیوں؟ اس کی وجہ ظاہر ہے جب مودودی صاحب نے یہ فرمایا تھا کہ رسول کی ایک ہی حیثیت ہوتی ہے۔ اس کی حیثیتِ رسالت اور ذاتی حیثیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا، تو اس وقت مقصد صرف یہ تھا کہ فریقِ مخالف کو منکرِ حدیث اور اپنے آپ کو حامیٔ سنت ثابت کیا جائے چنانچہ اس وقت یہ فرمادیا کہ قرآن میں خفیف سے خفیف اشارہ بھی نہیں ملتا کہ رسول کی دو حیثیتیں تھیں۔ اس کے بعد خود مودودی صاحب کے خلاف اعتراض کیا گیا کہ اُن کی ڈاڑھی اتنی لمبی نہیں جتنی مقدار احادیث میں آتی ہے تو آپ نے فرمادیا کہ قرآن نے واضح الفاظ میں بتادیا ہے کہ رسول کی دو حیثیتیں ہیں، ایک رسالت کی حیثیت اور ایک ذاتی حیثیت۔ ڈاڑھی کا مسئلہ حضور کی ذاتی حیثیت سے متعلق ہے اس لئے اسے سنت نہیں کہا جاسکتا۔ اسے سنت کہنے والا دین میں تحریف کرتا ہے۔

جب یہ پوچھا گیا کہ اسے کون بتائے گا کہ رسول اللہ کی کون سی بات بحیثیتِ رسول تھی اور کون سی بحیثیتِ انسان، تو فرمایا کہ اسے وہی بتا سکے گا جو اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ غور فرمایئے کہ دین کے اہم اصول کس طرح سے متعین ہو رہے ہیں کیا اس طرح سے دین بچوں کا کھیل نہیں بن جاتا؟

اسی بحث کے اخیر میں مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ:

اگر ڈاڑھی کی کوئی مقدار بھی ضروری ہوتی اور اس مقدار کا قائم کرنا حضور کے مشن کا کوئی جزو ہوتا تو آپ ہرگز اس کے تعین میں کوتاہی نہ کرتے مجمل حکم کے دینے پر اکتفا کرنا اور تعین سے اجتناب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت اس معاملہ میں لوگوں کو آزادی دینا چاہتی ہے۔

(صفحہ ۳۱۵)

بعینہٖ یہی بات ہم اللہ تعالیٰ کے متعلق کہتے ہیں کہ (مثلاً) اگر زکوٰۃ کی کوئی مقدار مقرر کرنا دین کا جزو ہوتا اور اس مقدار کو غیر متبدل رکھنا منشائے خداوندی ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہرگز اس کے تعین میں کوتاہی نہ کرتے مجمل حکم کے دینے پر اکتفا کرنا اور تعین سے اجتناب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت اس معاملے میں لوگوں کو آزادی دینا چاہتی ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق مقدار کا تعین خود کریں۔

یہی اصول اس اہم مسئلہ میں قولِ فیصل ہے۔

باقی رہا مزاج شناسی کا سوال تو اس کے متعلق باب سوم میں لکھا جا چکا ہے۔

(۲) منکرِ حدیث کون ہے ؟

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نامِ فسق

(مئی ۱۹۵۳ء)

گوئرنگ کہا کرتا تھا کہ جھوٹی بات کو بار بار دہراتے چلے جاؤ۔ سو مرتبہ دُہراؤ تو وہ سچ بن کر دکھائی دینے لگے گی گوئرنگ کو تو معلوم نہیں کہ اس باب میں کس قدر کامیابی ہوئی لیکن آجکل اُسکے اِس حربہ کا استعمال بلا لائسنس ہو رہا ہے اور اس کا ہدف طلوعِ اسلام ہے۔ طلوعِ اسلام کا مسلک اُس اسلام کو نمایاں کر کے پیش کرنا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسانی کی ہدایت کیلئے بوساطت نبیٔ اکرم صلعم دنیا کو دیا لیکن چونکہ اُس اسلام کے اجاگر ہونے سے اِس اسلام کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو عجمی ٹکسالوں میں وضع ہوا اور ملائیت کے سہارے آگے بڑھا اور آج جس کے محافظ ہمارے مولوی صاحبان ہیں اس لئے مُلّا نے طلوعِ اسلام کی مخالفت کو اپنے لئے جہادِ عظیم تصور کر رکھا ہے۔ ہمارا مُلّا طلوعِ اسلام میں پیش کردہ دعوت کا جواب دلائل و براہین سے تو دے نہیں سکتا (اس لئے کہ وہ دعوت قرآن کی دعوت ہے اور مُلّا بے چارہ قرآنی نور سے محروم ہوتا ہے) اس لئے مُلّا نے اس کے خلاف گوئرنگ کا حربہ استعمال کرنا شروع کر رکھا ہے اِس نے یہ مشہور کر دیا کہ طلوعِ اسلام منکرِ حدیث ہے اور منکرِ حدیث وہ ہوتے ہیں جنہیں نہ خدا سے

کوئی واسطہ ہوتا ہے۔ نہ رسول سے، وہ ایک نیا مذہب ایجاد کرنا چاہتے ہیں جس میں معاذاللہ) نہ رسالت کا احترام باقی رہتا ہے نہ صحابہ کی تعظیم کا، نہ اسلاف کی عزت کا خیال رکھا جاتا ہے نہ بزرگوں کی تکریم کا۔ یہ سب ملحد اور بے دین ہوتے ہیں جس سے مسلمانوں کو اس طرح بچنا چاہیئے جیسے اُجلے کپڑے پہننے والا گیلے پینٹ (WET PAINT) سے بچتا ہے کہ انسان اس کے قریب گیا اور کپڑے ہمیشہ کے لئے خراب ہو گئے۔ اس بہتان طرازی اور گومگو بازی میں جماعتِ اسلامی سب سے پیش پیش ہے، اس لئے کہ طلوعِ اسلام کی سب سے بڑی زد انہی کے مفاد پر پڑتی ہے آیئے ذرا آج کی صحبت میں یہ دیکھیں کہ جو انوکھا اسلام طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اس کا مجرم اکیلا طلوعِ اسلام ہی ہے یا اس جرم میں اور بھی شریک ہیں۔ اور جو دوسرے لوگ اس جرم میں شریک ہیں، اُن میں اور طلوعِ اسلام میں فرق کیا ہے؟ چونکہ یہ سوال بڑا اہم ہے اور مسئلہ ہے بڑا نازک اس لئے ہم گزارش کریں گے کہ آئندہ صفحات میں جو کچھ آپ کے سامنے آئے اُس کے ایک ایک لفظ کو غور سے دیکھئے اور ہر قسم کی جانبداری کو چھوڑ کر از خود فیصلہ کیجئے کہ حقیقت حال کیا ہے؟

طلوعِ اسلام کا مسلک

طلوعِ اسلام جس مسلک کو ایک عرصے سے پیش کر رہا ہے، وہ مختصر الفاظ میں حسبِ ذیل ہے:-

لہٰذا صحیح اسلامی نظام یہ ہے کہ ہم (ہم سے مراد ہے ہر دور کے مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ) قرآن کریم کو اپنے نظام کا محور قرار دیں اور اس کے اصولوں کی روشنی میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود جزئیات متعین کریں۔ ان جزئیات کے تعین میں ہم اُن کوششوں کو بھی سامنے رکھیں گے کہ جو اس سے پہلے اسی نہج و اسلوب پر ہوتی رہی ہیں ان میں

جو چیزیں ایسی ہوں گی جن میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں، انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے گا۔ دوسروں میں مناسب تبدیلیاں کر دی جائیں گی اور نئے امور کے نئے فیصلے کئے جائیں گے، اور اس ساری کوشش کی اصل و بنیاد یہ ہو گی کہ کوئی شے قرآن کریم کے اصول سے نہ ہٹے۔ یہ ہے اسلامی نظام کی صحیح روح۔ یہی رسول اللہ نے کیا تھا۔ اسی کے مطابق اُس خلافت کے دور میں عمل رہا جو علیٰ منہاج النبوت قائم تھی اور اسی کے مطابق پھر سے اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے۔　　(قرآنی دستورِ پاکستان صہ۲۱)

اس اصول سے جو جزئیات متفرع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) دین (یعنی اسلامی نظام) کا اصل الاصول قرآن ہے۔ قرآن کے معانی واضح، اس کی عبارت صاف اور سلجھی ہوئی اور اس کی تعلیم کھلی اور نکھری ہوئی ہے۔

(۲) قرآن نے بالعموم دین کے اصول دیئے ہیں۔ ان اصولوں کی جزئیات، اسلامی نظامِ حکومت اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود متعین کرے گا۔

(۳) سب سے پہلے ان جزئیات کو نبی اکرم صلعم نے متعین فرمایا۔ حضور کے بعد دورِ خلافت علیٰ منہاج النبوت میں اُن جزئیات میں جن کے متعلق ضرورت سمجھی گئی مناسب ردّ و بدل ہوتا رہا اور جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہ سمجھی گئی انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا گیا۔

(۴) جو نئے امور پیش آئے اُن کے لئے نئی جزئیات متعین کی گئیں۔

(۵) آج جو اسلامی مملکت علیٰ منہاج النبوت قائم ہو گی، اسے بھی یہی کچھ کرنا ہوگا۔

اب یہ دیکھئے کہ ان امور میں طلوعِ اسلام منفرد ہے یا ان لوگوں کا بھی بعینہٖ یہی مسلک ہے جو اپنے آپ کو متبعینِ سنّت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث قرار دیتے ہیں۔

قرآن کی حیثیت جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ دین کے اصول سب کے سب قرآن کریم میں موجود ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعتِ اسلامی تفہیمات حصہ اوّل ص۳۳۹ پر لکھتے ہیں۔

باقی رہے اصولِ دین تو وہ سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور تمام مسلمانوں میں مشترک ہیں۔

مودودی صاحب رسائل و مسائل ص۲۶ پر لکھتے ہیں۔

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن چیزوں پر کفر اور اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے۔ وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً و کنایۃً بیان نہیں کیا گیا بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ ان کو کھول دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰیؕ ۹۲/۱۲

دین کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ یہ بتلائے کہ کون کون سی چیزیں حلال ہیں اور کون کون سی حرام۔ اور کون کون سی جائز ہیں اور کون کون سی ناجائز۔ ایک نظامِ مملکت کے اندر اسی چیز کا نام قانون قرار دیا جاتا ہے یعنی قانون یہ بتاتا ہے کہ فلاں کام کرنا جائز ہے اور فلاں ناجائز۔ سوال یہ ہے کہ انسانوں کے لئے اس قسم کی پابندیاں عاید کرنے کا حق کسے حاصل ہے۔ مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد اوّل، ص۵۹۸ پر لکھتے ہیں۔

حرام اور حلال اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا یہ سب ذاتِ خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔

اسی حقیقت کی تشریح کرتے ہوئے وہ تفہیمات، حصہ دوم ص ۳۸۹ پر لکھتے ہیں۔

> اسی اصل کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو ابو داؤد نے سلمان فارسی سے بدیں الفاظ نقل کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا الحلال ما احل الله فی کتابه والحرام ما حرم الله فی کتابه وما سکت عنه فهو مما عفا عنه حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا۔ رہیں وہ چیزیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا تو وہ معاف ہیں۔

طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ جن احکام کو قرآن کریم نے صرف اصولاً بیان کیا ہے اور ان کی جزئیات کا تعین نہیں کیا انہیں اللہ تعالیٰ نے دانستہ اسی طرح چھوڑ دیا ہے اگر منشائے خداوندی یہ ہوتا کہ ان کی جزئیات بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہیں تو قرآن کریم میں ان جزئیات کو بھی خود ہی متعین کر دیا جاتا۔ اس باب میں مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد اول کے ص ۵۰۸-۵۰۹ پر لکھتے ہیں:۔

> ایک دوسری حدیث میں ہے ان الله فرض فرائض فلا تضیعوها وحرم حرمات فلا تنتهکوها وحد حدودا فلا تعتدوها وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنها۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض تم پر عائد کیے ہیں انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے ان کے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے بغیر اس کے کہ اسے بھول لاحق ہوئی ہے لہٰذا اُن کی کھوج نہ لگاؤ۔
>
> ان دونوں حدیثوں میں ایک اہم حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے جن امور کو شارع نے مجملاً بیان کیا ہے اور ان کی تفصیل نہیں بتائی یا جو احکام بر سبیل اجمال دیئے ہیں اور مقدار یا

تعداد یا دوسرے تعینات کا ذکر نہیں کیا ہے ان میں اجمال اور عدم تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہو گئی یا تفصیلات بتانی چاہیئے تھیں مگر نہ بتائیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لئے وسعت رکھنا چاہتا ہے اب جو شخص خواہ مخواہ سوال پر سوال نکال کر تفصیلات اور تعینات اور تقییدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے یا استنباط سے کسی نہ کسی طرح مجمل کو مفصل، مطلق کو مقید، غیر معین کو معین بنا کر ہی چھوڑتا ہے وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے (یہودیوں نے ایسا ہی کیا) جس کے نقشِ قدم پر چلنے میں قرآن اور محمد صلعم کی تنبیہات کے باوجود مسلمانوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اپنے مطالب کو خود ہی واضح طور پر بیان کر دیا ہے یا یہ اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے خارجی ذرائع کا محتاج ہے اس باب میں مودودی صاحب ارشاد فرماتے ہیں :۔

آپ کی تشفی کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن مجید اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کی ہدایت کے لئے ضروری تھا واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔

(ترجمان القرآن بابت اپریل و مئی ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۱۲)

اسی ضمن میں مودودی صاحب کے رفیق اور جماعت اسلامی کے بہت بڑے رکن امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں :۔

قرآن کے اندر اسرار و حکمت کا لاریب ایک خزانہ ہے لیکن اس خزانہ کی کلید خود قرآن

ہی کے الفاظ و ارشادات ہیں۔ قرآن سے باہر ان کی کلید نہیں ہے۔ قرآن کے علوم کا ایک حصہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے ایک حصہ اس کے اشارات سے کھلتا ہے۔ ایک بہت بڑا حصہ اس کے سیاق و سباق سے بے نقاب ہوتا ہے اور پھر سب سے بڑا خزانہ اس کے نظام کی معرفت سے سامنے آتا ہے جو لوگ قرآن پر تدبّر کرتے ہیں وہ بقدرِ استعداد اس سے فیض پاتے ہیں اور وہ اپنی ہر بات پر قرآن ہی کے الفاظ، اشارات اور سیاق و نظام سے دلیل لاتے ہیں۔

(ترجمان القرآن بابت فروری ۵۳ء صفحہ ۳۴۴)

قرآن کو سمجھنے کیلئے حدیث کی ضرورت نہیں؟

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے حدیث کی بھی ضرورت ہے یا نہیں۔ مودودی صاحب اس باب میں تحریر فرماتے ہیں۔

قرآن اور سنّتِ رسول کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں۔ (تنقیحات صفحہ ۱۴۴)

وہ اسی ضمن میں دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

قرآن کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں کہ ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرزِ جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔

(تنقیحات صفحہ ۱۹۳)

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک:

(۱) دین کے تمام اصول قرآنِ کریم کے اندر موجود ہیں۔

(۲) انسانوں کے لئے جائز و ناجائز کے قانون دینے کا اختیار خدا کو حاصل ہے یہ

سمجھنا کہ کسی اور کو بھی ایسا اختیار حاصل ہے شرک ہے۔

(۳) جن اصولوں کی جزئیات قرآن نے خود متعین نہیں کیں' ایسا سہواً نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی طرح دانستہ چھوڑا ہے اب یہ کوشش کہ ان نامتعین جزئیات کو کسی نہ کسی طرح متعین بنا کر قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار دے دیا جائے یہودیوں کی پیروی ہے جس سے خدا اور اُس کے رسول دونوں نے منع کیا ہے۔

(۴) قرآن کی تعلیم بالکل واضح اور صاف ہے۔ وہ اپنے مفہوم کے تعین کے لئے کسی خارجی مدد کا محتاج نہیں' نہ تفاسیر کا اور نہ احادیث کے ذخیرے کا۔

طلوعِ اسلام نے آج تک جو کچھ قرآن کریم کے متعلق لکھا ہے اسے سامنے رکھیئے اور جو کچھ مودودی صاحب نے کہا اسے ایک مرتبہ پھر پڑھ ڈالئے اور اس کے بعد یہ سوچیئے کہ طلوعِ اسلام کے مسلک اور مودودی صاحب کے مسلک میں ذرا بھی فرق ہے؟

دین کی جزئیات

اب آگے بڑھیئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآنی اصولوں کی جو جزئیات رسول اللہ صلعم نے متعین فرمائیں کیا وہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہیں گی یا ان میں بھی تغیر و تبدل ہو سکتا ہے؟ طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ نبی اکرم صلعم نے یہ جزئیات اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر متعین فرمائی تھیں اگر بعد کے زمانے کے تقاضے ان میں کسی تبدیلی کے متقاضی ہوں' تو قرآنی نظامِ حکومت جو علیٰ منہاجِ نبوت قائم ہو وہ ان میں ضروری تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ یہ بڑا اہم سوال ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو جس قدر ہنگامہ آرائی پیدا کی جا رہی ہے' وہ بیشتر طلوعِ اسلام کے اسی مسلک کی بنا پر ہے اب دیکھئے کہ مودودی صاحب جن

کی جماعت اس ہنگامہ آرائی میں پیش پیش ہے اس باب میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۳۲۷ پر لکھتے ہیں :۔

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسی بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے جو حالات عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں اُن حالات میں اختیار کی گئی تھیں ان کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح اور حکم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی اور تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصولِ تشریع پر مبنی اور اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔

آپ نے غور کیا کہ مودودی صاحب کس قدر واضح الفاظ میں بتاتے ہیں کہ نبی اکرم صلعم نے دین کی جو جزئیات متعین فرمائیں وہ اُس خاص زمانہ کے حالات کے مطابق تھیں۔ اب تغیرِ حالات سے اُن میں مناسب تغیر و تبدل کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہوتا ہے۔ وہ اپنے مضمون "تجدید و احیائے دین" میں ایک مجدد کے فرائض کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ اس کا کام

اجتہاد فی الدین بھی ہوگا۔

یعنی دین کے اصولِ کلیہ کو سمجھنا اپنے وقت کے تمدنی حالات اور ارتقاءِ تمدن کی سمت کا اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح اندازہ لگانا اور یہ تعین کرنا کہ اصولِ شرع کے تحت تمدن کے پرانے متوارث نقشہ میں کس طرح ردوبدل کیا جائے جس سے شریعت کی روح برقرار رہے، اس کے مقاصد پورے ہوں اور تمدن کے صحیح ارتقاء میں اسلام دنیا کی امامت کر سکے۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۳۴ء جنوری ۳۵ء ۱۹)

مودودی صاحب نے اپنے مضمون "نشانِ راہ" میں اسی اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

مدینۂ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہر اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اِس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کر کے اُس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہش مند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباعِ رسول کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سلفِ صالح کی پیروی اس کا نام ہے کہ ـــــ تمدن و حضارت کی جو حالت اُن کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل متحجر FOSSILIZED صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور چاہیے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے اردگرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط رہا ہے،

درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں۔

وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں جو تغیر و ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی رہے، بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے پھیر کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں، اُن سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے۔ ہم کو "خَیْرَ اُمَّۃٍ" جو بنایا گیا ہے تو یہ اس لئے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے معقب لشکر (RESERVED GUARD) کی حیثیت میں لگے رہیں بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے۔ ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور ہمارے "خَیْرَ اُمَّۃٍ" ہونے کا راز "اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" میں پوشیدہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا اصلی اسوہ جس کی پیروی ہمیں کرنی چاہیئے یہ ہے کہ انہوں نے قوانینِ طبیعی کو قوانینِ شرعی کے تحت کر کے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انہوں نے اس کے قالب میں روح پھونکی پس نبی و اصحابِ نبی کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقاء اور قوانینِ طبیعی کے اکتشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں اُن کو ہم اسی طرح تہذیبِ اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدرِ اوّل میں کی گئی تھی۔ نجاست اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں ہے بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے

فروغ پارہی ہے۔ (نشانِ راہ ص۵۵)

آپ غور کیجئے کہ اس باب میں مودودی صاحب کا مسلک اُس مسلک سے ذرا بھی مختلف ہے جیسے طلوعِ اسلام پیش کرتا ہے لیکن اس کے باوجود طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث اور اپنے آپ کو متبعِ سنت قرار دیتے ہیں۔

نو پیش آمدہ امور اب رہے وہ امور جو پہلی دفعہ ہمارے سامنے آئیں، سو اُن کے متعلق مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جزئیات کے متعلق صریح شرعی احکام ہم کو صرف اُنہی حوادث اور اُنہی امور کے متعلق معلوم ہو سکتے ہیں جو رسول اللہ کے عہد میں پیش آئے تھے۔ باقی رہے وہ حوادث جو حضورؐ کے بعد پیش آئے، تو اُن کے متعلق شرع میں کوئی صریح حکم نہیں مل سکتا، بلکہ صرف اصول و کلیاتِ شرع ہی سے ایک حکم نکالا جا سکتا ہے۔ صحابۂ کرام اور تابعین اور ائمۂ مجتہدین نے بعد کے حوادث پر جتنے شرعی احکام لگائے ہیں وہ اسی طرح اصول و کلیات سے اخذ کئے ہوئے ہیں نہ کہ منصوص۔

اب اگر کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے جو صحابہ یا ائمہ کے دور میں پیش نہیں آیا یا کوئی ایسی چیز ایجاد ہوتی ہے جو اُس دور میں موجود ہی نہ تھی تو اس کے متعلق متقدین کے اجتہادی احکام میں کوئی حکم تلاش کرنا۔ بداہتہً غلط ہے۔ ایسے ہر حادثہ اور ایسی ہر چیز کے لئے ہم کو بھی اسی طرح اصول و کلیات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس طرح صحابہ اور ائمہ نے اپنے عہد کے حوادث میں کیا تھا۔ (تفہیمات حصہ دوم ص۳۴۷)

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ مودودی صاحب کے نزدیک:۔

(۱) جن اصولوں کی جزئیات رسول اللہ یا صحابہؓ کے عہد میں متعین ہو گئی تھیں، اُن میں تغیرِ حال کے ساتھ ساتھ تغیر کیا جائے گا اور

(۲) جو نئے حوادث پیش آئیں گے اُن کے متعلق دین کے اصولوں کی روشنی میں نئے احکام مستنبط کئے جائیں گے۔

رسول اللہ کی مختلف حیثیتیں

مندرجہ صدر اصول سے درحقیقت ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیا رسول اللہ کا ہر ارشاد رسول کی حیثیت ہی سے تھا یا رسالت سے الگ رسول کی کوئی دوسری حیثیت بھی تھی طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی ایک حیثیت رسالت کی تھی اس حیثیت میں وہ خدا کے احکام بندوں تک پہنچاتے تھے۔ اس میں نہ وہ کسی سے مشورہ لے سکتے تھے اور نہ ہی اس میں اپنے ذاتی خیال، قیاس، رائے یا اجتہاد کا کوئی دخل ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلعم کی رسالت قیامت تک کے لئے زندہ اور پائندہ ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ رسول اللہ صلعم کی ایک دوسری حیثیت بھی تھی۔ اُنہوں نے قرآن کے متعین کردہ نظام کو عملاً متشکل فرمایا۔ اُس نظام میں آپ کی حیثیت امیرِ ملت کی تھی اُسی حیثیت میں آپ مختلف امور میں اپنی ذاتی بصیرت کے مطابق اجتہاد سے کام لیتے تھے اور صحابہؓ سے مشورہ بھی فرماتے تھے اور اس طرح دین کے اصولوں کی جزئیات متعین ہوتی تھیں ان جزئیات میں خود خلافتِ راشدہ کے زمانے میں عند الضرورت تغیر و تبدل ہوتا رہا اور اس کے بعد قرآنی نظامِ مملکت کو اس کی اجازت ہے کہ وہ تغیرِ حالات کے ساتھ ان جزئیات میں تغیر کرتے رہیں۔

اب دیکھئے کہ رسول اللہ صلعم کی ان دو حیثیتوں کے متعلق مودودی صاحب کا کیا عقیدہ ہے وہ تفہیمات جلد اوّل میں لکھتے ہیں:-

اب اس امر کی تحقیق کیجئے کہ نبی کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے اور جس پر دین کا مدار ہے، کس حیثیت سے ہے یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں کہ نبی وہ خاص شخص مثلاً ابن عمران یا ابن مریم یا ابن عبداللہ ہے اور یہ خاص شخص ہونے کی بناء پر اس کو حکم دینے اور منع کرنے کا حلال کرنے اور حرام ٹھہرانے کا ذاتی حق حاصل ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے بار بار اس حقیقت کا اظہار کراتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے، جو اصل ایمان ہے اور جس سے کسی مومن کو سرتابی کیا معنی بجیبر مُو انحراف کا بھی حق نہیں وہ دراصل نبی بحیثیت انسان کے اطاعت نہیں ہے بلکہ نبی بحیثیت نبی کے اطاعت ہے۔ اُس علم، اُس ہدایت، اُس حکم اور اُس قانون کی اطاعت ہے جسے اللہ کا نبی اللہ کی طرف سے اُس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ (صفحہ ۹۲-۹۴)

اسی طرح وہ "رسائل و مسائل" میں لکھتے ہیں:-

دراصل سنت اُس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے۔ تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلعم تشریف لائے تھے۔ اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلعم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضور کے شخصی مزاج اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں کچھ اُس مسلک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اُس زمانہ کے حالات پر جس میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور

تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنّت بنا دینا مقصود نہ تھا۔ (صفحہ ۳۱۱ سے ۳۱۳)

آپ نے دیکھا کہ یہاں کیسے واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ ایک تو وہ اصول تھے جنہیں جاری کرنے کے لئے رسول اللہؐ تشریف لائے اور دوسری وہ عملی شکل تھی جس کی رُو سے رسول اللہؐ نے اُن اصولوں کو جاری فرمایا۔ وہ اصول تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں لیکن ان کی عملی صورتیں جو اُس زمانے کے حالات اور طرزِ معاشرت کو پیشِ نظر رکھ کر اختیار کی گئی تھیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے واجب الاتباع اور غیر متبدل نہیں ہیں۔ یہی نہیں کہ یہ چیزیں واجب الاتباع نہیں، بلکہ مودودی صاحب تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ:۔

> اس قسم کی چیزوں کو سنّت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (رسائل و مسائل صفحہ ۳۰۸)

طلوعِ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ دین کے جو اصول قرآن میں دیئے گئے ہیں، اُن کی عملی جزئیات متعین کرنے کے لئے رسول اللہ صلعم صحابہ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ جزئیات بربنائے وحی نہ تھیں۔ جو بات مشورہ سے طے ہوئی وہ مشورہ سے بدلی بھی جا سکتی ہے۔ رسول اللہؐ کی یہ حیثیت امیرِ ملّت کی حیثیت تھی۔ اس لئے قرآنی نظامِ مملکت میں امیرِ ملّت کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ باہمی مشاورت سے بتقاضائے حالات کے مطابق اِن جزئیات میں تغیر و تبدل کر لے۔ اس نکتہ کے متعلق کہ رسول اللہ صلعم کو بحیثیتِ امیرِ مملکت مشورہ کرنے کا حکم تھا

مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

قرآن کہتا ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات باہمی مشاورت سے انجام پانے چاہئیں اور نبی صلعم کو بحیثیت صدرِ ریاست کے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۳/۱۵۸ اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو۔ پھر مشورہ کے بعد جب تم عزم کر لو تو اللہ کے بھروسے پر عمل کرو۔

(ترجمان القرآن بابت دسمبر ۵۲ء صفحہ ۲)

اللہ و رسول کی اطاعت سے قرآن کی مُراد

طلوعِ اسلام کا کہنا یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ یہ اطاعت اُس نظام کی ہے جو قرآنی قوانین کو نافذ کرے اور اللہ اور رسول کی نافرمانی اُس نظام کی نافرمانی ہے۔ اب دیکھئے کہ مودودی صاحب اس باب میں کیا فرماتے ہیں۔ سورہ مائدہ میں ہے کہ إِنَّمَا جَزَاؤُا الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۵/۳۳ مودودی صاحب اس کا ترجمہ لکھتے ہیں "جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں"۔ یہاں اللہ اور اس کے رسول سے کیا مُراد ہے، اس کی بابت وہ لکھتے ہیں :-

خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب اُس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔ (تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۴۶۵)

آپ نے دیکھا کہ اللہ اور رسول سے مراد مودودی صاحب کے نزدیک بھی اسلامی نظامِ حکومت ہے۔

احادیث

احادیث کے متعلق طلوعِ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جس قدر وحی نازل ہوئی وہ سب قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہؐ نے جو کچھ فرمایا، وہ حضور کے اپنے ارشادات تھے کلام اللہ نہیں تھا۔

اس بارے میں مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

> قرآن کے کلام اور محمد صلعم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اس قدر مختلف اسٹائل کبھی ہو نہیں سکتے۔ یہ فرق صرف اسی زمانہ میں واضح نہیں تھا جب کہ نبی صلعم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے سہتے تھے بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سیکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں ان کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اس قدر مختلف ہیں کہ زبان وادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔　　(ترجمان القرآن بابت ستمبر ۵۲ء ص ۳۱۵)

رسائل و مسائل میں دجال سے متعلق احادیث پر بحث کرتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضور سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے ۔۔۔ یہ باتیں آپ نے علمِ وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں، بلکہ اپنے گمان کی بناء پر فرمائی تھیں۔ اور آپ کا گمان وہ چیز نہیں ہے جس کے صحیح نہ ثابت ہونے سے آپ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو یا جس پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلف کئے گئے ہیں۔　　(ص ۵۵-۵۶)

یہ تو رہی مودودی صاحب کے نزدیک حدیث کی حقیقت۔ اب سوال یہ ہے کہ جو حدیثیں

ہم تک پہنچی ہیں کیا ان سے دین کے متعلق کوئی یقینی علم بھی حاصل ہو سکتا ہے؟ اسکے متعلق مودودی صاحب فرماتے ہیں :-

احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمان صحت ہے نہ کہ علم یقین اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرہ میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور اس کے دین میں اتنے اہم ہوں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہے انہیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے ایسے امور کی تو نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالےٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان فرمائے اللہ کا رسول انہیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقہ سے ہر ہر مسلمان تک پہنچا دیئے گئے ہوں۔ (رسائل و مسائل صـ۶۷)

یہ بعینہٖ وہی چیز ہے جسے طلوعِ اسلام پیش کرتا چلا آرہا ہے دوسرے مقام پر مودودی صاحب لکھتے ہیں :-

قولِ رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں برخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول اور فعل کو نبی صلعم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔ (رسائل و مسائل صـ۲۷)

طلوعِ اسلام بھی یہی کہتا ہے کہ ہم احادیث کے مجموعوں کے متعلق یقین کے ساتھ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ جن چیزوں کو رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل رسول اللہ کی ہیں

بھی یا نہیں اس لئے یہ چیزیں دین کا مدار قرار نہیں پا سکتیں کیونکہ دین کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہے کہ اسے لاریب فیہ ہونا چاہیئے، یعنی ایسا کہ جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

اسی طرح مودودی صاحب ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو، اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۹)

اس چیز کا فیصلہ کہ کون سی حدیث رسول اللہ کی ہو سکتی ہے اور کون سی نہیں، مودودی صاحب کے نزدیک اُس شخص کی ذاتی بصیرت سے ہے جو مزاج شناسِ رسالتمآب ہو لیکن اس کے متعلق وہ خود ہی لکھتے ہیں کہ یہ چیز کسی دوسرے شخص کے لئے سند نہیں قرار پا سکتی چنانچہ وہ لکھتے ہیں :۔

اس باب میں اختلاف کی بھی کافی گنجائش ہے کیونکہ ایک شخص کا ذوق اور اس کی بصیرت لازماً دوسرے شخص کے ذوق اور بصیرت سے بالکل مطابق نہیں ہو سکتا، اگرچہ ماخذ دونوں کا ایک ہی ہو لہٰذا کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ صرف وہی چیز شرعی ہے جس کو میری بصیرت شرعی کہہ رہی ہے اور دوسرے شخص کی بصیرت جس کو شرعی کہتی ہے، وہ قطعاً و یقیناً غلط ہے۔ — (تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۳۳۱)

اسی بناء پر طلوعِ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ کہ کون سی چیز شرعی ہے اور کون سی شرعی نہیں صرف مسلمانوں کا اسلامی نظام کر سکتا ہے۔ مودودی صاحب اصح الکتب بعد کتاب اللہ یعنی بخاری شریف کے متعلق فرماتے ہیں :۔

یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں اُن کے مضامین کو

بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔　　(ترجمان القرآن اکتوبر و نومبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۱)

آپ مندرجہ صدر اقتباسات کو غور سے دیکھئے اور پھر خود ہی فیصلہ کیجئے کہ حدیث کے متعلق جو مسلک طلوعِ اسلام پیش کرتا ہے اس میں اور مودودی صاحب کے پیش کردہ مسلک میں کوئی بھی فرق ہے؟ لیکن اس کے باوجود یہی مودودی صاحب ہیں کہ وہ طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث قرار دے کر اسے (معاذ اللہ) خدا اور رسول کا بدترین دشمن قرار دیتے ہیں اور خود سب سے بڑے متبع سنت بن کر خدا اور رسول کے اطاعت گزار بنتے ہیں دنیا میں اس قسم کی دیدہ دلیریاں کم ہی دیکھنے میں آئی ہوں گی۔

امیر جماعت اسلامی کی تضاد بیانیاں

ممکن ہے یہاں بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ جب اس باب میں طلوعِ اسلام اور مودودی صاحب کا مسلک ایک ہی ہے تو پھر ان دونوں میں فرق کہاں پیدا ہوتا ہے؟ فرق پیدا ہوتا ہے اس باب میں کہ طلوعِ اسلام جو کچھ ایک جگہ کہتا ہے وہی کچھ دوسری جگہ کہتا ہے آج جو کہتا ہے وہی کل کہتا ہے لیکن مودودی صاحب کا یہ حال ہے کہ وہ ہر مقام پر موقع اور مصلحت کے لحاظ سے الگ الگ بات کہتے ہیں۔ آج کچھ، کل کچھ، یہاں کچھ، وہاں کچھ۔ ممکن ہے آپ کو اس پر تعجب ہو اور مودودی صاحب کے متبعین کو اس پر غصہ بھی آئے لیکن طلوعِ اسلام جو کچھ کہتا ہے، دلیل اور سند کے ساتھ کہتا ہے یونہی کسی کے خلاف الزام عائد نہیں کر دیتا۔ جو کچھ اس نے کہا ہے، اس کا ثبوت لیجئے اور دیکھئے کہ مودودی صاحب کس قدر متضاد باتیں کہتے چلے جاتے ہیں۔

رسول اللہ کی دو حیثیتیں

حدیث کے معاملے میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا رسول اللہ صلعم کی ایک ہی حیثیت رسالت کی تھی یا دو الگ الگ حیثیتیں تھیں۔ علامہ اسلم جیراج پوری نے اپنی کتاب تعلیماتِ قرآن میں تحریر فرمایا کہ رسول اللہ صلعم کی دو حیثیتیں الگ الگ تھیں۔ ایک حیثیتِ رسالت جس میں آپ خدا کی وحی انسانوں تک پہنچاتے تھے اور دوسری حیثیتِ بشری جس میں آپ اپنی ذاتی حیثیت سے معاملات سرانجام دیتے تھے۔ مودودی صاحب نے اس کتاب پر تنقید کرتے ہوئے لکھا۔

> یہ تفریق جو انہوں نے محمد ابن عبداللہ بحیثیت انسان اور محمد رسول اللہ بحیثیت مبلغ کے درمیان کی ہے قرآنِ مجید سے ہرگز ثابت نہیں ہے۔ قرآن میں آنحضرت صلعم کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول و نبی ہونے کی حیثیت ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا...... اس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا...... حتیٰ کہ آپ کی نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اس حیثیت کے تحت آگئے تھے۔
>
> (تفہیمات حصہ اوّل صفحہ ۲۴۰)

اس کے بعد خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مودودی صاحب پر لوگوں نے اعتراض کر دیا کہ انکی ڈاڑھی سنّت کے مطابق نہیں ہے۔ اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں کہ:۔

> سنّت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبی صلعم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سب سنّت ہے ...... سنّت اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے

وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے.....

جو امور آپ نے عادۃً کئے ہیں انہیں سنت بنالینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔ (رسائل و مسائل صفحہ ۳۰۰)

آپ نے غور فرمایا کہ جب علامہ اسلم صاحب نے یہ لکھا کہ رسول اللہ صلعم کی ایک حیثیت رسالت کی تھی اور ایک بشریت کی تو مودودی صاحب نے فرمایا کہ یہ غلط ہے رسول اللہ کی ایک ہی حیثیت تھی۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا حتیٰ کہ آپ کی نجی زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے لیکن خود مودودی صاحب پر اعتراض ہوا کہ ان کی ڈاڑھی سنت کے مطابق نہیں تو انہوں نے فرمادیا کہ رسول اللہ کا یہ حکم یا عمل انسان کی حیثیت سے تھا، رسول کی حیثیت سے نہیں تھا۔ اس لئے یہ سنت میں داخل ہی نہیں یہیں تک ہی نہیں انہوں نے علامہ اسلم صاحب جیراجپوری کے جواب میں کہا تھا کہ

"قرآنِ مجید سے ہرگز ثابت نہیں کہ رسول کی دو حیثیتیں تھیں"۔ لیکن

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں صاف کر دیا ہے وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو وہ نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم بشر ہو، البتہ نبی ہونے کی حیثیت سے اس میں اور تم میں عظیم الشان فرق ہے۔ (تفہیمات حصہ اول صفحہ ۸۹)

یعنی ایک جگہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں کہ رسول اللہ کی دو حیثیتیں تھیں اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں صاف کر دیا ہے

کہ رسول کی دو حیثیتیں ہیں یعنی جب ضرورت پڑی تو کہہ دیا کہ قرآن سے یہ ہرگز ہرگز ثابت نہیں اور جب دوسرے وقت پر موقع آیا تو کہہ دیا کہ قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ رسول کی دو حیثیتیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ یا تو یہ چیز قرآن سے پرلے درجے کی جہالت ہے اور یا بدترین قسم کا مذاق۔ بہرحال صورت کچھ بھی ہو، موقع اور محل کے لئے دونوں قسم کی باتیں قرآن کی طرف منسوب کر دی گئیں۔ اس قسم کا کھلا ہوا تضاد تو شاید مرزا غلام احمد کے ہاں بھی نہ ملے۔

اور آگے پڑھیئے :۔

تمام وحی قرآن میں محفوظ ہے

علامہ اسلم جیراجپوری نے لکھا تھا کہ رسول اللہ پر جو وحی نازل ہوئی تھی وہ سب قرآن میں محفوظ ہے۔ قرآن سے باہر وحی نہیں ہے اس کے جواب میں مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ کتاب کے سوا اور کوئی وحی نبی پر نازل نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ ہر وہ بات جس پر نطقِ رسول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے' وحی ہے۔۔۔۔۔ رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ (تفہیمات' حصہ اول' صد ۲۴۲-۲۷۲)

اس سے ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک وحی کا کچھ حصہ قرآن میں داخل ہے اور کچھ احادیث میں۔ یہ دوسرا حصہ بھی قرآن کی طرح مِثْلَهٗ مَعَهٗ خدا کی طرف سے ہوتا تھا خود رسول اللہ کا اپنا کلام نہیں ہوتا تھا لیکن یہی مودودی صاحب دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

قرآن کے کلام اور محمد صلعم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اس قدر مختلف اسٹائل کبھی ہو نہیں سکتے۔۔۔۔ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سیکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں جن کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اس قدر مختلف ہیں کہ زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے

کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔

(ترجمان القرآن ستمبر ۵۲ء صفحہ ۳۸۵)

یعنی ایک جگہ کہا گیا کہ احادیث بھی اُسی طرح سے خدا کی طرف سے وحی ہیں جس طرح قرآن کریم خدا کی طرف سے وحی ہے لیکن دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ قرآن اور حدیث کے اسلوب اور انداز سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ احادیث اُس کا کلام نہیں جس کا کلام قرآن ہے۔ غور فرمایا آپ نے کہ یہ کس قدر کھلا ہوا تضاد ہے۔

بات صرف اسلوب و انداز تک ہی محدود نہیں اس سے آگے بھی ابھی ابھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے فرمایا تھا کہ :-

ہر وہ بات جس پر نُطقِ رسول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے وحی ہو گی ..... اور آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔

لیکن دوسری جگہ ارشاد ہے کہ :-

ان امور کے متعلق جو باتیں حضور سے احادیث میں منقول ہیں، وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے ..... یہ باتیں آپ نے علمِ وحی کے مطابق نہیں فرمائی تھیں بلکہ آپ نے اپنے گمان کی بناء پر فرمائی تھیں۔

(رسائل و مسائل صفحہ ۵۵۔۵۶)

یعنی ایک جگہ یہ کہا گیا کہ رسول کا ہر قول وحی تھا اور منجانب اللہ تھا اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ یہ احادیث رسول اللہ کے قیاسات تھے جن میں آپ کو خود بھی شک تھا۔

ذرا سوچئے کہ اس قسم کی کھلی ہوئی متضاد باتیں کس قسم کا انسان کر سکتا ہے۔

رسول اللہ کو بحیثیت امیر کے اُمت سے مشورہ کا حکم

اور آگے بڑھئے علامہ اسلم جیراج پوری نے لکھا کہ رسول اللہ کو بحیثیت امیر خدا کی طرف سے حکم تھا کہ اُمت سے مشورہ کیا کریں اس پر مودودی صاحب نے فرمایا کہ :-

اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ آپ کی حیثیت دوسرے امراء کی سی ہے۔ دوسرے امراء کے لئے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مشورہ سے کام کریں وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۴۲/۳۸ لیکن رسول اللہ کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جب آپ کسی بات کا عزم کر لیں تو خدا پر بھروسہ کر کے عمل کا اقدام کریں۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۳/۱۵۸ آپ کی امارت آپ کی رسالت سے الگ نہ تھی بلکہ آپ رسول خدا کی حیثیت ہی سے امیر تھے۔ (تفہیمات حصہ اوّل صفحہ ۳۴۳)

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک رسول اللہ کی امارت کی حیثیت رسالت کی حیثیت سے الگ نہیں تھی آپ کو مشاورت کا جو حکم دیا گیا تھا وہ بحیثیت امیر ریاست نہیں تھا بلکہ بحیثیت رسول ہی تھا۔ قرآن کی آیت وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۴۲/۳۸ عام امراء کے لئے تھی۔ اور فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۳/۱۵۸ کا حکم رسول اللہ کے لئے خاص تھا۔ لیکن دوسری جگہ مودودی صاحب فرماتے ہیں :-

اس باب میں قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات باہمی مشورہ سے انجام پانے چاہئیں۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۴۲/۳۸ اور نبی اکرم صلعم کو بحیثیت صدر ریاست کے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۳/۱۵۸ اور اُن سے معاملات میں مشورہ کرو پھر مشورہ کے بعد جب تم عزم کر لو تو اللہ کے بھروسا پر عمل کرو۔ یہ دونوں آیتیں مشورہ کو لازم

کرتی ہیں اور صدرِ ریاست کو ہدایت کرتی ہیں کہ جب وہ مشورہ کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو اللہ کے بھروسے پر اسے نافذ کرے۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۵۵ء صفحہ ۲)

آپ نے غور کیا کہ ایک جگہ یہ فرمایا گیا کہ مشورہ کی ایک آیت (وامرھم شوریٰ بینھم ۴۲/۳۸) تو عام امراء کے لئے تھی اور دوسری آیت (فاذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ ۳/۱۵۸) رسول اللہ کے لئے لیکن دوسری جگہ ارشاد ہے کہ یہ دونوں آیتیں مشورہ کو لازم کرتی ہیں اور صدرِ ریاست کو ہدایت کرتی ہیں کہ جب وہ مشورہ کے بعد کسی فیصلہ پر پہنچ جائے تو اللہ کے بھروسا پر اسے نافذ کرے یعنی جب علامہ اسلم پر اعتراض کیا تو کہہ دیا کہ رسول اللہ کے لئے یہ خاص حکم تھا کہ آپ جب کسی فیصلے پر پہنچ جائیں تو اسے اللہ کے بھروسا پر نافذ کر دیں لیکن جب کراچی کے وکلاء کی محفل میں تقریر کی تو اس وقت یہ فرما دیا کہ یہ آیت ہر صدر ریاست کے لئے ہے۔ اس قسم کا تلاعب بالدین بھی کم ہی دیکھنے میں آیا ہو گا۔

حرام اور حلال

دین میں حرام اور حلال کا سوال بڑا بنیادی ہے اس سے یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ حرام صرف وہی چیزیں ہیں جنہیں قرآن نے حرام قرار دے دیا ہے یا وہ چیزیں بھی جنہیں روایات میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ سید محمد صبیح صاحب نے حلال و حرام کی تحقیق پر ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے بتایا کہ قرآن نے صرف چار[1]

---

[1] طلوعِ اسلام میں اس کتاب پر تبصرہ شائع ہو چکا ہے جس میں صبیح صاحب کے اس خیال سے اختلاف کیا گیا ہے کہ جس چیز کو قرآن نے حلال قرار دیا ہے اس کا کھانا بہرحال فرض ہے حلال کے ساتھ طیّب کے قرآنی اضافے نے یہ بتا دیا کہ وہ حلال چیزیں کھائی جائیں گی جو خوش گوار بھی ہوں اور جن سے طبیعت کو کراہت نہ آتی ہو۔

چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے (ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۵۲ء ص ۳۵۸) میں بڑے طنزیہ انداز میں لکھا گیا ہے کہ :۔

> اس میں تحقیق یہ پیش کی گئی ہے کہ قرآن میں صرف مُردار، خون، سُور کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح ہونے والے جانوروں کو حرام قرار دیا گیا ہے لہٰذا درندے، کُتّے، گدھے مینڈک، چوہے وغیرہ سب حلال ہیں...... کتاب کے مباحث طرزِ استدلال اور انداز بیان سب مُنکرینِ حدیث حضرات کے پیٹنٹ ہیں۔

یعنی یہ مسلک منکرینِ حدیث کا ہے کہ حلال اور حرام صرف کتاب اللہ میں ہے ورنہ متبعینِ حدیث کا مسلک یہ ہے کہ جن چیزوں کو احادیث میں حرام بیان کیا گیا ہے وہ بھی اسی طرح حرام ہیں :۔

ترجمان القرآن میں تو یہ لکھا ہے لیکن مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں کہ :۔

> فقہائے اسلام میں سے ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ حیوانی غذاؤں میں سے یہی چار چیزیں حرام ہیں (یعنی مردار، بہتا ہوا خون، سُور کا گوشت یا جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے) اور ان کے سوا ہر چیز کا کھانا جائز ہے یہی مسلک حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کا تھا...... ان تمام مختلف اقوال اور ان کے دلائل پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ دراصل شریعتِ الٰہی میں قطعی حُرمت ان چار ہی چیزوں کی ہے جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ (ص ۵۹۲ - ۵۹۳)

یعنی ایک جگہ یہ لکھا جاتا ہے کہ شریعت میں یہی چار چیزیں قطعی طور پر حرام ہیں فقہائے اسلام کے ایک گروہ کا بھی یہی عقیدہ ہے اور یہی مسلک حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کا بھی تھا لیکن جب یہی بات محمد صبیح صاحب لکھتے ہیں تو اُن کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا جاتا ہے

کہ یہ منکرِ حدیث کی باتیں ہیں یعنی وہی بات جب مودودی صاحب کہیں تو وہ اطاعتِ خدا بھی ہو اور اتباعِ سنت بھی مشربِ فقہا بھی ہو اور مسلکِ صحابہ بھی لیکن جب وہی بات کوئی فریقِ مخالف کہے تو منکرِ حدیث قرار پا جائے۔

میں جو چُپ بیٹھوں سڑی کہلاؤں
شیخ چپ بیٹھے تو کل ٹھہرے!

(حرام اور حلال سے متعلق مودودی صاحب کی اس تفسیر میں بھی ایسی متضاد باتیں لکھی ہیں جنہیں دیکھ کر انسان حیرت میں رہ جاتا ہے لیکن اس کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔)

اسلاف پر تنقید　طلوعِ اسلام کے خلاف سب سے بڑا جرم یہ عائد کیا جاتا ہے کہ یہ اُن معتقدات و رسومات پر تنقید کرتا ہے جو ہمارے اسلاف سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں لیکن ان ہی اسلاف کے متعلق مودودی صاحب کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے۔ مثلاً

> ہو سکتا ہے یہ قول حسن بصری اور قتادہ اور اعمش وغیرہم سے منقول ہے مگر یہ لوگ خدا کی طرف سے کب مبعوث ہوئے تھے کہ ان کے اقوال کو ترک کر دینے سے انسان کافر ہو جائے۔۔۔۔۔ یہ سلف کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے۔۔۔۔۔ مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا نہ اُس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے لہٰذا اُس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں میں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔

(تنقیحات ص ۱۳۳۔ ۱۳۷۔ ۲۲۶)

غور کیجئے کہ یہ لفظاً وہی بات نہیں جو طلوعِ اسلام کہتا ہے لیکن اس کے باوجود طلوعِ اسلام اسلاف کا منکر اور یہ حضرات اسلاف کے نام لیوا ہیں۔

کیا تمام امت منافق تھی؟

طلوعِ اسلام نے اتنی سی بات کہہ دی کہ قرآن کریم نے قربانی کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ اس کا مقام کعبہ ہے اور یہ جو ہم ہر شہر اور ہر قریہ میں قربانیاں دیتے ہیں یا حج کے موقع پر جانور کاٹ کاٹ کر یونہی پھینک دیتے ہیں اس کی سند قرآن سے نہیں ملتی۔ اس کے خلاف مودودی صاحب غیظ و غضب کی ایک پوری دنیا اپنے جلو میں لئے ہوئے اٹھے اور گرجتے ہوئے فرمایا کہ:-

> آخر یہ امت ساری کی ساری منافقوں پر ہی تو مشتمل نہیں رہی ہے کہ حدیثوں پہ حدیثیں قربانی کی مشروعیت پر گھڑی جائیں اور ایک نیا طریقہ ایجاد کر کے رسولِ خدا کی طرف منسوب کر دیا جائے اور پوری امت آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر بیٹھے۔

(تفہیمات حصہ دوم صل۲)

لیکن انہی مودودی صاحب نے اپنی مجددیت کا مہرہ آگے بڑھایا ہے تو اس کی تمہید یوں شروع کی کہ حضرت عثمان کے عہد ہی میں "جاہلیت" کو اسلامی نظامِ اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ۔

> جاہلیتِ مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا اور توحید کے راستے سے ہٹا کر ان کو ضلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا۔ ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکی باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے مسلمانوں میں رواج نہ پایا ہو۔ پرانی جاہل قوموں کے جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے، وہ اپنے ساتھ بہت سے مشرکانہ تصورات لئے چلے آئے اور یہاں ان کو صرف اتنی

تکلیف کرنی پڑی کہ پرانے معبودوں کی جگہ مقابر اولیاء سے کام لیں اور پرانی عبادات کی رسموں کو بدل کر نئی رسمیں ایجاد کریں۔

(ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۸۴-۲۸۵)

کوئی ان صاحب سے پوچھے کہ یہ امت ساری کی ساری منافقوں پر مشتمل تھی کہ اس قسم کے مشرکانہ تصورات، معتقدات اور رسومات اسلام میں داخل ہوتے گئے اور پوری امت آنکھیں بند کر کے اسے قبول کرتی رہی اگر مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق امت نے اس قسم کی مشرکانہ عبادات و اعمال کو قبول کر لیا تھا تو کیا اس کا امکان نہ تھا کہ یہ امت قربانی کی رسم کو بھی اپنے ہاں رائج کر لیتی۔

لیکن طلوعِ اسلام اگر قربانی کی رسم کے متعلق اتنا سا کہہ دے تو عوام کو یہ کہہ کر بھڑکا دیا جائے کہ دیکھو! یہ امت کو منافق قرار دے رہا ہے لیکن اگر مودودی صاحب پوری امت کے متعلق یہ ارشاد فرمائیں کہ وہ مشرکانہ تصورات و عبادات کو ایک ایک کر کے قبول کرتی گئی تو بدستور مجدد کے مجدد رہیں۔

جب میں چلوں تو سایہ بھی میرا نہ ساتھ دے جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے!

غرضیکہ کہاں تک لکھتے جائیے۔ ہم اگر چاہیں تو مودودی صاحب کے اسی قسم کے تضادات کی ایک تصنیف پیش کر سکتے ہیں لیکن اس کی سردست ضرورت نہیں آپ نے اتنے اقتباسات سے ہی یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ صاحب کس طرح دین کے سے اہم معاملہ میں بھی مختلف مواقع پر متضاد باتیں کہتے چلے جاتے ہیں اور انہیں کوئی نہیں پوچھتا کہ دین سے ایسا مذاق کیوں ہو رہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک تو عوام کا حافظہ ہی کمزور ہوتا ہے دوسرے جب انسان اپنے

گرد عقیدت مندوں کا حلقہ قائم کر لے تو پھر کوئی شخص تنقید کی جرأت کر ہی نہیں سکتا اس کے بعد جو آپ کے جی میں آئے کہتے چلے جائیے۔ ہر طرف سے سبحان اللہ اور مرحبا کی آوازیں وجہ فریب نفس بنتی چلی جائیں گی لیکن آپ سوچیئے کہ اپنے تھوڑے سے فائدے کے لئے کتنا بڑا نقصان ہے جو سادہ لوح مسلمانوں کو پہنچایا جاتا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ یہ مقالہ اس وقت شائع ہو رہا ہے جب کہ مودودی صاحب گرفتار ہو چکے ہیں اس لئے ممکن ہے یہ کہا جائے کہ جب وہ اس پوزیشن ہی میں نہیں کہ اس کا جواب دے سکیں تو وہ اپنی مدافعت کس طرح کر سکتے ہیں؟ لیکن قارئین کو یاد ہوگا کہ مودودی صاحب اور اُن کے رفقاء میں آج تک اس کی جرأت و ہمت نہیں ہوئی کہ وہ طلوع اسلام کے کسی اعتراض کا بھی جواب دے سکیں۔ اگرچہ وہ اپنی اس کمزوری اور عجز کو ہمیشہ اس پندار کے نقاب میں چھپاتے رہے ہیں کہ ہم ایسے "ذلیل لوگوں" کے منہ نہیں لگنا چاہتے۔ اس لئے اگر وہ باہر بھی ہوتے تو وہ ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے ہم نے اس مقالہ کو اس لئے شائع کیا ہے کہ جو سادہ لوح مسلمان نہایت دیانت داری سے یہ سمجھ کر ان حضرات کے ساتھ شامل ہیں کہ یہ بہت بڑے متبع سنت اور اسلاف کے عقیدت مند ہیں اُن پر اِن کی اصلی حقیقت آشکارا ہو جائے اور وہ کسی دھوکا میں نہ رہیں۔

ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کے جواب میں جماعتِ اسلامی کی طرف سے یہ کہا جائیگا (جیسا یہ اکثر کہا کرتے ہیں) کہ مودودی صاحب کی عبارات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور اقتباسات بھی صحیح نہیں دیئے جاتے۔ ہم آپ سے صرف اتنا کہیں گے کہ جو شخص یہ بات کہے اس سے کہئے کہ ہم نے جو حوالے اوپر دیئے ہیں، وہ کتابیں لے آئے اور اس کے بعد آپکو بتائے کہ کہاں الفاظ کو توڑا مروڑا گیا ہے اور کہاں اقتباسات کو غلط پیش کیا گیا ہے آپ اس کا شدت سے مطالبہ کیجئے آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل بھی پیش نہیں کر سکیں گے۔

(۳) سیّد ابوالاعلیٰ مودودی منکرِ حدیث ہیں

مولانا ظفر احمد عثمانی، صدر جمعیتِ علمائے اسلام کا فتویٰ

(نومبر ۱۹۵۳ء)

کراچی سے ایک صاحب نے حسبِ ذیل فتویٰ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی صدر جمعیتِ علمائے اسلام پاکستان کے پاس بھیجا یہ بتلائے بغیر کہ عبارات کس کی ہیں۔

استفتاء کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کے عقائد خود اُس کے الفاظ میں حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) یہ حقیقت یقیناً ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجاآوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسی بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے جو حالات عہدِ رسالت ہو اور عہدِ صحابہ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانے اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں اُن حالات میں اختیار

کر لی گئی تھیں اُن کو بعینہٖ تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حکم کے لحاظ سے اُن کے جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں.........

پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار صراحۃ النص کی پیروی بھی تَفَقُّہ کے بغیر درست نہیں ہوتی اور تفقّہ کا اقتضا یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیّر کرتا رہے جو شارع کے اصول تشریع پر مبنی اور اُس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔

(۲) اہلِ روایت نے جو خدمت اپنے ذمہ لی تھی وہ دراصل یہ تھی کہ قابلِ اعتماد ذرائع سے نبی صلعم کے عہد سے متعلق جتنا مواد اُن کو بہم پہنچے اسے جمع کر دیں چنانچہ یہ خدمت انہوں نے انجام دی۔ اس کے بعد یہ کام اہلِ روایت کا ہے کہ وہ نفسِ مضامین پر غور کر کے ان روایات سے کام کی باتیں اخذ کریں ...... اسلئے یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں۔ اُن کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی جان لینے کی ہے کہ کسی روایت کے سنداً صحیح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا نفسِ مضمون بھی ہر لحاظ سے صحیح اور جوں کا توں قابلِ قبول ہے۔

(۳) سنّت کے متعلق عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نبی صلعم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سب سنّت ہے لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے۔ دراصل سنّت اُس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری رکھنے کے لئے اللہ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار

گئے...... جو امور آپ نے عادۃً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں اللہ کا اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا یہ تحریف ہے جو دین میں کی جا رہی ہے۔

(۴) ان اسود دجال کی تفاصیل کے متعلق جو مختلف باتیں حضور سے منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے۔

سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا اعتقاد رکھنے والا شخص

(۱) صحیح معنی میں مسلمان اور متبع سنت کہلائے گا یا منکر حدیث؟

(۲) اگر منکر حدیث کہلائے گا تو اسلام میں اس کا کیا مقام ہے؟ اور

(۳) ایسا شخص دائرۂ اسلام سے خارج اور ملحد و بد دین ہے یا نہیں؟　　بینوا و توجروا۔
المستفتی۔

الجواب

مولانا عثمانی صاحب نے اس فتویٰ کا حسب ذیل جواب دیا۔

(۱) بظاہر یہ شخص منکر حدیث ہے۔

(۲) دائرۂ اسلام سے تو خارج نہیں مگر گمراہ اور مبتدع ہے ایسے شخص سے مسلمانوں کو دور رہنا چاہیئے اور اس کی باتوں پر ہرگز اعتماد نہ کرنا چاہیئے۔ اس کو جاہل اجہل سمجھنا چاہیئے۔

(نقل دستخط ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ از ڈھاکہ ۲۱ رجب ۱۳۷۲ھ ۶ اپریل ۱۹۵۳ء)

یہ عبارات سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی کی ہیں اور ان کا حوالہ حسب ذیل ہے۔

(۱) تفہیمات حصہ دوم ص ۳۲۷ - ۳۲۸

(۲) ترجمان القرآن بابت اکتوبر نومبر ۱۹۵۲ء ص ۱۱۳ - ۱۱۷

(۳) رسائل و مسائل ص ۳۰، ۳۱

(۴) رسائل و مسائل ص ۵۵

مولانا عثمانی صاحب نے اپنے جواب کے علاوہ اُن اقتباسات پر بھی نوٹ لکھے ہیں جن میں سے بعض بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً اقتباس ۳ میں جہاں مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ تحریف ہے جو دین میں کی جارہی ہے؛ اس پر مولانا صاحب نے لکھا ہے "اس کو تحریف کہنا پاگل پن ہے"۔

اقتباس ۵ میں جہاں مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ ان امور کے بارے میں رسول اللہ صلعم خود شک میں تھے؛ اس کی بابت مولانا عثمانی صاحب لکھتے ہیں "جو شخص رسول کی شان میں ایسی باتیں کہتا ہے، وہ جاہل ہے۔ وہ خود شک میں ہے رسول کی شان اس سے پاک ہے"۔

بہرحال آپ نے یہ دیکھ لیا کہ صدر جمعیتِ علمائے اسلام پاکستان کے نزدیک مودودی صاحب منکرِ حدیث ہیں، گمراہ اور مبتدع ہیں، جاہلِ اجہل ہیں اور ان کا یہ فتویٰ ہے کہ ایسے شخص سے مسلمانوں کو دور رہنا چاہیئے اور اس کی باتوں پر ہرگز اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔

اب رہا یہ کہ منکرِ حدیث کے متعلق جماعت اسلامی کا فیصلہ کیا ہے سو جماعتِ اسلامی کے جنرل سکریٹری میاں طفیل محمد نے پنجاب کی تحقیقاتی عدالت میں حسبِ ذیل بیان دیا۔

عدالت کے سوال کے جواب میں گواہ نے بتایا کہ اسے اہلِ قرآن کے مذہبی نظریات کا پتا نہیں لیکن اگر ایسی صورت ہو کہ وہ حدیث و سنت میں یقین نہ رکھتے ہوں، تو پھر ان کو مسلمان نہیں کہا جائے گا۔ گواہ نے کہا کہ اس نے چکڑالویوں کے بارے میں سن تو رکھا ہے مگر اُسے اُن کے مذہبی نظریات کا پتا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں چالیس پچاس ہزار کے قریب احمدی ہیں۔

س۔ فرض کیجئے کہ پاکستان میں اہلِ قرآن کی کافی بڑی تعداد موجود ہے۔ ایسی صورت میں کیا آپ اُن کے بارے میں بھی اس قسم کے مطالبات کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھیں گے جیسا کہ احمدیوں کے بارے میں؟

ج :۔ جی ہاں! اُس وقت تک جب تک کہ وہ ختمِ نبوت کے عقیدے پر ہم سے متفق نہ ہو جائیں، ہم ان سے ذمیوں کا سا سلوک کریں گے اور اُن سے وہی سلوک کریں گے جو اسلامی قانون کے مطابق تجویز کیا گیا ہے۔ (''امروز'' لاہور بابت ۱۹ اکتوبر ۵۳ء)

اس سے آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ جماعتِ اسلامی کے اپنے عقیدہ کی رو سے مودودی صاحب کی کیا پوزیشن ہے اس کے ساتھ ہی اسے بھی سمجھ لیجئے کہ مودودی صاحب کا فیصلہ یہ ہے کہ جو مسلمان مسلمان نہ رہے یعنی مُرتد ہو جائے تو اُس کی سزا قتل ہے یعنی اس پورے معاملہ کا صغریٰ کبریٰ یوں قائم ہوا۔ (۱) مولانا عثمانی کے فتویٰ کی رو سے مودودی صاحب منکرِ حدیث ہیں (۲) میاں طفیل محمد کے بیان کے مطابق منکرِ حدیث مُسلمان نہیں رہتا (۳) اور مودودی صاحب کے فیصلے کے مطابق جو مسلمان مسلمان نہ رہے اُس کی سزا قتل ہے۔

جماعتِ اسلامی والے اس کے جواب میں حسبِ عادت یہ کہیں گے کہ فتویٰ میں مودودی صاحب کی عبارت کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ ہم نے ان عبارات کو اصل کتابوں سے ملا کر خود دیکھ لیا ہے اور ان کے حوالے بھی دے دیئے ہیں جس شخص کو اپنا اطمینان کرنا ہو وہ ان عبارات کو خود دیکھ لے اور آگے اور پیچھے سے پوری عبارات ملا کر اپنا اطمینان کر لے کہ انہیں کہیں توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا گیا ہے۔

بَابُ شَشُم

مودودی صاحب اور فقہ

فقۂ حنفی

شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا

(اکتوبر ۱۹۵۲ء)

ہم نے اس حقیقت کو کئی بار دہرایا ہے کہ جو لوگ مذہب کو اپنی انتخابی مہموں کی آڑ بنا کر پاکستان میں نظام شریعت کا مطالبہ کرتے ہیں ان کی تکنیک یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اکثریت کو اپنے ساتھ رکھیں کیونکہ دور حاضرہ کے جمہوری قاعدوں کی رُو سے انتخاب میں وہی جماعت کامیاب ہو سکتی ہے جس کے ساتھ اکثریت ہو۔ اس مہم میں اسلامی جماعت سب سے پیش پیش ہے یہ جماعت آج تک کتاب و سنت اور قرآن و حدیث کو اسلامی دستور کا مدار علیہ قرار دیتی چلی آ رہی تھی ان کے اس دعویٰ میں قرآن کا نام تو محض برائے وزنِ بیت ہوتا تھا اصل زور حدیث پر دیا جاتا تھا۔ یہ لوگ حدیث کو وحی غیر متلو قرار دے کر اسے قرآن کے ہم پایہ ٹھہراتے تھے اور اس کا مسلسل اعادہ کرتے چلے آتے تھے کہ قانون صرف کتاب و سنت کے اندر ہے۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنے مضمون "تجدید و احیائے دین" کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا تھا۔

> کبھی تجدیدِ ملت کیلئے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ہی تنہا ماخذ تھیں

لہٰذا کتاب اللہ اور سنّتِ رسول ہی وہ تنہا ماخذ ہے جس سے اِس دور میں تجدیدِ ملّت کا کام کرنے کے لئے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے اور اس رہنمائی کو اخذ کرکے اس وقت کے حالات میں شاہراہِ عمل تعمیر کرنے کے لئے ایسی مستقل قوّتِ اجتہادیہ درکار ہے جو مجتہدینِ سلف میں سے کسی ایک کے علوم اور منہاج کی پابند نہ ہو اگرچہ استفادہ ہر ایک سے کرے اور پرہیز کسی سے بھی نہ کرے۔

(ترجمان القرآن ص ۳۳-۳۴ دسمبر ۱۹۴۰ء، جنوری ۱۹۴۱ء)

اسی طرح وہ اپنے پمفلٹ "اسلامی قانون" میں لکھتے ہیں :-

اسلامی قانون میں جو چیز اٹل ہے وہ تین اجزاء پر مشتمل ہے (۱) قطعی اور صریح احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں دیئے گئے ہیں۔ (۲) اصولی احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ (۳) حدود جو قرآن و سنّت میں اس غرض کے لئے مقرر کی گئی ہیں کہ ہم اپنی آزادیٔ عمل کو اُن کے اندر محدود رکھیں..... اسلامی قانون کا یہ اٹل اور قطعی واجب الاطاعت حصہ ہی دراصل وہ چیز ہے جو اسلامی تہذیب و تمدن کے حدودِ اربعہ اور اس کی مخصوص امتیازی شکل و صورت کو متعین کرتا ہے۔ (ص ۳۲)

حتّٰی کہ وہ تفہیمات حصہ اوّل میں لکھتے ہیں کہ :-

تمام ائمہ بالاجماع کہتے ہیں کہ جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنّتِ رسول اللہ روشن ہو جائے اس کے لئے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔ (ص ۳۲۵)

آج اکثریت کا فیصلہ ہی تنہا ماخذ ہے

یہ اُس زمانہ کی باتیں ہیں جبکہ پورا برِعظیم ہند انگریز کے پنجۂ استبداد میں جکڑا ہوا تھا اور انہیں اپنا

منتہائے ارتقاء امامت و مجددیت (مذہبی پیشوائیت) میں نظر آ رہا تھا جبکہ پاکستان کے وجود پذیر ہو جانے اور امیر المومنین بن سکنے کا انہیں وہم و خیال بھی نہیں تھا جس کے لئے جمہوری نقطۂ نظر سے انتخابی مُہمّیں لڑنے کی ضرورت تھی لیکن پاکستان بن جانے کے بعد جب انہوں نے انتخابی مہمیں لڑنے کا فیصلہ کیا اور اب جو اکثریت کو ساتھ رکھنے کی ضرورت پیش آ گئی تو "دین" میں ضروری تبدیلی کر لی گئی چنانچہ اب (ترجمان القرآن بابت جون جولائی ۱۹۵۲ء میں) اس سوال کے جواب میں کہ پاکستان میں کون سا قانون شریعت نافذ ہو گا یہ لکھ دیا گیا ہے کہ :-

اگر شریعت کو ملک کا دستور اور قانون بنانا ہے (جس سے کوئی مسلمان انکار کی جرأت نہیں کر سکتا) تو جمہوریت کے مسلّم قاعدہ کے مطابق یہاں شریعت کی وہی تعبیر، دستور اور قانون کی شکل اختیار کرے گی جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت معتبر مانتی ہے اب یہ ظاہر ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے اور اگر ان کے ساتھ اہل حدیث کو بھی شمار کیا جائے تو مجموعی تعداد نوّے فیصدی سے بھی زیادہ نکلے گی اس صورت میں لامحالہ دستور تو شریعت کی اس تعبیر کے مطابق ہی بنے گا جس پر حنفی اور اہل حدیث متفق ہوں اور لازماً ملکی قانون حنفی تعبیرِ شریعت پر مبنی ہو گا۔ (صفحہ ۱۳۱،۱۳۲)

پہلے تو یہ دیکھئے اس نئے مسلک میں کس سادگی اور پُرکاری سے یہ کوشش کی گئی ہے کہ سرِ دست اہلِ حدیث کو بھی ساتھ چپکائے رکھا جائے اس کے لئے ارشاد ہے کہ ملک کے دستور کی تعبیر تو حنفیوں اور اہلِ حدیث کے اتفاق سے طے پائے گی لیکن ملکی قانون فقۂ حنفی کے مطابق ہو گا۔ حالانکہ دستور اور قانون کا ایک مُبتدی بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ کسی مملکت کا دستور ایک اصول کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا قانون اس اصول کے تابع وضع ہوتا ہے دستور میں اس امر کی صراحت کی جاتی ہے کہ ملک کے قانون کا ماخذ یا منبع کیا ہو گا۔ قانون کے

مسئلہ میں حنفیوں اور اہلحدیث کا اختلاف جزئی مسائل میں نہیں بلکہ اصول میں ہے ایں دریں حالات، یہ کس طرح ممکن ہے کہ پاکستان کا دستور تو حنفی اور اہلحدیث کی متفق علیہ تعبیر کے مطابق بنے اور اس کا قانون خالص فقہ حنفی کے مطابق ہو۔ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ اس قسم کی باتیں کرنے کی جرأت اس لئے کرتے ہیں کہ یہ سمجھتے ہیں کہ بیچارے مولویوں میں کون ہے جو دستور اور قانون کے اس قسم کے باریک فرق کو محسوس کر سکے گا۔ اب آگے

جمہوریت کا اصول مسلّم ہے

بڑھیئے مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جمہوریت کا اصول مسلّم ہے یعنی کسی مملکت کا آئین اور قانون وہی ہونا چاہیئے۔ جو اس مملکت کی اکثریت فیصلہ کرے۔ ظاہر ہے کہ اکثریت کا منشا معلوم کرنے کے لئے نظامِ جمہوریت میں ایک مشینری موجود ہوتی ہے جس کی رُو سے مملکت کے نمائندے ایک جگہ بیٹھ کر قانون بناتے ہیں۔ اسے مجلسِ قانون ساز یا پارلیمنٹ وغیرہ کہا جاتا ہے اس مجلس کے فیصلے (جو کثرتِ آراء سے طے پاتے ہیں) مملکت کا قانون بن جاتے ہیں۔ پاکستان میں اس قسم کی مجلسِ قانون ساز (کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی) آج بھی موجود ہے ظاہر ہے کہ آئین جمہوریت کے مطابق وہی قانون پاکستان کا مملکتی قانون قرار پائے گا جسے یہ مجلس منظور کرے گی جب مودودی صاحب کی جماعت کے نزدیک جمہوریت کا قاعدہ مسلّم ہے تو انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ شور مچاتے پھریں کہ ملک کا قانون فلاں قسم کا ہونا چاہیئے اگر اس قسم کا قانون نہ بنا تو وہ قابلِ قبول نہیں ہوگا ایک طرف جمہوریت کے قاعدہ کو مسلّم ماننا اور دوسری طرف جمہوریت کو مجبور کرنا کہ وہ اُن کی مرضی کے مطابق قانون بنائے ایک ایسا مسلک ہے جسے کسی جمہوری نظام میں بھی مناسب تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

ہمیں حیرت ہے کہ جمہوریت کے قاعدہ کو ایک ایسا شخص مسلّم قرار دے رہا ہے جو ایک ایسی جماعت کا امیر ہے جس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اقامتِ دین کے لئے وجود میں آئی ہے یہ ظاہر

ہے کہ جمہوریت کا قاعدہ مغرب کی لادینی سیاست کی تخلیق ہے جن کے پاس غلط اور صحیح اور حق و باطل کے پرکھنے کا کوئی مستقل معیار نہیں ان کے نزدیک۔ اگر ایک ۵/۱ ارکین یہ فیصلہ کر دیں کہ خدا کا وجود نہیں ہے تو انہیں اس ارکین کو ماننا پڑے گا کہ خدا نہیں ہے۔ ہم پوچھتے ہیں اسلامی جماعت کے امیر سے کہ کیا اسلام بھی اس قسم کے قاعدہ کو مسلّم تسلیم کرتا ہے؟ اگر محترم امیرِ جماعتِ اسلامی اجازت دیں تو ہم انہیں اتنا یاد دلانے کی جرأت کریں کہ آئینِ پاکستان کا جو مسودہ خود انہوں نے مرتب فرمایا ہے اس میں یہ شق موجود ہے :۔

امیر کو حق ہوگا کہ وہ مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ اور امیر کو یہ حق بھی ہوگا کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔

(دو دستوری خاکے صہ ۳۹)

کیا اصول جمہوریت اسی کو کہتے ہیں؟ اب جمہوریت کے مسلّم قاعدہ کے مطابق مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا وہ وزن کہاں چلا گیا جس کے زور پر حنفیت کو پاکستان کا قانون بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حیرت ہے کہ یہ حضرات دین کے اصولی امور میں بھی اس قسم کی متضاد باتیں کہہ دیتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ان کے سر پر کتنی بڑی ذمہ داری عاید ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے حد ہمدردی کے قابل ہے وہ قوم جس میں اس قسم کے لوگ دینی امور میں سند بن کر بیٹھ جائیں۔

دین میں اکثریت کا وزن

مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ ملک کا قانون فقہ حنفی کے مطابق ہونا چاہیئے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ملک کی اکثریت حنفی ہے پہلے اس دلیل پر غور کیجیئے لیکن اس کے لئے پہلے ایک بنیادی نکتہ "تمہیداً" سمجھنا ضروری ہے۔ ایک مملکت (SECULAR STATE) کہلاتی ہے۔ اس کا

اصول تقنین یہ ہوتا ہے کہ جس بات کو مفید سمجھا جائے اسے اختیار کرلیا جائے جسے نقصان رساں سمجھا جائے اسے چھوڑ دیا جائے۔ ان کے نزدیک غلط اور صحیح کا معیار اکثریت کی رائے ہوتی ہے۔ نہ کہ خدا کی طرف سے دیئے ہوئے غیر متبدّل اصول۔ دوسری اسٹیٹ دینی کہلاتی ہے جس میں مملکت کے فیصلے ہمیشہ خدا کی طرف سے دیئے ہوئے غیر متبدّل اصول کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی مملکت دینی مملکت ہونی چاہیئے۔ ایک مسلمان کا ایمان یہ ہے کہ اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی جائے تو اس کا مواخذہ ہوگا۔ جب مسلمانوں کی مملکت کے قانون کا سوال سامنے آئے گا تو دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ قانون خدا کے حکم کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ مودودی صاحب یہ نہیں فرماتے کہ فقہ حنفی کو اس لئے اختیار کیا جائے کہ وہ خدا کے احکام کے مطابق ہے وہ کہتے ہیں کہ اس فقہ کو اس لئے اختیار کیا جائے کہ ملک کی اکثریت اس کی متبع ہے۔ آپ سوچئے کہ یہ مسلک ایک سیکولر اسٹیٹ کا ہوسکتا ہے یا دینی مملکت کا۔

یہ تصوّر کہ اکثریت ہمیشہ حق پر ہوتی ہے انسان کی بہت بڑی غلط نگہی پر مبنی ہے اور قرآن نے کھلے کھلے الفاظ میں اس کی تردید فرمائی ہے۔ جب رسول اللہ صلعم سے فرمایا:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔ (۶/۱۱۷)

اور اے رسول! اگر تم ان لوگوں کی اطاعت کرلو جو دنیا میں اکثریت میں ہیں تو وہ تمہیں خدا کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔ وہ محض ظن کی پیروی کرتے ہیں اور شک و گمان میں قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں۔

دین میں اکثریت و اقلیت کوئی معیار ہی نہیں۔ جب رسول اپنی آواز کو بلند کرتا ہے تو اس کے

حق میں صرف اس کا اپنا ووٹ ہوتا ہے اور پوری قوم کی اکثریت اس کے خلاف ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود رسول حق پر ہوتا ہے اور قوم کی اکثریت باطل پر۔

اکثریت کے وزن کے متعلق مودودی صاحب کی تصریحات

ہمیں اس اصول کے متعلق زیادہ تفصیل سے کہنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ مودودی صاحب نے متعدد مقامات پر اسے صحیح تسلیم کیا ہے وہ اپنی کتاب "سیاسی کشمکش" حصہ سوم میں "اقلیت واکثریت" کے عنوان کے تابع لکھتے ہیں۔

> کثرت وقلت کا سوال صرف قوموں ہی کے لئے پیدا ہوتا ہے "جماعتوں" کے لئے نہیں۔ جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لیکر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلتِ تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔

(صـ۵۶)

یہاں تک تو صرف ایک اصولی بات کہی گئی اس کے بعد خود مسلمانوں کے متعلق سنئے جن کی عظیم اکثریت کے وزن پر آج حنفیت کو قانونِ مملکت بنانے کی کوشش فرمائی جارہی ہے وہ عظیم اکثریت کس وزن کی حامل ہے، سنئے فرماتے ہیں:۔

> ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لئے قریب قریب بالکل بیکار ہو چکی ہے (صـ۵۸)

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور نبی صلعم نے تاکید فرمائی ہے کہ سوادِ اعظم کا ساتھ ہمیشہ دو۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی متبع ہے، اس کے ساتھ رہنا ضروری

ہے۔ لیکن یہ ارشادِ نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلعم نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اُس سے مراد دراصل اُن مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔　(صفحہ ۴۸)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں:۔

یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے نو سو ننانوے فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں نہ ان کا اخلاقی نقطہ نظر اور نہ ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ اُمید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔　(صفحہ ۲۷)

دین کا خود کوئی تصور نہ فی ذاتہ حق ہے نہ باطل

مودودی صاحب کے یہ ارشادات اُس زمانے کے ہیں جب ہندوستان میں مسلم لیگ کی تحریک زوروں پر تھی اور یہ حضرت اُس تحریک اور اُس کے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کیا کرتے تھے ان سے کہا جاتا تھا کہ قوم کی اکثریت اس راہ پر چل رہی ہے اس لئے آپ بھی اس کا ساتھ دیجئے۔ اُس وقت آپ یہ فرماتے تھے کہ اس قوم کی اکثریت

کا وزن کیا ہے اور آج وہی مودودی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ پاکستان میں فقہ حنفی اس لئے رائج کرنا چاہیئے کہ یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت اسے صحیح تسلیم کرتی ہے آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کی یہ اکثریت انہی افراد پر مشتمل ہے جو بقول مودودی صاحب کے پیدائشی طور پر مسلمان ہوئے ہیں اور جنہوں نے فقہ حنفی کو کسی غور و فکر کے بعد اختیار نہیں کیا، بلکہ وہ محض اس لئے حنفی ہیں کہ حنفی ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوئے مگر یہی وہ اکثریت ہے جس کے مسلک کے متعلق آج یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اسے ایک دینی مملکت کا دستور اور قانون بننا چاہیئے۔ محض اس دلیل کی بناء پر کہ یہ اکثریت کا مذہب ہے یعنی یہاں اتفاق سے حنفی اکثریت میں ہیں تو حنفیوں کا مذہب عین اسلام قرار دیا جا رہا ہے اگر اہلحدیث اکثریت میں ہوتے تو ان کا مسلک عین اسلام قرار پا جاتا۔ اگر شیعہ اکثریت میں ہوتے تو اسی دلیل کی بناء پر ان کا مذہب، مذہبِ حق قرار پا جاتا۔ اور اگر کل کو کمیونسٹ اکثریت میں ہو جائیں تو ان کا مسلک ملک کا قانون قرار پا جانا چاہیئے۔ یہ ہے دین کا وہ تصوّر جو جماعتِ اسلامی کے امیر کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ یعنی دین کا کوئی خاص تصوّر یا فیصلے فی ذاتہٖ حق ہیں نہ باطل۔ حق وہ ہے جسے کسی زمانہ اور کسی ملک کی اکثریت اختیار کر لے اور باطل وہ جو اس دور کی اقلیت کا مسلک ہو۔ اس دلیل کی بناء پر معلوم نہیں سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب آویزشِ کربلا کے متعلق کیا ارشاد فرمائیں گے کیونکہ وہاں تو امام حسینؓ اور اُن کے ساتھی بالکل اقلیت میں تھے اور مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت یزید کے ہاتھ پر بیعت کر چکی تھی۔

فقہ حنفی کیا ہے؟ آیئے اب مختصراً یہ دیکھیں کہ فقہ حنفی کسے کہتے ہیں اور اس کے بعد یہ کہ اس سے پہلے خود مودودی صاحب اس فقہ کے

متعلق کیا خیال رکھتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم (بجز چند مستثنیات کے) اصولی احکام دیتا ہے ان اصولی احکام کی جزئیات اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق متعین کی جاتی تھیں سب سے پہلے ان جزئیات کو رسول اللہ صلعم نے متعین فرمایا۔ ظاہر ہے کہ کسی اصول سے جزئیات کے فیصلے تک پہنچنے کے لئے غور و فکر لانے اور قیاس کی ضرورت ہے اسی کا نام تَفَقُّہ فی الدّین (دین میں غور و فکر کرنا) ہے اور اس طرح مستنبط کردہ احکام کا نام فقہ ہے رسول اللہؐ کے بعد اسلامی مملکت میں وسعت ہوتی گئی اور اس کے ساتھ ہی جدید مسائل سامنے آتے گئے جن کے لئے نئے نئے فیصلوں کی ضرورت لاحق ہوتی رہی صحابہؓ نے سنّتِ رسول کی اتباع میں (یعنی قرآنی اصولوں کی روشنی میں جزئی احکام کے تعین کے مسلک کی پیروی کرتے ہوئے) ان جدید مسائل کے لئے نئے نئے احکام نافذ فرمائے ظاہر ہے کہ حالات کے بدلنے سے اس قسم کے فیصلوں میں بھی تبدیلی ہو سکتی تھی۔ نیز خود فیصلہ کرنے والے کی رائے کی تبدیلی سے بھی اس کے مستخرجہ نتائج میں تبدیلی کا امکان تھا چونکہ فقہ کا مدار خارجی حالات اور مجتہد کی عقل و فکر پر تھا اس لئے اس قسم کے اختلافات میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی تھی چنانچہ خلافتِ راشدہ میں بعض فیصلے ایسے ہوئے جو رسولؐ اللہ کے فیصلوں سے مختلف تھے اور اس کے لئے دلیل یہی دی گئی کہ جن حالات میں رسولؐ اللہ نے ایسا فیصلہ دیا تھا اب وہ حالات بدل چکے ہیں اس کے بعد خود ایک خلیفہ نے اپنے پیشتر و خلیفہ کے فیصلہ کے خلاف بھی فیصلے دیئے اور خود ایک ہی خلیفہ بھی مختلف حالات میں اپنے فیصلوں کو خود ہی بدلتا رہا (ان امور کی مثالیں کُتبِ سیر و تاریخ میں عام طور پر مل سکتی ہیں) خلافتِ راشدہ کے بعد دین میں لامرکزیت پیدا ہو گئی لیکن نئے نئے مسائل ہر روز سامنے آتے تھے ان مسائل کا فیصلہ کرنے کے لئے دو قسم کے مکتبِ خیال پیدا

ہوگئے بعض لوگ اس خیال کے پیرو تھے کہ جو فیصلے رسول اللہ نے کئے ہیں، وہی فیصلے ہمیشہ کے لئے اٹل ہیں اور اب کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ اپنے قیاس (عقل و فکر) سے نئے احکام مستنبط کرے۔ یہ لوگ اہلِ حدیث کے نام سے متعارف ہوئے۔ رسول اللہ صلعم اپنے فیصلوں کا کوئی مستند مجموعہ امت کو دے کر نہیں گئے تھے (اس لئے کہ یہ منشائے رسالت تھا ہی نہیں کہ حضور کے فیصلے جو لامحالہ اپنے زمانہ کے احوال و ظروف کے مطابق دیئے گئے تھے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اٹل اور قطعی تصور کر لئے جائیں)۔ لیکن مندرجہ بالا ضرورت کے ماتحت ان فیصلوں کو جمع کرنا شروع کر دیا گیا۔ ان مجموعوں کا نام کتبِ روایات ہے جنہیں لوگوں سے سُن سُنا کر جامعینِ حدیث نے جنہیں قابلِ قبول سمجھا انہیں رکھ لیا اور جنہیں ایسا نہ سمجھا اسے مسترد کر دیا۔ ان روایات کے متعلق اہلِ حدیث نے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ یہ قرآن کے ہم پایہ ہیں اور خدا کی طرف سے وحی شدہ۔ لہٰذا اُن ہی کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہے۔

دوسرا گروہ وہ تھا جس نے کہا کہ جو مسائل ہمارے سامنے آئیں گے ہم اُن میں خود غور و فکر کریں گے اور اپنی رائے سے کسی فیصلہ پر پہنچیں گے۔ ان لوگوں کو اہل الرائے کہا جاتا ہے۔ ان اہلِ الرائے حضرات میں امام ابو حنیفہؒ بہت زیادہ مشہور ہیں۔ آپ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں وفات پا گئے۔ امام صاحب نے اپنی فقہ کو تنہا اپنی رائے سے مرتب نہیں فرمایا تھا۔ انہوں نے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور اشخاص منتخب کئے اور اُن پر مشتمل ایک مجلس مرتب کی۔ اُن میں قاضی ابو یوسف اور امام محمد خاص طور پر مشہور ہیں (حنفیوں کے ہاں انہیں صاحبین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے)۔ اس طرح قریب تیس برس کی مدت میں فقہی احکام کا ایک مجموعہ مرتب کیا گیا لیکن وہ مجموعہ اب کہیں موجود نہیں۔ (اور نہ ہی امام صاحب کی کوئی اور تصنیف موجود ہے) امام صاحب کے مسائل کا جو ذخیرہ آج دنیا میں موجود ہے،

وہ دراصل امام محمد اور قاضی ابو یوسف کی تالیفات ہیں۔ انہوں نے کئی مسائل میں خود امام صاحب سے اختلاف بھی کیا ہے۔ قاضی ابو یوسف خلفائے عباسیہ کے عہد میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز تھے اس طرح سے فقہ حنفی خود عباسی حکومت کا قانون قرار پا گئی اور رفتہ رفتہ دیگر ممالک میں بھی پھیل گئی کچھ وقت تک تو یہ شکل رہی کہ ایک فقیہ کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنے اجتہاد کی بنا پر اپنے پیشرو فقہاء کے فیصلوں سے اختلاف کرے لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال بدلتا گیا اور جب امت پر ہر طرف سے جمود اور تعطل طاری ہو گیا تو اس خیال کی جگہ اس عقیدہ نے لے لی کہ جو کچھ ائمہ سابقہ نے کر دیا ہے اس میں رد و بدل کی گنجائش نہیں اس طرح استنباطِ مسائل میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس مسلک کو تقلید کا مسلک کہتے ہیں یعنی خاص فقہ کی بلا چون و چرا اور بلا غور و فکر پیروی کرنا[1]۔ ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کی اکثریت فقہ حنفی کے مقلدین کی ہے ان کے برعکس اہلِ حدیث کو غیر مقلد (یا وہابی) کہا جاتا ہے (حالانکہ یہ نسبت ہر اہلحدیث کی طرف درست نہیں ہے) قرآن اور حدیث کے متعلق حنفی حضرات کا عقیدہ کیا ہے اس کے متعلق فقہ حنفی کے پیشوا اور مسلّم امام ابوالحسن عبیداللہ الکرخی کا قول ہے :-

ہر وہ آیت جو اس طریقے کی مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو مؤوّل ہے یا منسوخ ہے اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ مؤوّل یا منسوخ ہے۔

(بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی ص۲۳۱)

یعنی دین میں سند فقہ حنفی کے ائمہ ہیں۔ اور ہر وہ آیت یا حدیث جو ان کے فیصلوں کے خلاف جاتی ہو اس کی یا تو ایسی تاویل کی جائے گی جس سے وہ ان فیصلوں کے مطابق ہو جائے اور اگر وہ کسی تاویل سے بھی ان کے مطابق نہ بیٹھے تو اس کے متعلق سمجھ لینا چاہئیے کہ

[1] تفاصیل کے لئے دیکھئے تاریخ الفقہ الاسلامی از علامہ محمد الخضری اور سیرۃ النعمان مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی۔

فقہ حنفی کے متعلق مودودی صاحب کی رائے

وہ منسوخ ہے یہ ہے وہ فقہ جس کے متعلق مودودی صاحب کی تجویز یہ ہے کہ اسے مملکت پاکستان کا قانون بنا دیا جائے اس فقہ میں حدیث کا جو مقام ہے اس پر امام کرخیؒ کا مذکورہ بالا قول واضح ہے یعنی ان کے نزدیک اتباع اپنے امام کے فیصلہ کی ہے نہ کہ حدیث کی لیکن مودودی صاحب خود ہی یہ لکھ چکے ہیں کہ :-

جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنتِ رسول روشن ہو جائے اس کے لئے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔

(تفہیمات حصہ اول صـ۳۶۵)

فقہ حنفی میں کتنے ایسے احکام ہیں جو صاف صاف حدیثوں کے خلاف ہیں اس کے متعلق تفصیل سے لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں مقلدوں اور غیر مقلدوں کے آئے دن کے مناظرے اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ خود مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابو حنیفہؒ اور اُن کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔ (رسائل و مسائل صـ۲۷۴-۲۷۵)

تقلید کے متعلق لکھتے ہیں :-

میرے نزدیک ایک صاحب علم کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ (رسائل و مسائل صـ۲۲۴)

دوسرے مقام پر ہے :-

اسلام میں دراصل تقلید سوائے رسول اللہ کے اور کسی کی نہیں اور رسول اللہ کی تقلید بھی اس بناء پر ہے کہ آپ جو کچھ فرماتے اور عمل کرتے ہیں وہ اللہ کے اِذن اور فرمان کی بناء پر ہے ورنہ اصل میں تو مطاع اور آمر اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔

(رسائل ومسائل صہ ۲۳۶)

مجتہد کی صحیح پوزیشن کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ :-

یہیں سے نبی اور مجتہد کا فرق واضح ہوتا ہے۔ نبی کی بصیرت براہِ راست علمِ الٰہی سے مستفاد ہوتی ہے اس لئے اس کے احکام تمام ازمنہ واحوال کے لئے مناسب ہوتے ہیں مگر مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو زمان اور مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا نہ اس کی نظر تمام ازمنہ واحوال پر وسیع ہو سکتی ہے لہذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔

(تفہیمات حصہ دوم صہ ۳۲۶)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :-

انسان بہر حال کمزوریوں کا مجموعہ ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا مجتہد بھی غلطی کر سکتا ہے اور کر جاتا ہے۔ (تفہیمات حصہ اول صہ ۳۲۴)

وہ خود بعض مسائل میں فقہ حنفی سے اختلاف رکھتے ہیں۔ چنانچہ رسائل ومسائل کے صہ ۲۴۱ پر لکھتے ہیں کہ :-

نماز جمعہ میں شرط مصر کے متعلق مجھے عام علمائے حنفیہ سے اختلاف ہے۔

انہوں نے بڑی شدّ ومد سے لکھا ہے کہ فقہیات کو اصل دین سمجھنے کی ذہنیت بڑی افسوسناک

ذہنیت ہے چنانچہ وہ رسائل و مسائل کے صد ۲۸۲ پر رقم طراز ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ فقہیات[1] کو اصل دین سمجھنے کی جس ذہنیت کے باعث مسلمان مدتوں آپس میں جھگڑے کرتے رہے ہیں اور جس کی وجہ سے ان کا متحد ہونا اور اصل دین کے لئے مل کر کام کرنا غیر ممکن ہو گیا ہے وہی ذہنیت بار بار ہر وقت کار آنے چلی جا رہی ہے۔

غور فرمائیے اب یہی مودودی صاحب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ پاکستان کی اسلامی مملکت کا قانون فقہ حنفی ہونا چاہیئے یعنی جس ذہنیت کا رونا آج تک رویا جا رہا تھا اسی ذہنیت کو اب پوری کی پوری قوم پر بطور ملکی قانون مسلط کرنے کے مشورے دیئے جا رہے ہیں یہ وہی فقہ ہے جسے وہ "منجمد شاستر" کی اصطلاح سے تعبیر کر چکے ہیں۔ چنانچہ وہ "سیاسی کشمکش" حصہ سوم میں لکھتے ہیں کہ اسلام کے حق میں جو چیز شدید تر رکاوٹ ہے وہ ہماری یہ جامد اور بے روح مذہبیت ہے جسے آج کل اسلام سمجھا جا رہا ہے۔ اس مسخ شدہ مذہبیت میں بنیادی نقص یہ ہے کہ:۔

اس میں اسلامی شریعت کو ایک "منجمد شاستر" بنا کر رکھ دیا گیا ہے اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہدِ گزشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے۔ (صد ۳۶)

یہ ہے وہ "منجمد شاستر" جس کے متعلق اب تجویز فرمایا جا رہا ہے کہ اسے ملک کا قانون بننا

[1] فقہیات اصل دین نہیں ہیں۔ یہی بات اگر ہم کہہ دیتے ہیں تو منکرِ حدیث اور منکرِ فقہ کا لیبل ہم پر چسپاں کر دیا جاتا ہے مگر ان لوگوں کی زبان کوئی نہیں پکڑتا۔

چاہیئے تاکہ اکثریت ان کے ساتھ رہے

ایسا پرانا قانون اب کیسے چل سکیگا

آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کے نزدیک وہ فقہ جس پر مسلمان اس وقت کاربند ہیں کس طرح ایک منجمد شاستر کی حیثیت رکھتا ہے اور اس فقہ کو دین سمجھنے والی ذہنیت کس طرح دین کی راہ میں شدید ترین رکاوٹ بنی ہوئی ہے لیکن جب یہی اعتراض ان پر کیا جاتا ہے کہ اس قدر پرانے زمانے کے فقہی احکام آج کے حالات میں کس طرح کام دے سکتے ہیں تو وہ فوراً اپنا رخ بدلتے ہیں اور ایک دم آسا رُک کے ساتھ فرماتے ہیں کہ کون کہتا ہے کہ یہ قانون پرانا ہو چکا ہے۔ تفصیل انہی کی زبان سے سنئے اور ورطۂ حیرت میں ڈوب جائیے کہ جس فقہی قانون کے متعلق ابھی ابھی یہ کچھ کہا جا رہا تھا اس کے متعلق اب کیا ارشاد ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

جن حضرات کی طرف سے یہ اعتراض (کہ صدیوں کا پرانا قانون جدید زمانے کی ایک سوسائٹی اور اسٹیٹ کی ضروریات کے لئے کس طرح کافی ہو سکتا ہے) پیش کیا جاتا ہے، مجھے شبہ ہے کہ وہ اسلامی قانون کے متعلق ابتدائی اور سرسری واقفیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں! غالباً انہوں نے کہیں سے بس یہ اڑتی اڑتی خبر سُن لی ہے کہ اس قانون کے بنیادی احکام اور اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے بیان ہوئے تھے۔ اس کے بعد یہ بات انہوں نے بطور خود فرض کر لی کہ اُس وقت سے یہ قانون جوں کا توں اُسی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ اسی بنا پر انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر آج ایک جدید ریاست اسے اپنا ملکی قانون بنا لے تو وہ اس کی وسیع ضروریات کے لئے کیسے کافی ہو سکے گا۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ جو بنیادی احکام و اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دیئے گئے تھے ان پر اُسی وقت ایک ریاست قائم ہو گئی اور

روزمرہ پیش آنے والے معاملات میں تعبیر[1] و قیاس واستحسان واجتہاد کے ذریعے سے اس قانون کا ارتقا اوّل روز ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ پھر اسلامی اقتدار وسیع ہو کر بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس تک آدھی سے زیادہ مہذب دنیا پر پھیل چکا تھا۔ اور جتنی ریاستیں بھی بعد کے بارہ سو سال میں مسلمانوں نے قائم کیں اُن سب[2] کا پورا نظم و نسق اُسی قانون پر چلتا رہا۔ ہر دور اور ہر ملک کے حالات وضروریات کے مطابق اس قانون میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے انیسویں صدی کی ابتداء تک اِس ارتقاء کا سلسلہ ایک دن کے لئے بھی نہیں رُکا ہے۔ خود آپ کے اِس ملک میں بھی انیسویں صدی کے اوائل تک اسلام ہی کا دیوانی اور فوجداری

---

[1] ملاحظہ فرمایئے اوّل روز ہی سے یعنی جناب رسالتمآب صلعم کے عہد باسعادت ہی سے اس قانون کا ارتقا شروع ہو گیا تھا اور وہ ارتقاء وحیٔ غیر متلو کے ذریعہ سے نہیں بلکہ تعبیر، قیاس، استحسان واجتہاد کے ذریعہ سے شروع ہوا تھا اسی حقیقت کا اظہار جب ہم کرتے ہیں تو ہمیں منکرِ حدیث کہا جاتا ہے۔

[2] لہٰذا اُس دور کی تمام لعنتیں مثلاً بادشاہت وملوکیت وجاگیرداریت وغیرہ بھی سب اسی قانون کی برکات ہوں گی جن کے ساتھ خلفائے بنوامیہ وبنوعباس ودیگر امراء کی عیاشیوں کی شرمناک داستانیں، معیشی اور معاشرتی ناہمواریاں، باہمی خوں ریزیوں اور مظالم ومفاسد کی لرزہ خیز داستانیں بھی شامل کر لیجئے اور پھر یہ بھی کہ امام حسین، محمد ابن النفس الذکیہ، امام ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبلؒ، مجدد سرہندیؒ وغیرہ اکابرینِ ملت نے اسی قانونی نظم و نسق کے خلاف بغاوت کرنے کے جرم میں قتل وقید کے مصائب برداشت کئے ہوں گے جو پورا کا پورا اسی قانونِ شریعت پر مشتمل تھا۔ اِنّا للہ وانّا الیہ راجعون!!

نظامِ اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنا سر دے کر اس خطرے کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رُکا۔ ان کے بعد حضرت علیؓ آگے بڑھے اور انہوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر اُن کی جان کی قربانی بھی اُس انقلابِ معکوس کو نہ روک سکی۔ آخر کار خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ختم ہو گیا اور ملکِ عضوض (

) نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔ (ترجمان القرآن ص ۳۶-۳۵ دسمبر ۱۹۴۰ء وجنوری ۱۹۴۱ء)

یعنی مودودی صاحب فرما رہے تھے کہ اس بارہ سو سال کے عرصہ میں مسلمانوں نے جہاں جہاں اپنی ریاستیں قائم کیں ان کا پورا نظم ونسق اسلامی نظام پر چلتا رہا ہے اور اب یہ فرما رہے ہیں کہ اولاً تو حضرت عثمانؓ کے زمانہ ہی میں لیکن کامل طور پر حضرت علیؓ کے بعد حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔ اب یہ سنیے کہ حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد اس جاہلیت نے اسلام کے ساتھ کیا کیا فرماتے ہیں۔

حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد جاہلیت نے مرضِ سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیئے۔ کیونکہ اقتدار کی کنجی اب اسلام کے بجائے اس کے ہاتھ میں تھی اور اسلام زورِ حکومت سے محروم ہونے کے بعد اس کے نفوذ واثر کو بڑھنے سے نہ روک سکتا تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی۔ بلکہ مسلمان '' بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریے یا مشرکینؒ کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا۔ مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم وصلوٰۃ پر عمل، قرآن وحدیث سے استشہاد تھا۔ اور اس

قانون جاری رہا۔ اب زیادہ سے زیادہ صرف سو سال کا وقفہ ایسا رہ جاتا ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ اُس زمانے میں اسلامی قانون پر عمل درآمد بند رہا اور اس کا ارتقا رکا رہا لیکن اولاً تو یہ وقفہ کچھ اتنا زیادہ بڑا نہیں ہے کہ ہم تھوڑی سی محنت و کاوش سے اس کے نقصان کی تلافی نہ کر سکیں۔ دوسرے ہمارے پاس ہر صدی کی فقہی ترقیات کا پورا ریکارڈ موجود ہے جسے دیکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف پہلے کتنا کام کر چکے ہیں اور آگے ہمیں کیا کام کرنا ہے۔ (اسلامی قانون ص۲۵ - ۲۶)

یعنی ابھی ابھی مودودی صاحب فرمارہے تھے کہ چوتھی صدی ہجری سے علماء نے اجتہاد کو حرام قرار دے رکھا ہے جس کی وجہ سے اسلامی قانون منجمد شاستر بن کر رہ گیا ہے لیکن اب فرماتے ہیں کہ بارہ سو سال سے مسلسل ہر دور اور ہر ملک کے حالات و ضروریات کے مطابق اس قانون میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے اور اس ارتقاء کا سلسلہ ایک دن کے لئے بھی نہیں رُکا۔ ان دونوں باتوں میں سے بہر حال ایک ہی صحیح ہو سکتی ہے۔ دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اس بارہ سو سال کے عرصہ میں جتنی ریاستیں بھی مسلمانوں نے قائم کیں، ان سب کا پورا نظم و نسق اسی قانون پر چلتا رہا، یعنی بنو اُمیّہ، بنو عباس، آلِ عثمان حتیٰ کہ ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت تک پورا نظم و نسق اسلامی قانون ہی کے مطابق تھا۔ ہندوستان میں صرف ایک سو سال تک اس سلسلہ کا ارتقا رکا رہا ہے جسے نہایت آسانی سے پورا کیا جا سکتا ہے یعنی ان کے ارشاد کے مطابق اسلامی قانون وہ تھا جو مغلوں کے آخری دور میں ہندوستان میں رائج تھا اور جو آج بلا انقطاع افغانستان، ایران، عراق، شام، مصر اور حجاز وغیرہ میں نافذ العمل ہے۔ یہی وہ اسلامی قانون ہے جسے مودودی صاحب پاکستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مودودی صاحب اور اُن کے ہمنوا حضرات کو تو چھوڑیئے ہم پاکستان کے سنجیدہ طبقہ سے

پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ان کے نزدیک بھی اسلام کا منشاء و مقصود وہی کچھ تھا جو سو سال پہلے تک ہندوستان میں پورا ہوتا رہا ہے اور جو آج باقی اسلامی ممالک میں پورا ہو رہا ہے۔ اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ اسلام کا منشاء اسی قسم کی صورتِ حالات پیدا کرنا تھا تو بسم اللہ، پاکستان میں وہی قانون نافذ کر دیجئے اور اپنی حالت ویسی ہی بنا لیجئے جیسی غدر کے زمانے تک تھی یا جیسی آج افغانستان، عرب و عراق کی ہے اور اگر سمجھتے ہیں کہ یہ صورتِ حالات تو قطعاً ایسی نہیں جس پر مسلمان تو ایک طرف، ایک عام انسان بھی فخر کر سکے گا تو پھر سوچئے کہ یہ جدید قسم کی ملّا ازم آپ کو کدھر لئے جا رہی ہے؟

حضرت عمرؓ کے بعد ہی اسلام کے تمام شعبوں پر جاہلیت چھا چکی تھی

مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ اس بارہ سو سال میں جتنی ریاستیں بھی مسلمانوں نے قائم کیں ان سب کا پورا نظم و نسق اسلامی قانون پر چلتا رہا لیکن ذرا سنیئے کہ اس سے پہلے وہ خود کیا ارشاد فرما چکے ہیں۔ وہ اپنے مضمون "تجدید و احیائے دین" میں اسلامی نظامِ حکومت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے اس کام کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اس کام کو اُسی جامعیت کے ساتھ جاری رکھا۔

> پھر زمامِ قیادت حضرت عثمانؓ کی طرف منتقل ہوئی اور ابتداءً چند سال تک وہ نقشہ بدستور جمارہا جو نبی علیہ الصلوٰۃ نے قائم کیا تھا مگر ایک طرف حکومتِ اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو اُن کے جلیل القدر پیشروؤں کو عطا ہوئی تھیں۔ اس لئے جاہلیت کو اسلامی

کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا ہمیشہ جاہلیتِ صریحہ کے مقابلہ کی نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور کوئی مسلمان اعلانیہ اس کی حمایت نہ کر سکے گا، مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جایئے تو منافقین ہی نہیں، بہت سے اصلی مسلمان بھی اس کی حمایت پر کمر بستہ ہو جائیں گے اور اُلٹا آپ کو موردِ الزام بنا ڈالیں گے۔ جاہلی امارت کی مسند اور جاہلی سیاست کی رہنمائی پر "مسلمان" کا جلوہ افروز ہونا، جاہلی تعلیم کے مدرسے میں "مسلمان" کا معلّم ہونا، جاہلیت کے سجادہ پر "مسلمان" کا مرشد بن کر بیٹھنا وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔

اس معکوس انقلاب کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی تھا کہ اسلام کا نقاب اوڑھ کر تینوں قسم کی جاہلیتوں نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کر دیں اور ان کے اثرات بد روز بروز زیادہ پھیلتے چلے گئے۔

یہ تین قسم کی جاہلیتیں مودودی صاحب کے نزدیک جاہلیتِ خالصہ، جاہلیتِ مشرکانہ، جاہلیتِ راہبانہ تھیں۔ جاہلیتِ خالصہ نے اسلامی نظام کو کس طرح متأثر کیا اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:۔

جاہلیتِ خالصہ نے حکومت اور دولت پر تسلط جمایا۔ نام خلافت کا تھا اور اصل میں وہی بادشاہی تھی جس کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ بادشاہوں کو اِلٰہ کہنے کی ہمت کسی میں باقی نہ تھی۔ اس لئے السلطان ظل اللہ کا بہانہ اختیار کیا گیا اور

اس بہانہ سے دینی مطاعِ مطلق کی حیثیت بادشاہوں نے اختیار کی جوالہٰ کی ہوتی ہے۔ اس شاہی کی سرپرستی میں امراء و حکام، ولاۃ، اہلِ لشکر اور مترفین کی زندگیوں میں کم و بیش خالص جاہلیت کا نقطۂ نظر پھیل گیا اور اس نے اُن کے اخلاق اور معاشرت کو پوری طرح ماؤف کر دیا پھر یہ بالکل ایک طبعی امر تھا کہ اس کے ساتھ ہی جاہلیت کا فلسفہ، ادب اور ہنر بھی پھیلنا شروع ہوا۔ اور علوم و فنون بھی اسی طرز پر مرتب و مدون ہوں کیونکہ یہ سب چیزیں دولت اور حکومت کی سرپرستی چاہتی ہیں اور جہاں دولت اور حکومت جاہلیت کے قبضہ میں ہوں وہاں ان پر بھی جاہلیت کا تسلط ناگزیر ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یونان اور عجم کے فلسفے اور علوم و آداب نے اُس سوسائٹی میں راہ پائی جو اسلام کی طرف منسوب تھی اور اس کی دراندازی سے "کلامیات" کی بحثیں شروع ہوئیں، اعتزال کا مسلک نکلا، زندقہ اور الحاد پر پُرزے نکالنے لگا اور عقائد کی موشگافیوں نے نئے نئے فرقے پیدا کر دیئے۔

یعنی مودودی صاحب کی تحقیق کے مطابق جب حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد جاہلیتِ خالصہ مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی نظام پر مسلط ہوئی ہے تو رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی کہ ان کی تمدنی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو اسلامی بنیادوں پر قائم رہ گیا ہو اور اُس نے جاہلیتِ راہبانہ کے ساتھ مل کر سوسائٹی کے اچھے عناصر کو مارفیا کا انجکشن دے کر سُست کر دیا، بادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا، اسلامی علوم و فنون میں جمود اور تنگ خیالی پیدا کی اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کر کے رکھ دیا۔ (ایضاً ص ۳۴)۔

اس کے ساتھ جاہلیتِ مشرکانہ نے پرانی عبادات کی رسموں کو بدل کر نئی رسمیں ایجاد کیں۔ اس کام میں دنیا پرست علماء نے ان کی بڑی مدد کی اور وہ بہت سی مشکلات

اُن کے راستے سے دور کر دیں جو شرک کو اسلام میں نصب کرنے میں پیش آسکتی تھیں" (ایضاً ص۲۷) اس کے بعد انہوں نے یہ لکھا تھا کہ ایک مجدد کا کام یہ ہوگا کہ وہ احیائے نظام اسلامی کرے جس کے معنی ہیں :۔

جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین لینا اور از سرِ نَو حکومت کو عملاً اُس نظام پر قائم کر دینا جسے صاحب شریعت نے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نام سے موسوم کیا ہے" (ایضاً ص۴۱)

یعنی رسول اللہ نے حکومت کو اسلامی نظام پر قائم کیا یہ نظام اپنی اصلی شکل میں حضرت عمرؓ کے دور تک قائم رہا اس کے بعد اس میں جاہلیت نے راہ پانا شروع کر دی اور حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اس پورے نظام کی جگہ نظامِ جاہلیت نے لے لی جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر گوشہ پر مسلط ہو گئی اور یہی نظامِ جاہلیت آج تک قائم ہے۔ اور اب ایک مجدد کا کام یہ ہے کہ اس نظامِ جاہلیت کو الٹ کر از سرِ نَو نظامِ حکومت کی بنیاد اُسی منہاج پر رکھے کہ جس پر اُسے رسول اللہؐ نے متشکل فرمایا تھا۔ مودودی صاحب نے ان خیالات کا اظہار ۱۹۴۰ء میں فرمایا تھا لیکن آج وہی مودودی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اس بارہ سو سال کے عرصہ میں مسلمانوں نے جتنی ریاستیں بھی قائم کیں ان سب کا پورا نظم و نسق اُسی قانون پر چلتا رہا جو ساڑھے تیرہ سو برس پہلے بیان ہوئے تھے اور اب کرنے کا کام فقط اتنا ہے کہ اُسی نظام کو (جو ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی وجہ سے منقطع ہو گیا تھا) پاکستان میں رائج کر دیا جائے اس طرح پاکستان صحیح اسلامی مملکت بن جائے گا۔

یہ تضاد کیوں | آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ ایک ہی شخص اسلام کی اصل و اساس

کے متعلق اس قدر متضاد باتیں کس طرح کہہ سکتا ہے لیکن حالات پر نگاہ رکھنے والوں کے لئے اس کی وجہ معلوم کر لینا کچھ دشوار نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں حکومت کی مسندیں مودودی صاحب کے تصور تک میں بھی نہیں آسکتی تھیں اُس وقت اُن کے سامنے مسلم لیگ کے مقابلہ میں اپنی جماعت سازی اور اس کی قیادت کے مقابلہ میں اپنی امارت کا خیال تھا چنانچہ وہ اپنے مذکورہ صدر مضمون میں مجددینِ سابقہ کی ناکامیوں پر تبصرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان سے پہلا سبق یہ ملتا ہے کہ:۔

تجدیدِ دین کے لئے صرف علومِ دینیہ کا احیاء اور اتباعِ شریعت کی روح کو تازہ کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ایک جامع اور ہمہ گیر اسلامی تحریک کی ضرورت ہے۔ جو تمام علوم و افکار، تمام فنون و صناعات اور تمام شعبہ ہائے زندگی پر اپنا اثر پھیلا دے اور تمام امکانی قوتوں سے اسلام کی خدمت لے اور دوسرا سبق جو اس سے قریب الماخذ ہے یہ ہے کہ اب تجدید کا کام نئی اجتہادی قوت کا طالب ہے محض وہ اجتہادی بصیرت جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ یا اُن سے پہلے کے مجتہدین و مجددین کے کارناموں میں پائی جاتی ہے اس وقت کے کام سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔

(ایضاً صفحہ ۹۷-۹۸)

لیکن اب سوال حکومت کی کرسیوں کا آگیا اور ان کے حصول کا طریقہ اصول جمہوریت کے مطابق یہی ہے کہ اکثریت کو ساتھ رکھا جائے اب مسلمانوں سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تمہارے آباؤ اجداد بارہ سو برس سے نظامِ جاہلیت پر کاربند چلے آرہے تھے اب اُن سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس بارہ سو سال میں تمہارے آباؤ اجداد نے جہاں جہاں بھی ریاستیں قائم کیں اُن کا پورا نظم و نسق اسلامی قانون کے عین مطابق تھا اور وہی نظم و نسق میں رائج

کرنا چاہتا ہوں یہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اس بارہ سو سال میں اسلام اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہا اور مسلمانوں کی سلطنتوں کا نظم و نسق اسلامی نظام کے مطابق نہیں تھا اور نہ ہی آج ہے، یہ سب فتنہ پرداز ہیں، خدا اور رسول کے منکر اور تمہارے اسلاف کی توہین کرتے ہیں۔

اصل حقیقت اصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کے عہدِ مبارک کے تھوڑے عرصہ بعد ہی اسلام اپنی اصلی پٹڑی سے اتر گیا تھا اور اس کے بعد اس میں رفتہ رفتہ تمام غیر اسلامی عناصر داخل ہو گئے تھے۔ ہمارا تمام لٹریچر اسی دور کا پیدا شدہ ہے جس میں اسلام غیر اسلامی (عجمی) عناصر سے بدلا جا چکا تھا۔ ہماری تاریخ، ہماری احادیث، ہماری تفاسیر سب اسی دور کی تخلیق ہیں۔ یہی حالت ہمارے قانون (فقہ) کی بھی ہے۔ اس کی تو تدوین ہی خالص ملوکیت کے زمانہ میں ہوئی تھی اور پھر اس کے بعد آج اس کا بھی علم نہیں کہ جناب ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگردوں نے کیا فیصلے کئے تھے اور آج جس چیز کا نام فقہ حنفی ہے، وہ کون کون سے عناصر کا مجموعہ ہے۔ ان حالات میں ان میں سے کسی چیز کے متعلق بھی یہ فرض کر لینا کہ وہ بالکل اسلام کے مطابق ہے، بنیادی غلطی ہے۔ اس تمام طومار میں صرف اللہ کی کتاب ایسی ہے جو اپنی اصل شکل میں اِس وقت تک قائم ہے اور چونکہ مطاعِ حقیقی صرف خدا ہے اس لئے ہمیں اس تمام ذخیرہ پر قرآن کی روشنی میں تنقیدی نگاہ ڈالنی چاہیئے اور اس طرح کھرے کو کھوٹے سے الگ کر دینا چاہیئے۔ کسی انسان کے قول یا اس کی طرف منسوب شدہ اقوال کو تنقید کی حد سے بالاتر قرار دے دینا قرآن کے بنیادی ذہن کے خلاف ہے۔

یہی وہ مسلک تھا جو خود امام اعظم نے اختیار کیا چنانچہ اور تو اور وہ تو صحابہؓ کے متعلق بھی یہ کہتے کہ میں ان کے اقوال میں سے جس کو چاہتا ہوں لیتا ہوں اور جس کو چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں۔ باقی رہے دیگر مجتہدین تو اُن کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ :-

جب ابراہیم شعبی، حسن ابن سیرین (اور بھی کئی مجتہدین کے نام لئے ہیں۔)
تک معاملہ پہنچتا ہے تو مجھے یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ جس طرح اُن لوگوں
نے اجتہاد کیا ہے اسی طرح میں بھی کروں۔

(تاریخ فقہ اسلامی ص۳۲)

لہٰذا خود امام اعظمؒ کی تقلید بھی اسی میں ہے کہ جس طرح انہوں نے خود اجتہاد کیا تھا ہم بھی خود اجتہاد کریں۔ جس طرح اُن کے دور میں نئے نئے حالات پیش آتے تھے اور اُن کے لئے انہیں نئے نئے استنباطات کرتے پڑتے تھے، اُسی طرح ہمارے دور میں بھی نئے نئے حالات پیدا ہو رہے ہیں اور ہمیں بھی اُن کے متعلق خود فیصلے کرنے چاہئیں لہٰذا صحیح اسلامی نظام یہ ہے کہ ہم (ہم سے مراد ہر دور کے مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ) قرآن کریم کو اپنے نظام کا محور قرار دیں اور اس کے اصول کی روشنی میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود جزئیات متعین کریں۔ ان جزئیات کے تعین میں ہم اُن کوششوں کو بھی سامنے رکھیں گے جو اس سے پہلے اسی نہج واسلوب پر ہوتی رہی ہیں۔ اُن میں جو چیزیں ایسی ہوں گی جن میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے گا۔ دوسروں میں مناسب تبدیلیاں کر دی جائیں گی اور نئے امور کے نئے فیصلے کئے جائیں گے۔ اور اس ساری کوشش کی اصل و بنیاد یہ ہو گی کہ کوئی

سے قرآنِ کریم کے اصول سے نہ ہٹے ۔ یہ ہے اسلامی نظام کی صحیح روح ۔ یہی رسول اللہ نے کیا تھا اسی کے مطابق اُس خلافت کے دور میں عمل رہا جو علیٰ منہاج النبوۃ قائم تھی اور اُسی کے مطابق پھر سے اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے ۔ مسلمانوں نے جتنی جلدی اس حقیقت کو سمجھ لیا اتنی ہی جلدی ان کا قدم اُس صراطِ مستقیم پر اُٹھ جائے گا جو اُن کے اللہ نے اُن کے لئے تجویز کی تھی اور جس کا نتیجہ حال کی شادابیاں اور مستقبل کی کامرانیاں ہیں ۔

پریسٹ ھڈ (مُلّاازم)
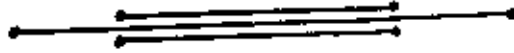
پرِیسٹ ھُڈ

فروری ۱۹۵۳ء

جب کسی سے یہ کہا جائے کہ اسلام میں پریسٹ ھُڈ (ملّائیت) نہیں ہے تو اس سے مُلّا کو بے حد غصّہ آجاتا ہے اُس کا یہ غُصّہ ہے بھی قابلِ فہم۔ اس لئے کہ پریسٹ ھُڈ ختم ہو جانے سے خُود مُلا بھی ختم ہو جاتا ہے اور اپنی ہستی کو قائم رکھنے کا جذبہ انسان اور حیوان سب کے اندر جبلّی طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ تقاضا ایسا بنیادی ہے کہ اور تو اور، ابلیس نے بھی خدا سے کہہ دیا تھا کہ مجھے قیامت تک کے لئے زندہ رکھا جائے اس لئے ملّا اسے کس طرح آسانی سے برداشت کر سکتا ہے کہ اسلام میں پریسٹ ھڈ باقی نہ رہے۔ وہ تو سارا زور اس میں لگائے گا کہ اسلام باقی رہے یا نہ رہے پریسٹ ھڈ ضرور باقی رہے۔ مسلمانوں کی ساری تاریخ ملّا کی اسی کوششِ زلوں حاصل کی داستان ہے۔ چونکہ ہمارے زمانہ میں یہ خیال روز افزوں عام ہو رہا ہے کہ اسلام میں پریسٹ ھُڈ کی گنجائش نہیں اور مسلمانوں کی تباہی کا باعث مُلا ہے، اس لئے مُلا نے بھی اپنی مدافعت کے لئے ہر حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ پاکستان میں ملائیت کے منظّم ادارے کے سرخیل سیّد ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہیں چنانچہ وہ اپنی خاص جرنلسٹ ٹیکنیک

کے ذریعہ ملازم کے جواز کی دلیلیں بہم پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں انہوں نے اگلے دنوں کراچی کی بار ایسوسی ایشن کے ایک اجتماع میں تقریر کی جو ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے وہ اپنی تقریر کے دوران میں فرماتے ہیں:۔

> حال ہی میں ایک نرالہ اندازِ فکر پیدا ہوا ہے کہ اسلام میں پریسٹ ہڈ نہیں ہے۔ قرآن اور سنت اور شریعت پر کوئی ملا کا اجارہ نہیں ہے کہ بس وہی ان کی تعبیر کرنے کا مجاز ہو جس طرح وہ تعبیر احکام اور اجتہاد و استنباط کرنے کا حق رکھتا ہے، اُسی طرح ہم بھی یہی حق رکھتے ہیں۔ اگر جہالت کی اس طغیانی کو یوں بڑھنے دیا گیا تو بعید نہیں کہ کل کوئی اُٹھ کر کہے کہ اسلام میں وکیل ہڈ نہیں ہے اس لئے ہر شخص قانون پر بولنے کا حق ہے اُس نے قانون کا ایک لفظ نہ پڑھا ہو اور پرسوں کوئی دوسرے صاحب اٹھیں اور فرمائیں کہ اسلام میں انجینئر ہڈ نہیں ہے اس لئے ہم بھی انجینئرنگ پر کلام کریں گے چاہے ہم اس فن کی الف بے سے بھی واقف نہ ہوں اور پھر کوئی تیسرے صاحب اسلام میں ڈاکٹر ہڈ کا انکار کر کے مریضوں کا علاج کرنے کھڑے ہو جائیں بغیر اس کے کہ ان کو علمِ طب کی ہوا بھی لگی ہو۔

آپ غور کیجئے کہ مودودی صاحب نے ایک غلط تشبیہ کو کس طرح دلیل بنا کر پیش کر دیا

غلط تشبیہ

ہے اور اس کے بعد خوش ہو گئے ہیں کہ ہم نے اسلام میں پریسٹ ہڈ کا وجود ثابت کر دیا ہے ظاہر ہے کہ وکالت ڈاکٹری اور انجینئری فنی پیشے ہیں اور ان کے لئے ان خاص فنون کا علم ضروری ہے سوال یہ ہے کہ کیا دین بھی اسی قسم کی فنی چیز ہے جس کے لئے خاص قسم کی ٹیکنیکل تعلیم کی ضرورت ہے ہم پوچھتے

یہ ہیں کہ دین کی وہ کون سی ٹیکنیکل تعلیم تھی جسے صحابۂ کرام نے حاصل کیا تھا جس کے بعد وہ دین کے معاملہ میں بات کرنے کے قابل ہو گئے تھے کیا انہوں نے اُن اٹھارہ فنی علوم میں سے کسی ایک کی بھی تحصیل کی تھی جو آج ہمارے دینی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اور جن کی تحصیل کے بعد اس طالب علم کو "عالم" بننے کی سند عطا ہوتی ہے کیا قرآن میں کہیں ایک جگہ بھی یہ لکھا ہے کہ جب تک یہ اٹھارہ علوم نہ پڑھے جائیں گے قرآن سمجھ میں نہیں آئے گا حقیقت یہ ہے کہ ان کو فن بنانے کے لئے مُلّا نے خود ہی یہ اٹھارہ علوم وضع کئے۔ اور اس کے بعد اس کا اعلان کر دیا کہ ان علوم کے مجموعے کا نام دین ہے دین کے متعلق یہ بنیادی تصور ہی باطل ہے اس لئے اس غلط بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت بناء علی الفاسد ہے جہاں تک ہدایت کا تعلق ہے قرآن کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ یہ خود قرآن کا دعویٰ ہے وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ ۵۴/۱۷ کہ ہم نے ہدایت و رہنمائی کے لئے قرآن کو آسان بنا دیا ہے لیکن مُلّا کا یہ کہنا ہے کہ اللہ میاں (معاذ اللہ) غلط کہتے ہیں۔ قرآن بہت مشکل ہے اور اس کے سمجھنے کے لئے ان اٹھارہ علوم کی ضرورت ہے جو انسانوں کو دین اور دنیا دونوں میں ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ دین انسانی زندگی کے روزمرہ کے معاملات سے بحث کرتا ہے اور روزمرہ کے معاملات فنی علوم کے محتاج نہیں ہوا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے یہ حکم دیا کہ ان معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کیا کرو۔ قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ یہ مشورہ ان لوگوں سے لیا کرو جن کی پیٹھ پر ان اٹھارہ علوم کی کتابوں کے پشتارے لدے ہوئے ہوں۔ قرآن نے مشاورت کے لئے کوئی حدود نہیں کھینچیں۔ اسے ملّت کے لئے عام کر دیا لیکن مُلّا نے اسے اُن علما تک محدود کر دیا جو ان اٹھارہ علوم کے حامل ہوں اِسی کا نام پرویسٹ ہڈ"

ہے۔اس کی نہ اسلام میں گنجائش ہے اور نہ ہی عقل وفکر رکھنے والی قوم کو ضرورت۔قوم کی پارلیمان (مجلسِ مشاورت) ملّت کے عام نمائندوں پر مشتمل ہو گی نہ کہ ٹیکنیکل علوم کے ماہرین پر۔یہی مسلک قرآن نے تجویز کیا تھا اور اسی کو دنیا کی باقی قوموں نے بھی اختیار کر رکھا ہے یہ ہے فرق دین میں اور ڈاکٹری اور انجینیئری میں۔ڈاکٹر اور انجینیئر کی مثال کو دین پر منطبق کرنا وہ منطقی التباس ہے جو آج کل کے جرنلزم کا خاص فن سمجھا جاتا ہے۔

پریسٹ ہُڈ کی اجارہ داری کی اس سے بھی زیادہ تنگ شکل یہ ہے کہ ان لوگوں نے دین کی (AUTHORITY) کو ایک خاص وضع قطع کے ساتھ مشروط قرار دے رکھا ہے ان کے نزدیک ایک خاص وضع قطع رکھنے والا اس قابل ہو جاتا ہے کہ اُسے علماء کے زمرہ میں شامل کر لیا جائے خواہ اُس نے ان کے کسی دینی مدرسے سے ان علوم کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہ بھی کی ہو۔لیکن جو اُس قسم کی وضع قطع نہ رکھتا ہو، وہ خواہ اٹھارہ علوم چھوڑ چھتیس علوم کا عالم بھی کیوں نہ ہو، علماء کے زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتا۔ایک دفعہ ایک مُلّا ٹائپ نے علاّمہ اقبالؒ کے متعلّق کہا تھا کہ آپ انہیں اسکالر تو کہہ سکتے ہیں عالم نہیں کہہ سکتے ہیں یہی وہ ضرورت تھی جس کے ماتحت خود مودودی صاحب کو بھی یہ خاص وضع اختیار کرنی پڑی اِس سے پہلے وہ مسٹر تھے لیکن اس کے بعد وہ مولانا ہو گئے حالانکہ کسی دینی درسگاہ کی سند نہ ان کے پاس پہلے تھی نہ اس کے بعد حاصل کی۔آپ نے خیال فرمایا کہ وہ مسٹر سے مولانا کیسے ہو گئے؟ صرف وضع قطع کی تبدیلی سے۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

جس طرح ہر شخص قانون پڑھ کر وکیل اور جج بن سکتا ہے اور ہر شخص انجینیئرنگ پڑھ کر اور طب پڑھ کر ڈاکٹر بن سکتا ہے اسی طرح ہر شخص قرآن اور سنّت کے علم پر

وقت اور محنت صرف کر کے مسائلِ شریعت میں کلام کرنے کا مجاز ہو سکتا ہے۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا آج سارے پاکستان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جو مولویوں جیسی وضع قطع نہ رکھتا ہو لیکن اُس نے وقت اور محنت صرف کر کے قرآن اور سنّت کا علم حاصل کر رکھا ہو اگر کوئی ایسا شخص ہے تو ہم دوسرا سوال یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ لوگوں نے آج تک دستور سازی کے سلسلہ میں جس قدر اجتماعات کئے ہیں ان میں کسی ایسے مسٹر کو بھی دعوت دی ہے؟ آپ نے اندازہ لگایا کہ ان حضرات کے نزدیک شریعت کا علم ان اٹھارہ علوم میں ہی محصور نہیں اس کے لئے ایک خاص وضع قطع کی بھی شرط ہے۔

یہی وہ پریسٹ ہڈ کی ذہنیت ہے جس کے خلاف آج علم اور عقل اس طرح احتجاج کر رہے ہیں اور جس احتجاج کو سُن کر ملّا کے منہ میں جھاگ آجاتے ہیں اگر مودودی صاحب خود اس ذہنیت کا تماشا دیکھنا چاہیں تو ذرا اپنی ڈاڑھی منڈوا دیں اور پھر دیکھیں کہ یہ اکتیس علماء جو اِس وقت اُنہیں اِس طرح سر آنکھوں پر اُٹھائے اٹھائے پھر رہے ہیں (حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے پاس دینی علوم کی کوئی سند بھی نہیں ہے) اپنے کسی مشورہ میں اُنہیں عالِم کی حیثیت سے شریک ہونے کی اجازت دیتے ہیں؟ آپ وکیلوں، ڈاکٹروں اور انجینیروں میں ڈاڑھی والے بھی دیکھیں گے اور ڈاڑھی منڈے بھی لیکن مولویوں کی صف میں کبھی ڈاڑھی منڈا نظر نہیں آئے گا۔ اور ڈاڑھی والے سے وہ پوچھیں گے بھی نہیں کہ تم نے کسی دینی درس گاہ میں باضابطہ تعلیم بھی پائی ہے؟

خود اِن اکتیس علماء کی فہرست کو اٹھا کر دیکھئے جنہوں نے کراچی میں اسلامی دستور کا خاکہ مرتّب فرمایا تھا اور جو آجکل دستور کے متعلق تنقیدی بحث کے لئے پھر کراچی میں جمع ہیں، کئی لوگ ایسے ہیں جن کے پاس کسی دینی درس گاہ کی باضابطہ سند نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود دین میں (AUTHORITY) کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس؛ اس فہرست میں کسی ایک ڈاڑھی منڈے کا بھی نام نہیں ہے۔

دوسری بات پوچھنے کے قابل یہ ہے کہ یہ اجتماع اس لئے ہوا تھا کہ کانسٹی ٹیوشن کے متعلق اپنی سفارشات مرتب کرے۔ سوال یہ ہے کہ ان میں سے کتنے حضرات ایسے تھے جنہوں نے کانسٹی ٹیوشن کے متعلق اسی طرح تعلیم حاصل کی ہے جس طرح انجینئر، انجینئرنگ کے متعلق اور ڈاکٹر، ڈاکٹری کے متعلق تعلیم حاصل کر کے انجینئر یا ڈاکٹر بنتا ہے۔ ایک انجینئر، انجینئرنگ کی تعلیم کے بغیر تو انجینئر نہیں بن سکتا۔ لیکن یہ مولوی صاحبان کانسٹی ٹیوشن کی کوئی تعلیم حاصل کئے بغیر کانسٹی ٹیوشن کے ماہر ضرور بن سکتے ہیں۔

یہ ہے وہ پریسٹ ہڈ جسے ماڈرن ازم کے نقاب میں عام کیا جا رہا ہے۔

پَرِلیسٹ ھُڈ ۲
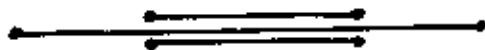
(مُلّا کا مَبلغِ علم)

(اپریل ۱۹۵۳ء)

(مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ قانون سازی صرف علماء حضرات کا کام ہے۔ لیکن یہی مودودی صاحب اس سے قبل انہی علماء حضرات کے متعلق فرما چکے ہیں کہ انہیں معلوم ہی نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس کی تفصیل خود اُن کی زبان سے سنئے یہ تمام اقتباسات طلوعِ اسلام بابت اپریل ۵۳ء میں شائع ہوئے تھے یعنی جو کچھ نیچے لکھا جا رہا ہے وہ سب مودودی صاحب کی تحریریں ہیں۔")

آپ کے ہاں امامت کا معیار حد سے زیادہ پست ہو چکا ہے جو منصب مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں سب سے زیادہ اہم تھا وہ اب سب سے زیادہ غیر اہم ہے جس منصب کے لئے بہتر سے بہتر آدمی منتخب کرنے کا حکم تھا اب اس کے لئے بدتر سے بدتر آدمی چھانٹا جاتا ہے مسلمانوں کے ذہن میں اب امام کا تصوّر یہ ہے کہ جو شخص دنیا کے کسی اور کام کا نہ ہو اُس کو مسجد کا امام ہونا چاہیئے۔ دس پانچ روپیہ تنخواہ اور دونوں

وقت کی روٹی مقرر کردی اور کسی نیم خواندہ مُلاّ کو رکھ لیا یہ گویا مسجد کی امامت کا انتظام ہو گیا۔ امامت کو اس درجہ پست کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری مسجدیں، وہی مسجدیں جنہوں نے کبھی ہماری قوم کے قصر فلک بوس کی تعمیر کی تھی آج ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو بے علم، تنگ نظر، پست حوصلہ اور دنی الاخلاق ہیں کیا۔ ان لوگوں سے امید رکھتے ہیں کہ یہ اُردو میں خطبے دے کر آپ کی دنیوی و دینی رہنمائی کر سکیں گے؟

اس گروہ کو چھوڑ کر اگر آپ نے جمعہ کی امامت کے لئے کسی دوسرے گروہ کا انتخاب کرنا چاہا تو لامحالہ اس کے لئے آپ کو علماء ہی کے طبقے کی طرف رجوع کرنا ہو گا اور بااستثنائے چند اس طبقے کے سوادِ اعظم کا جو حال ہے اسے بیان کرنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے۔ ان حضرات کو اگر آپ نے علم فہم زبان میں سن مانے خطبے دینے کا موقع دیا تو یقین جانیئے کہ آئے دن مسجدوں میں سر پھٹول ہو گی اس لئے کہ ان میں کا ہر شخص اپنا ایک الگ مشرب رکھتا ہے اور اپنے مشرب میں وہ اتنا سخت ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا اُس کے نزدیک گناہ سے

مولوی کی زبان کا ڈنک

کم نہیں۔ پھر اللہ نے اُس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کئے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا۔ وہ جس ماحول سے تعلیم و تربیت پاکر آتا ہے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے، وہاں دین کے مہمات اور قوم کے مصالح کے لئے کوئی جگہ نہیں، تمام دلچسپیاں سمٹ کر چند چھوٹی چھوٹی نزاعی باتوں میں جمع ہو گئیں ہیں اس لئے

ؔ ہر مولوی اپنے اور اپنے ہم نواؤں کیلئے اس قسم کی گنجائش رکھ لیتا ہے۔ طلوعِ اسلام۔

لامحالہ وہ جب زبان کھولے گا، انہی مسائل کو کھولے گا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کے گھر میں گالم گلوچ اور جوتی پیزار ہو گی اور آخر کار ہر مشرب کے مسلمان اپنے جمعے الگ الگ قائم کرنے لگیں گے یہ تو مذہبی ذہنیت رکھنے والوں کا حال ہوا۔ رہے نئے تعلیم یافتہ حضرات جو ان مسائل سے دلچسپی نہیں رکھتے تو ان پر ایک دوسری مصیبت نازل ہو گی وہ ہر جمعہ کو رسولؐ اللہ کے منبر پر سے وہ موضوع اور ضعیف روایتیں اور لاطائل کہانیاں اور احکامِ اسلامی کی غلط تعبیریں سنیں گے جن کو سن کر غیر مسلموں کا مسلمان ہونا تو درکنار، ذی ہوش مسلمانوں کا مسلمان رہنا بھی مشکل ہے۔

مذہبی دھڑے بندیوں کے علاوہ اب مسلمانوں میں سیاسی دھڑے بندی کا بھی زور ہو رہا ہے جہاں کہیں مولوی قسم کے مسٹروں یا مسٹر قسم کے مولویوں کو امامت و خطابت کا موقع مل گیا ہے وہاں وہ نہایت منہ پھٹ اور بے لگام طریقے سے اپنے سیاسی مسلک کی تائید اور مسلکِ مخالف کے لوگوں کی تذلیل و تضحیک و تفسیق کرنے لگے ہیں، یہ ایک اور فتنہ ہے جو اگر کچھ زیادہ بڑھ گیا تو مسلمانوں کے لئے مل کر نماز پڑھنا بھی مشکل ہو جائے گا مسجدوں میں وہ کچھ ہونے لگے گا جو پولنگ اسٹیشنوں پر ہوا کرتا ہے اور بالآخر ہر سیاسی مسلک کے لوگوں کی مسجدیں الگ ہو کر رہیں گی۔ (تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۲۵۸-۲۵۹)

مولوی کا علم

علماء کی عام حالت یہ ہے کہ وہ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں اُن پر اظہارِ نفرت تو ان سے جتنا جی چاہے کرا لیجئے لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اُٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لئے جو پیچیدہ عملی اور علمی مسائل پیدا کر دیئے

ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے اس لئے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اُس کے قوانین کو بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر یا ان کی تحریروں کو پڑھ کر بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو۔

(تنقیحات صـ۲۸)

انیسویں صدی کے آغاز میں سلطان سلیم نے اس کمزوری کو محسوس کیا اور انتظام سلطنت کی اصلاح، علومِ جدیدہ کی اشاعت، طرزِ جدید پر عسکری تنظیم اور جدید مغربی آلاتِ حرب کی ترویج شروع کی لیکن جاہل صوفیوں اور تنگ نظر علماء نے جو دین کے علم اور اس کی روح سے قطعاً بے بہرہ تھے مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی یوروپین طرز پر فوج کی تنظیم کو بے دینی سے تعبیر کیا جدید فوجی وردیوں کو تشبہ بالنصاریٰ قرار دیا سنگین تک کے استعمال کی اس لئے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحہ استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا سلیم کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کر کے اسلام کو خراب کر رہا ہے شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے فتویٰ دیا کہ ایسا بادشاہ جو قرآن کے خلاف عمل کرتا ہو، بادشاہی کے لائق نہیں آخر ۱۸۰۷ء میں سلیم کو معزول کر دیا گیا یہ پہلا موقع تھا کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی جہالت اور تاریک خیالی سے اسلام کے مانعِ ترقی ہونے کا غلط

مولوی کا جمود

تخیل پیدا کیا۔

زمانے کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے دوسرے مسلمانوں کی نسبت ترکوں پران تغیرات کا زیادہ اثر پڑ رہا تھا وہ یورپ کے مقابلے میں بالکل سینہ بسینہ کھڑے تھے اور برسرپیکار تھے مغربی قوموں کے ساتھ ان کے سیاسی، تمدنی اور تجارتی تعلقات نہایت گہرے تھے اور خود ان کی ماتحت یورپین اور عیسائی قومیں سرعت کے ساتھ مغرب کے اثرات قبول کر رہی تھیں۔ مگر ترکوں کے مذہبی پیشواؤں نے جو تَفَقُّہ اور اجتہاد سے بالکل عاری اور اسلام کی حقیقی تعلیمات سے قطعاً ناواقف تھے، ان تغیرات کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اور ترکی قوم کو مجبور کیا کہ سات سو برس قبل کی فضا سے ایک قدم آگے نہ بڑھیں سلیم کے بعد محمود نے اصلاح کی کوششیں کیں اور علماء اور مشایخ نے پھر مخالفت کی بڑی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد ۱۸۲۶ء میں محمود اس قابل ہو سکا کہ جدید عسکری تنظیم کو رائج کر سکے۔ مگر علماء اور درویش برابر یہی تبلیغ کرتے رہے کہ یہ اصلاحات بدعت ہیں۔ ان سے اسلام کو خراب کیا جا رہا ہے۔ سلطان بے دین ہو گیا ہے اور طرز جدید کی فوج میں بھرتی ہونا مسلمانوں کے لئے خرابیٔ ایمان کا موجب ہے۔ (تنقیحات ص۲۶-۲۷)

ایک طرف ترکی قوم میں اتنے بڑے انقلاب کی ابتداء ہو رہی تھی۔ دوسری طرف ترکوں کے علماء اور مشایخ تھے جواب بھی ساتویں صدی کی فضاؤں سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے۔ اُن کے جمود، اُن کی تاریک خیالی، اُن کی رجعت پسندی اور زمانے کے ساتھ حرکت کرنے سے اُن کے قطعی انکار کا اب بھی وہی حال تھا جو سلطان سلیم کے زمانہ میں تھا وہ اب بھی کہہ رہے تھے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے حالانکہ ان کی آنکھوں

کے سامنے الحاد کا دروازہ کھل رہا تھا وہ ابھی تک فلسفہ کلام کی وہی کتابیں پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھے جن کو پھینک کر زمانہ پانچ سو برس آگے نکل چکا تھا۔ وہ اب بھی اپنے وعظوں میں قرآن کی وہی تفسیریں اور وہی ضعیف حدیثیں سنا رہے تھے جن کو سن کر سو برس پہلے تک کے لوگ تو سر دُھنتے تھے مگر آجکل کے دماغ ان کو سن کر صرف ان مفسرین و محدثین ہی سے نہیں بلکہ خود قرآن و حدیث سے بھی منحرف ہو جاتے ہیں۔

خرافات

وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی میں وہی فقہی قوانین نافذ کئے جائیں جو شامی اور کنز الدقائق میں لکھے ہوتے ہیں، خواہ اس اصرار کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ ترک ان قوانین کے اتباع سے بھی آزاد ہو جائیں جو قرآن اور سنّتِ رسولؐ میں مقرر کئے گئے ہیں۔ (تنقیحات صـ)

مغلوں کے زمانہ میں عام طور پر جو حالت طبقہ متوسط کی تھی وہی علماء کی بھی تھی۔ اُن میں بیشتر وظیفہ خوار تھے کسی نہ کسی بادشاہ یا امیر یا درباری سے وابستہ ہو جانا اُس کے وظیفے کھا کر اُس کی منشا کے مطابق دین اور دینی قوانین کی تعبیر کرنا، اپنے ذاتی مفاد کو دین کے تقاضوں پر مقدم رکھنا اُن کا شعار تھا۔

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۵۱ء جنوری ۱۹۵۲ء)

تضادات

تضادات ۱ء

(مارچ ۱۹۵۲ء)

معاہدات کے متعلق تضاد بیانیاں

اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ کسی قوم کی اخلاقی سطح کتنی بلند ہے تو دیکھنا یہ چاہیئے کہ دوسری قوموں کے ساتھ معاہدات کے معاملہ میں اس کی روش کیا ہے۔ بین الاقوامی معاہدات کے متعلق ایک مسلک تو وہ ہے جسے یونان کے مدبر و مفکر سولن نے ذیل کے الفاظ میں بیان کیا ہے اور جس پر ابلیسی سیاست کا عمل درآمد ہو رہا ہے اور آج بھی ہے یعنی۔

معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو پھانس لیتا ہے اور اپنے سے طاقتور کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

اس کے برعکس، دوسری روش وہ ہے جو قرآن نے بیان کی ہے اور جس کی رو سے اس نے اُمّتِ مسلمہ کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ:۔

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۲/۱۷۷

وہ لوگ جو معاہدہ کرنے کے بعد اسے پوری طرح نباہتے ہیں۔

اور وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۱۳/۲۰ وہ کبھی عہد و پیمان کو نہیں توڑتے قرآن نے معاہدات کی

پابندی کے لئے کس شدت سے تاکید کی ہے۔ اس کے متعلق کسی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں (نہ ہی اس کی تفصیل اِس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے) اس وقت اس مختصر سی تمہید کے بعد ہمیں کچھ اور عرض کرنا ہے۔

حال کا فیصلہ

گزشتہ نومبر ۱۹۵۱ء میں کراچی میں اسلامی جماعت کا اجتماع ہوا اس میں امیرِ جماعت سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی افتتاحی تقریر میں اپنی جماعت کے مَوقف اور اس کے مختلف اہم فیصلوں کی تائید میں بہت کچھ بیان دیا۔ اسی ضمن میں معاہدات کے متعلق بحث سامنے آگئی تو انہوں نے فرمایا۔

حقیقت یہ ہے کہ اصولِ اخلاق کے لحاظ سے بہت بڑا فرق ہے اُن معاہدات میں جو دو فریق اپنی آزاد مرضی اور مساویانہ طریقے سے باہم طے کریں اور اُن معاہدات میں جو ایک فریق کی کمزوری یا مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دوسرا فریق حاصل کرلے۔ اخلاق کی نگاہ میں یہ دو الگ الگ نوعیتوں کے معاہدے ہیں اور ان دونوں کا حکم ہرگز یکساں نہیں ہوسکتا۔ جو معاہدے فریقین کی آزادانہ رضامندی سے مساویانہ طریقے پر طے ہوئے ہیں وہ یقیناً وزنی اور قیمتی معاہدے ہیں۔ ان کی پوری کی پوری پابندی ہونی چاہیئے۔ ان کی خلاف ورزی حرام ہے ان میں کسی قسم کے ردّ و بدل کا ایک فریق کو حق نہیں پہنچتا لیکن جو معاہدہ فریقین کی آزادانہ رضامندی سے مساویانہ طریقے پر طے نہ ہوا ہو، بلکہ جس کو ایک فریق نے اپنے زور سے حاصل کیا ہو اور دوسرے نے اپنی کمزوری یا مجبوری کی بناء پر مانا ہو، وہ اخلاقی حیثیت سے کوئی وزن اور قیمت نہیں رکھتا۔ اس کا قیام و بقا اخلاق پر نہیں بلکہ فریقین کے حالات پر منحصر ہے جب تک وہ حالات باقی رہیں جن میں اس نوعیت

کا معاہدہ ہوا تھا، صرف اُسی وقت تک ایسا معاہدہ نافذالعمل رہ سکتا ہے اور جب حالات بدل جائیں، جب ظالم کا زور ٹوٹ جائے اور مظلوم کی کمزوری یا مجبوری باقی نہ رہے تو ایسے معاہدے کو آپ سے آپ ٹوٹ جانا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ جو اخلاقی ذمہ داری مظلوم فریق پر عائد ہوتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ حالات بدل جانے پر وہ پہلے ظالم فریق کو معاہدے پر نظرِ ثانی کرنے کی دعوت دے لیکن اگر اس کے دعوت دینے کے باوجود ظالم فریق نہ مانے تو مظلوم فریق کو پورا حق پہنچتا ہے کہ اُس کا معاہدہ اُس کے منہ پر مار دے یا معاہدے میں انصاف کے مطابق ترمیم کر دے۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ:

یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں یہ کوئی میرا من گھڑت اخلاقی اصول نہیں ہے، بلکہ شریعت اسلامی میں اس کی بنیاد موجود ہے۔ اسلامی قانون سُود کے معاہدے کو تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ اس میں ایک فریق اپنی برتر مالی پوزیشن کی بناء پر سُود کی شرط عائد کرتا ہے اور دوسرا فریق اپنی مالی کمزوری اور اپنے حالات کی مجبوری سے اس شرط کو قبول کرتا ہے، اسی طرح اسلامی قانون بیعِ مُضطَر کو بھی تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ اس میں ایک فریق دوسرے کو پریشان حال دیکھ کر اس کی ہزار روپے مالیت کی چیز کے پانچ روپے دام لگاتا ہے اور دوسرا فریق اپنی مصیبت سے مجبور ہو کر ان داموں اپنی چیز بیچ دیتا ہے، یہ اصول صرف شخصی معاملات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی معاملات میں بھی اس کی نظیریں موجود ہیں، مثال کے طور پر صلحِ حدیبیہ کے معاہدے کو لیجیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ مکہ کے درمیان طے ہوا تھا، اس معاہدہ میں منجملہ دوسری شرائط کے، ایک شرط یہ بھی تھی کہ مدینہ سے جو لوگ بھاگ کر مکہ آجائیں گے انہیں تو کفارِ مکہ واپس نہ کریں گے مگر مکہ سے جو لوگ بھاگ کر مدینہ جائیں گے انہیں

انہیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم واپس کر دیں گے۔ یہ صریح طور پر ایک غیر معقول اور غیر منصفانہ شرط تھی جو کفارِ مکہ کے اصرار پر مانی گئی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس مجبوری سے اس کو قبول کیا تھا کہ کفارِ مکہ اس کے بغیر آپ کو اور مسلمانوں کو زیارتِ کعبہ کا حق دینے کے لئے تیار نہ تھے حالانکہ عرب کے قدیم ترین مسلّمہ قاعدے کے مطابق نہ حرمِ کعبہ اہلِ مکہ کی جائیداد تھا اور نہ انہیں کسی کو ان کی زیارت سے روکنے کا یا اس پر کوئی شرط عائد کرنے کا حق تھا اس لئے ان کی یہ شرط قطعی غیر منصفانہ تھی اور ایک صاحبِ حق کی مجبوری سے بالکل ناجائز فائدہ اٹھا کر منوائی گئی تھی اب دیکھئے کہ قرآن اس شرط کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے۔ جہاں تک مردوں کا تعلق تھا قرآن نے اس کو باقی رہنے دیا مگر جب کچھ عورتیں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئیں اور کفارِ مکہ نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تو قرآن میں صاف حکم آگیا کہ ان عورتوں کو واپس نہ کیا جائے یہ صریح طور پر بین الاقوامی معاہدے کی یک طرفہ ترمیم تھی اور اس کے جواز کی اس کے سوا اور کوئی بنیاد نہ تھی کہ جس معاہدے کو ایک فریق نے دوسرے فریق کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تسلیم کرایا ہو اس کی اخلاقی حیثیت ہرگز وہ نہیں ہے جو فریقین کی مساویانہ اور آزادانہ مرضی سے طے کئے ہوئے معاہدوں کی ہوتی ہے اس طرح کے ایک معاہدے میں مظلوم فریق کو حق پہنچتا ہے کہ اگر پورا معاہدہ ظالمانہ ہو تو موقع پاکر اسے ظالم کے منہ پر مار دے۔ اور اگر معاہدہ کی کچھ شرطیں ناقابلِ برداشت ہوں تو انصاف کو ملحوظ رکھ کر ان میں مناسب ترمیم کر دے یہ ایک مستقل اصول ہے جو قرآن کے اس فیصلے

سے مستنبط ہوتا ہے۔

اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں کہ مودودی صاحب نے معاہدات کی جو تقسیم کی ہے وہ کیسی ہے اور اس میں جس "اخلاقی اصول" کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی حیثیت کیا ہے اس وقت صرف یہ دیکھنا ہے کہ مودودی صاحب نے اصول یہ بیان فرمایا ہے کہ معاہدہ کرنے کے بعد اگر کمزور فریق کے حالات تبدیل ہو جائیں تو اسے حق حاصل ہے کہ وہ معاہدہ کی جس شق کو غیر منصفانہ سمجھے اس میں یک طرفہ ترمیم کرلے اس سے نقضِ عہد کا جرم عائد نہیں ہوتا اس کے لئے انہوں نے "خدا کے حکم اور رسول اللہ کے عمل" سے تائیدی شہادت بہم پہنچائی ہے (جس کے متعلق ہم آگے چل کر عرض کریں گے) یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔

سابقہ فیصلہ

۱۹۴۸ء میں مودودی صاحب نے مسئلہ کشمیر کے متعلق بعض خیالات کا اظہار فرمایا تھا اُن میں بنیادی نکتہ یہ تھا کہ حکومتِ پاکستان کی یہ روش کہ اُس نے ہندوستان کے ساتھ صُلح کا معاہدہ بھی کر رکھا ہے اور کشمیر میں جنگی کارروائی بھی جاری ہے شریعتِ اسلامی کے یکسر خلاف ہے۔ اِس باب میں انہوں نے اپنے بیان میں کہا تھا :-

---

لہ یہ بحث کسی دوسرے وقت کی جائے گی اس وقت صرف اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ معاہدات کا قیام و توثیق کسی قانون کی رو سے ہوتا ہی نہیں اِس کا سارا دار و مدار اخلاقی ضابطہ کی رو سے ہوتا ہے۔ جسے "بین الاقوامی" قانون کہا جاتا ہے اس کی حیثیت درحقیقت قانون کی نہیں ہوتی کیونکہ قانون اُسے کہتے ہیں جسے کوئی قوتِ نافذہ منوا سکے۔ جب تک بین الاقوامی قانون کے پیچھے اس قسم کی قوتِ نافذہ نہ ہو اُس وقت تک بین الاقوامی معاہدات کی حیثیت قانون کی نہیں ہو سکتی۔ ان کی حیثیت محض اخلاقی پابندی کی ہوتی ہے۔

اسلام نے جیں سکھایا ہے یا تو کسی قوم سے معاہدہ نہ کرو یا اگر معاہدہ کرتے ہو تو پھر پوری ایمانداری کے ساتھ اس کی پابندی کرو۔ اور جب دیکھو کہ فریق ثانی اپنے معاہدوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو اس کا معاہدہ کھلم کھلا اس کے منہ پر مار دو۔ پھر تم آزاد ہو کر اُس کے خلاف جو کارروائی کرنا چاہو کرو۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ۔ ۸/۵۸

اور اگر کسی قوم سے تمہیں خیانت کا اندیشہ ہو تو برابری کے ساتھ اُن کا عہد اُن کی طرف پھینک دو (یعنی اس طرح کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ تمہارا اور اُن کا معاہدہ باقی نہیں رہا) حقیقت یہ ہے کہ اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔

(ترجمان القرآن بابت ۱۹۴۸ء)

یہاں مودودی صاحب نے معاہدات کی کوئی قسمیں نہیں گنائیں بلکہ مطلق معاہدہ کے متعلق یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ یا تو اس کی پوری پوری پابندی کرو اور یا اسے فریق مقابل کے منہ پر دے مارو۔ یہ نہیں کہ اُس کی کسی ایک شق میں از خود یک طرفہ تبدیلی کر لو۔ اس کے بعد انہوں نے (ترجمان القرآن بابت اگست ۱۹۴۸ء میں) اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں لکھا تھا۔

اسلام کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ جب کسی قوم کے ساتھ کچھ شرائط ہو جائیں (خواہ وہ مرغوب ہوں یا نہ ہوں) تو اس کے بعد اُن شرائط سے سرِ مو بھی تجاوز نہ کیا جائے بلا لحاظ اس کے کہ فریقین کی اعتباری حیثیت اور طاقت اور قوت (RELATIVE POSITION) میں کتنا فرق آ جائے۔

اس سے پہلے بھی انہوں نے اپنی کتاب "الجہاد فی الاسلام" میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا:۔

اس سے بھی پہلے اسلامی قانون نے جنگ اور صلح دونوں حالتوں میں وفائے عہد کی سخت تاکید کی ہے حقیقتہً اخلاقیاتِ اسلام کے قواعدِ اصلیہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کو سخت سے سخت ضرورت کی حالت میں بھی اپنے عہد پر قائم رہنا چاہیئے۔ بدعہدی سے خواہ کتنا ہی بڑا فائدہ پہنچتا ہو اور وفائے عہد سے کتنا ہی شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اسلام بہرصورت اپنے پیرؤوں کو تاکید کرتا ہے کہ اس فائدے کو چھوڑ دیں اور اس نقصان کو برداشت کریں یہ کلیہ جس طرح انفرادی وشخصی زندگی پر حاوی ہے اسی طرح اجتماعی و قومی زندگی پر بھی حاوی ہے...... اسلام اس معاملہ میں فرد اور جماعت، رعیت اور حکومت شخص اور قوم میں کوئی امتیاز نہیں کرتا اور بدعہدی کو ہر حال میں ہر غرض کے لئے ناجائز قرار دیتا ہے۔ (صنہ ۱۵۰)

اس ضمن میں انہوں نے یہ حدیث بھی نقل فرمائی ہے کہ:۔

رسول اللہ نے فرمایا جس کا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو اُس میں کوئی تغیر و تبدیل نہ کرے تاوقتیکہ اس کی مدت گذر نہ جائے۔ یا پھر خیانت کا خوف ہو تو برابری کو ملحوظ رکھ کر اس کو ختمِ معاہدہ کا نوٹس دیدے۔ (صہ ۱۸۳)

یہ دونوں باتیں آپ کے سامنے آگئیں۔ پہلے شریعت کا فیصلہ یہ تھا کہ:۔

(۱) اسلام کے قواعدِ اصلیہ میں سے یہ ہے کہ انسان کو سخت سے سخت ضرورت کی حالت میں بھی اپنے عہد پر قائم رہنا چاہیئے۔

"ii بدعہدی ہر حال میں ہر غرض کے لئے ناجائز ہے۔

(iii) شرائطِ معاہدہ مرغوب ہوں یا نہ، ان میں سرِمو تجاوز نہیں کیا جاتا، خواہ فریقین کی اعتباری حیثیت میں کتنا ہی فرق آجائے؟

(iv) رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو جائے تو اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ کرے تاوقتیکہ اس کی مدت نہ گزر جائے۔

اور اب ارشاد ہوتا ہے کہ

(۷) جو معاہدہ فریقین کی آزادانہ رضامندی سے مساویانہ طریق پر طے نہ ہوا ہو، اس کا قیام و بقا اخلاق پر نہیں بلکہ فریقین کے حالات پر منحصر ہے حالات بدل جانے پر اس میں یک طرفہ ترمیم بھی کی جا سکتی ہے۔

اور اس کے لئے بھی (بزعمِ خویش) خدا کا حکم اور رسول کا عمل بطور تائید پیش کر دیا جاتا ہے

ایسے اہم معاملہ میں اس قسم کے متضاد احکام اور دونوں احکامِ شریعت ہم اس باب میں کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ البتہ مودودی صاحب نے اپنے فتوے کی تائید میں خدا اور اس کے رسول کے خلاف جو بہتان تراشا ہے (کہ صلحِ حدیبیہ میں پہلے یہ شرط داخل کر لی کہ جو لوگ مکہ سے بھاگ کر مدینہ جائیں گے انہیں واپس کر دیا جائے گا اور اس کے بعد اس میں از خود یہ ترمیم کر لی کہ واپس صرف مردوں کو کیا جائے گا عورتوں کو نہیں۔) اس کے متعلق صرف اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اوّل تو

معاہدۂ صلح میں یہ جو شرط تھی کہ جو مسلمان مکہ سے واپس چلا جائے گا وہ پھر مکہ کو واپس کر دیا جائے گا اس میں صرف مرد داخل تھے۔

(سیرۃ النبی از شبلی حصہ اوّل ص ۴۴۳)

اور اگر مودودی صاحب کو اس پر بھی اصرار ہو کہ نہیں، معاہدہ میں عورتیں بھی شامل تھیں تو

ہم انہیں چیلنج دیتے ہیں کہ وہ قرآن سے یہ ثابت کر دیں کہ اس نے جن مہاجرات

کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اگر اپنے ایمان میں مخلص ہوں تو انہیں اُن کے کافر شوہروں

کی طرف نہ لوٹایا جائے وہ عورتیں معاہدۂ حدیبیہ کے بعد (اور اس کی مدتِ نفاذ کے

اندر) مکہ سے مدینہ آئی تھیں۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۔ ۲/۲۴

تضادات ۲

رسول کی حیثیتیں

(مئی ۱۹۵۲ء)

قرآنِ حکیم تمام آسمانی کتابوں میں سے صراحت کے ساتھ اس کا اعلان کرتا ہے کہ حاکمِ مطلق بجز اللہ کے اور کوئی نہیں ..... اس لئے کسی انسان پر کسی دوسرے انسان کی اطاعت

پہلا بیان

فرض نہیں ہے قرآن کے نزول کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان کی گردن سے غیر اللہ کی اطاعت کا قلادہ نکال دے اور اللہ یعنی مطاعِ حقیقی کا بندہ بنانے کے بعد اس کو رائے اور ضمیر کی پوری پوری آزادی عطا کر دے۔ چنانچہ انسانی غلامی کے خلاف سب سے بڑھ کر جس کتاب نے جہاد کیا ہے وہ قرآن ہی ہے ..... یہ مقدمہ ذہن نشین کر لینے کے بعد اس امر کی تحقیق کیجئے کہ نبی کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے اور جس پر دین کا مدار ہے، کس حیثیت سے ہے یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں کہ وہ نبی خاص شخص مثلاً ابنِ عمران یا ابنِ مریم یا ابنِ عبداللہ ہے۔ قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم ہو،

اسی لئے اللہ تعالیٰ بار بار اپنے نبی سے اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے دراصل نبی بحیثیت انسان کی اطاعت نہیں ہے بلکہ نبی بحیثیت نبی کی اطاعت ہے۔ یعنی اُس علم، اس ہدایت، اُس حکم اور اُس قانون کی اطاعت ہے جسے اللہ کا نبی اللہ کی طرف سے اُس کے بندوں تک پہنچاتا ہے..... اسلام آیا ہی اس لئے ہے کہ غیر اللہ کی بندگی اور انسان پر انسان کی خداوندی کا قلع قمع کر دے۔ اور اگر کوئی انسان خدا کا نہیں خود اپنا کوئی خیال پیش کرے تو مسلمان پر اس کی اطاعت فرض نہیں وہ آزادی کے ساتھ خود سوچنے اور رائے قائم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کو آزادانہ اتفاق کرنے کا بھی اختیار ہے اور آزادانہ اختلاف کرنے کا بھی، اس معاملہ میں علماء اور ائمہ اور حکام تو درکنار، خود نبی کی رائے سے بھی اختلاف کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں (ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۳۴ء)

دوسرا بیان

لیکن یہ تفریق جو انہوں نے (علامہ اسلم جیراجپوری نے) محمد ابن عبداللہ بحیثیت انسان اور محمد رسول اللہ بحیثیت مبلغ کے درمیان کی ہے، قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں۔ قرآن میں آنحضرت کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول و نبی ہونے کی حیثیت ہے، جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا اُس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا ..... حتیٰ کہ آپ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے..... قرآن کریم میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرتؐ کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسان اور حیثیتِ امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔"

(ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، تفہیمات حصہ اوّل، صہ ۲۴۲)

پھر سن لیجئے کہ بات کیا ہوئی؟

(۱) اسلام میں جو نبی کی اطاعت فرض کی گئی ہے اور جس پر دین کا مدار ہے، وہ اس حیثیت سے ہرگز نہیں کہ وہ نبی خاص شخص مثلاً محمد ابنِ عبداللہ ہے وہ اطاعتِ نبی بحیثیت نبی کی ہے۔

(۱) محمد ابنِ عبداللہ بحیثیتِ انسان اور محمد رسول اللہ بحیثیتِ مبلغ کی تفریق قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں۔ قرآن میں آنحضرت کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے۔ وہ رسولِ دینی کی حیثیت ہے۔

(۲) قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم ہو۔

(۲) قرآن کریم میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بناء پر آنحضرت کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسانی میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔

(۳) نبی کی ذاتی رائے سے اختلاف کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا

(۳) نبی کی ذاتی رائے ہوتی ہی نہیں، کیونکہ اس کا ہر قول اور ہر فعل رسولِ خدا کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

نیز یہ بھی اگر کوئی انسان خدا کا نہیں، خود اپنا کوئی خیال پیش کرے تو مسلمان پر اس کی اطاعت فرض نہیں وہ آزادی کے ساتھ خود سوچنے اور رائے قائم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ (ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۳۶ء)

اور یہ بھی فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مر گیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔

اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن وحدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلے کی بناء قرار دیا جاسکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ (ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۳ء)

ل یتیم پوتے کی وراثت سے متعلق تفصیلی بحث طلوع اسلام کی شائع کردہ کتاب "قتل مرتد، غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت" میں دیکھئے جس میں مودودی صاحب کے فقہی مبلغ علم کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

تضادات ۔۳

(آئین سازی کے ضمن میں)

["مجلسِ آئین ساز کی منعقد کردہ "بنیادی اصولوں کی کمیٹی" کی دوسری رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے جنوری ۱۹۵۳ء میں لکھا گیا تھا"]

آپ ہماری کتاب "قرآنی دستورِ پاکستان" میں دیکھیں گے کہ ہم کتاب کے ساتھ سنت کی پوزیشن کے متعلق کتنا کچھ لکھ چکے ہیں اور کتنی مرتبہ یہ بتا چکے ہیں کہ کسی اسلامی مجلسِ مقننہ میں علماء کی جداگانہ مجلس کا وجود کس طرح دین اور سیاست کی اس ثنویت کے مرادف ہے جسے قرآن مٹانے کے لئے آیا تھا لیکن جسے بعد میں مسلمانوں نے عیسائیت کی پاپائیت اور ہندوؤں کی برہمنیت اور ایران کی مجوسیت سے مستعار لیکر اپنے ہاں داخل کر لیا۔ وہ کون سا مسلمان ہے جس کے دل میں نبی اکرمؐ کی عزت و عظمت نہ ہو۔ حضورؐ کی عظمت تو مسلمان کے ایمان کا جزو ہے لیکن جس مقصد کے لئے مولوی صاحبان کتاب کے ساتھ سنت کا لفظ ضرور لاتے ہیں وہ اتباعِ سنت کی آڑ میں خود آمریت کا تسلط ہے۔ اس حقیقت کو ہم پہلے بھی کئی بار بے نقاب کر چکے ہیں۔ اس وقت صرف اس کے نمایاں خطوط کو دوبارہ پیش کیا جاتا ہے۔

عزائم جب جماعتِ اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی پارٹی کا خاکہ پیش کیا تھا تو اس ضمن میں لکھا تھا کہ :-

یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام اور ایک نئی تہذیب کی تعمیر کا پروگرام لے کر اٹھے اور عامۂ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کر کے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۳۶ء بحوالہ جماعتِ اسلامی پر ایک نظر)

اس پارٹی کی حکومت کے متعلق مودودی صاحب نے لکھا تھا کہ "یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھے گی" (اسلام کا نظریہ سیاسی) ان عزائم اور مقاصد کو لے کر یہ جماعت وجود میں آئی اب اس کے بعد کتاب و سنت کی اُس سپر کا جائزہ لیجئے جس کی آڑ میں مودودی صاحب اپنا آمرانہ نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مسلک کا تجزیہ حسبِ ذیل ہے۔

(۱) شرعی نظام کتاب و سنت پر مبنی ہو گا۔

(۲) کتاب اللہ صرف مجمل احکام دیتی ہے جن کی تفصیل سنتِ رسول کے اندر ملتی ہے لہٰذا شرعی نظام کے تفصیلی احکام کتبِ احادیث میں مل سکتے ہیں۔

(۳) کتبِ احادیث میں صحیح اور غلط، مستند اور ضعیف ہر قسم کی روایات ہوتی ہیں ان میں سے صحیح روایات ہی شرعی نظام کے احکام بن سکتی ہیں۔

(۴) یہ بات صرف ایک مزاج شناسِ رسول ہی بتا سکتا ہے کہ کون سی حدیث صحیح ہے اور کون سی غلط نیز اگر کسی معاملہ میں کوئی حدیث نہ ملے تو یہی مزاج شناسِ رسول بتا سکتا ہے کہ اگر رسول اللہ اس وقت موجود ہوتے تو اس معاملہ

میں آپ کا فیصلہ کیا ہوتا؟

اس تجزیہ سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ "کتاب وسنّت" سے مراد درحقیقت مزاج شناسِ رسول اللہ کے اپنے فیصلے ہوں گے جنہیں وہ سنّت رسول اللہ کا لیبل لگا کر نافذ کرے گا تا کہ اُن پر تنقید کرنے والا ذاتِ رسالت مآب کی توہین اور ان سے انکار کرنے والا معصیتِ رسولؐ کے جرم کا مرتکب گردان کر مستحقِ عقوبت قرار دیدیا جائے اور اس طرح کسی کو جرأت نہ ہو کہ ان فیصلوں کے خلاف لب کشائی کر سکے۔

یہ ہے وہ ٹکنیک جس کی رو سے مودودی صاحب اقتدار حاصل کر کے خدا اور رسولؐ کے نام پر اپنی آمریت کا سکّہ چلانا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی بدبختی ہے کہ اس کے اربابِ حل وعقد (جن میں زیرِ نظر رپورٹ کے مرتّب کنندگان بھی شامل ہیں) اس جماعت کے پروپیگنڈے سے خائف نظر آرہے ہیں اور اسی وجہ سے انہوں نے علماء کی مجلس کی تجویز رپورٹ میں شامل کر دی ہے کہہ دیا جائے گا کہ ان مجالسِ علماء کی حیثیت محض مشاورتی ہے لیکن جب آپ ایک مرتبہ اس بدّو کے اونٹ کو خیمہ کے اندر اپنی گردن داخل کر لینے کی اجازت دیدیں گے تو کچھ عرصہ کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اونٹ خیمہ کے اندر ہوگا اور عرب خیمہ کے باہر۔ یا آپ کو ان سے اس قسم کی مفاہمت کرنی پڑے گی جیسی ہماری دورِ ملوکیت میں ہر بادشاہ کو مذہبی پیشواؤں کے ساتھ کرنی پڑتی تھی۔ جب آپ کسی بل کا مسوّدہ ان علماء کے پاس بھیج دیں گے اور وہ اس کے متعلق لکھ دیں گے کہ وہ شریعت کے خلاف ہے تو اسکے بعد یا تو آپ کو ان کی بات ماننی پڑے گی (خواہ وہ عقل و فکر سے دور اور خود اسلام کے بھی خلاف کیوں نہ ہو) اور یا آپ اسے مسترد کر کے اپنا اصلی مسوّدہ پاس کر لیں گے۔ اس دوسری شکل میں ان حضرات کی ذرّیّت سارے ملک میں شور مچا دے گی کہ مجلس مقننہ کی

یہ حرکت خدا اور رسول کے خلاف الٹی میٹم ہے۔ اور اس کے بعد نہ جانے وہ بھولے بھالے عوام سے کیا کچھ نہ کرادیں۔ عوام کی اکثریت کو اپنے ساتھ رکھنے کیلئے یہ حضرات ابھی سے عجیب وغریب انداز سے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ مثلاً مودودی صاحب ایک زمانہ میں فقۂ حنفی کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ :۔

تضادات

میں اس امر کا سخت مخالف ہوں کہ علمائے کرام وقت کے رجحانات سے منہ موڑ کر بیٹھ جائیں اور اس امر کو بھول جائیں کہ وہ ہدایہ اور بدائع کے زمانۂ تصنیف میں نہیں بلکہ نت نئی سائنٹفک ایجادات اور تیز رفتار تمدنی انقلابات کے دور میں رہتے ہیں ...... قدم قدم پر عالمگیری اور تاتارخانی کو لاکر سد راہ بنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نئے زمانہ کا مسلمان قرآن وحدیث کو پیچھے چھوڑ کر جدھر منہ اٹھے گا چل نکلے گا جس طرح ترک اور ایران چل نکلے۔

(ترجمان القرآن ، اگست ۱۹۳۸ء)

ترکوں کے انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے مودودی صاحب نے لکھا تھا کہ :۔

ایک طرف ترکی قوم میں اتنے بڑے انقلاب کی ابتدا ہورہی تھی، دوسری طرف ترکوں کے علماء اور مشایخ خواب بھی ساتویں صدی کی فضا سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے ان کے جمود، ان کی تاریک خیالی، ان کی رجعت پسندی اور زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے سے اُن کے قطعی انکار کا اب بھی وہی حال تھا جو سلطان سلیم کے زمانہ میں تھا وہ اب بھی کہہ رہے تھے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہوچکا...... وہ ابھی تک اصرار کررہے تھے کہ ترکی قوم میں وہی فقہی قوانین نافذ کئے جائیں گے جو شامی اور کنزالدقائق میں لکھے ہوئے ہیں۔ (تنقیحات صـ۸۱)

یہ تو اُس زمانہ کی بات تھی، مگر اب مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ چونکہ پاکستان میں حنفیوں کی اکثریت ہے، اس لئے یہاں وہی قانون نافذ کرنا چاہیئے جو ہدایہ اور بدائع، عالمگیری اور تاتارخانیہ، شامی اور کنزالدقائق میں لکھا ہوا ہے۔ یہی مودودی صاحب جو کبھی کہا کرتے تھے کہ "میں نہ گروہِ علماء کو سراپا خیر سمجھتا ہوں اور نہ ہی جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو" (ترجمان القرآن ربیع الاوّل ۱۳۵۵ھ) اور جن کا فیصلہ یہ تھا کہ:-

"پرانے مذہبی خیال کے لوگ نوجوان ترکوں پر کفر اور فسق کے فتوے لگا رہے ہیں۔ مگر ان کو خبر نہیں کہ نوجوان ترکوں سے زیادہ گناہگار تو ترکی کے علماء اور مشائخ ہیں"

(تنقیحات صفحہ ۸۳)

اب بڑھ بڑھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ شرعی نظام کے بارے میں اُن اکتیس (۳۱) علماء کا مطالبہ کیوں نہیں مانا جا رہا جو ۱۹۵۱ء میں کراچی میں جمع ہوئے تھے۔

آپ غور فرمائیے کہ جن لوگوں کے سیاسی حربوں کا یہ حال ہو کہ اگر اُن کے کسی مشورہ کو مجلسِ مقننہ نے نہ مانا تو وہ کن کن حرکتوں پر نہ اُتر آئیں گے۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں شرعی نظام سے مقصد یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اپنے لئے جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ اس کے لئے علماء کی کسی جماعت کی ضرورت نہیں۔ قرآن سہل عربی زبان کی کتاب ہے اور اس کے سمجھنے کے لئے انسانی فکر اور اپنے زمانہ کے تقاضوں پر نگاہ کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے علم کے پرانے ذخیروں کی ضرورت لاینفک نہیں اِن کی حیثیت مشاورتی ہے۔ چنانچہ اس باب میں مودودی صاحب نے فرمایا تھا۔

قرآن اور سنّت کی تعلیم سب پر مقدّم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں

سے نہیں..... قرآن کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے۔ (تنقیحات صفحہ ۲۲۲،۱۳۳)

جہاں تک عقل اور فکر کا تعلق ہے اس کے متعلق بھی مودودی صاحب کا فتویٰ ملاحظہ فرمایئے۔ وہ ترجمان القرآن میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

امامت خواہ وہ آگ کی طرف لے جانے والی ہو یا جنت کی طرف، بہرحال اُس گروہ کا حصہ ہے جو سمع و بصر و فُؤاد کو تمام انسانی گروہوں سے بڑھ کر استعمال کریں۔ یہ انسان کے حق میں اللہ کا بنایا ہوا اٹل ضابطہ ہے اور اس میں کوئی رو رعایت نہیں ہے۔ ("بحوالہ اسلامی جماعت پر ایک نظر")

لہٰذا جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کو سامنے رکھ کر اپنے سمع و بصر و فُؤاد سے کام لیں اور اس طرح پاکستان کو اُس تباہی سے بچا لیں جس کی طرف اسے علمائے کرام کا یہ گروہ خدا اور رسولؐ کے نام کی سپر میں کشاں کشاں لئے جانے کی فکر میں ہے۔

۴- تفہیم القرآن

(مودودی صاحب کی تفسیرِ قرآن)

"اس مضمون کا صحیح مقام تو باب چہارم ——— مودودی صاحب اور قرآن ——— تھا لیکن چونکہ یہ تنقید طلوعِ اسلام (بابت مارچ ۱۹۵۱ء) میں اُس وقت شائع ہوئی جب باب چہارم کی کتابت ہو چکی تھی، اس لئے اسے اس جگہ درج کیا جاتا ہے۔ اس تفسیر میں بھی بہت سے تضادات ہیں جن کی نسبت سے اسے یہاں جگہ دی گئی ہے۔ یہ تنقید تفہیم القرآن جلد اول (طبع اول) پر شائع ہوئی تھی۔"

مودودی صاحب کی تحریروں کے متعلق طلوعِ اسلام میں بہت کچھ شائع ہو چکا ہے۔ زیرِ نظر تفسیر اُن کے رسالہ ترجمان القرآن میں بالاقساط شائع ہوتی رہی ہے جسے اب الگ جلد میں بھی شائع کیا گیا ہے۔ اس میں ترجمہ بھی ہے اور تفسیری حواشی بھی۔ انہوں نے اپنے ترجمۂ قرآن کی خصوصیت بتانے کے لئے یہ لکھا ہے کہ انہوں نے "ترجمہ کا طریقہ چھوڑ کر آزاد ترجمانی کا طریق اختیار کیا ہے۔" اس کی وجہ وہ یہ بتلاتے ہیں کہ:۔

ترجمہ کی خصوصیت

پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمہ کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے وہ روانیٔ عبارت، زورِ بیان، بلاغتِ زبان اور

تاثیرِ کلام کا فقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے پیچھے آدمی کو ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھ کر نہ اس کی روح وجد میں آتی ہے نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ نہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے نہ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب و جگر تک اترتی چلی جا رہی ہے۔ (دیباچہ صٓ)

یعنی مودودی صاحب نے بتایا یہ ہے کہ ان کے آزاد ترجمہ سے یہ اثرات مرتب ہو جائیں گے جو دوسروں کے لفظی ترجموں سے نہیں ہوتے۔ مودودی صاحب کا یہ بلند آہنگ دعویٰ کہاں تک پورا ہوا ہے؟ اس کا اندازہ ان کا ترجمہ پڑھنے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ فاتحہ کے ترجمہ کو لیجیے جو حسبِ ذیل ہے:۔

تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے، رحمٰن و رحیم ہے، روزِ جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں ہمیں سیدھا راستہ دکھا، اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے نہیں ہیں۔

آپ اس ترجمہ کو پڑھیئے اور خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ وہ روانیٔ عبارت، زورِ بیان، بلاغتِ زبان اور تاثیرِ کلام (جس کا مودودی صاحب کے بیان کے مطابق دوسرے ترجموں میں فقدان تھا) ان کے ترجمہ میں کس حد تک جا پایا ہوتا ہے اور اسے پڑھ کر کس طرح آپ کی روح وجد میں آتی ہے؟ آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، آپ کے جذبات میں طوفان برپا ہو جاتا ہے اور آپ کو محسوس ہونے لگ جاتا ہے کہ کوئی چیز عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب و جگر تک اترتی چلی جا رہی ہے۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے کئی بار لکھ چکے ہیں، مودودی صاحب کے پاس کوئی نئی چیز پیش کرنے کو نہیں ہوتی، اس لئے کہ نہ انہیں جدّتِ فکر نصیب ہوئی ہے، نہ ندرتِ نگاہ۔ ان کے پاس وہی فرسودہ مال ہے جو ہمارے ہاں صدیوں سے چلا آرہا ہے لیکن جب وہ اسے لے کر بازار میں نکلتے ہیں تو ان کی آواز یہ ہوتی ہے کہ

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟

آپ ان کے اس ترجمہ کو پہلے مترجمین کے ترجموں کے ساتھ ملائیے اور پھر دیکھئے کہ اس میں اور اُن کے ترجموں میں کیا فرق ہے۔ یہ تو رہا ترجمہ کے متعلق جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے،

اُصولِ تفسیر

انہوں نے لکھا ہے کہ "میری انتہائی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی ایسی بحث نہ چھیڑی جائے جو ناظر کی توجّہ قرآن سے ہٹا کر کسی دوسری چیز کی طرف پھیر دے" (دیباچہ صٓ!) یہ بڑا مبارک خیال ہے۔ ہمارے نزدیک جو شخص قرآن پیش کرنے کے لئے قلم اٹھاتا ہے اُس کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس کا خیال رکھے کہ پڑھنے والے کے سامنے خالص قرآن کی تعلیم کے علاوہ اور کوئی تعلیم نہ آنے پائے۔ اگر اُس کی تحریر سے دوسروں کے ذہن میں غیر قرآنی تعلیم پہنچ جاتی ہے تو یہ قرآن کے ساتھ شرک ہے جو کسی صورت میں بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس بنا پر ہم نے لکھا ہے کہ مودودی صاحب کا یہ خیال بڑا ہی مبارک ہے کہ تفسیر میں کوئی ایسی بات بیان نہ ہونے پائے جو ناظر کی توجّہ کو قرآن سے ہٹا کر کسی دوسری چیز کی طرف پھیر دے۔ لیکن ان کی تفسیر کے پڑھنے کے بعد ہمیں افسوس ہوا کہ ان کی تفسیر ان کے اس دعوے کی بالکل نقیض ہے۔ ان کے حواشی انہی خیالات کی ترجمانی کر رہے ہیں جو غیر قرآنی ماخذوں سے

مستعار لئے گئے ہیں اور جو ہماری قدیم تفسیروں میں پیش ہوتے چلے آرہے ہیں چنانچہ ان کی تفسیر میں اکثر اس قسم کی چیزیں ملیں گی کہ:۔

قرآن میں ابہام!

اس آیت کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے تاہم اس کا قریب ترین مفہوم وہی ہے جو قدیم مفسرین نے بیان کیا ہے۔ (ص۹۶)

طلوعِ اسلام میں متعدد بار بتایا جا چکا ہے کہ مودودی صاحب کی تحریروں میں بڑا تضاد ہوتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان کا "یہ خصوصیت" ان کی تفسیر میں بھی موجود ہے اور یہ تضادات وہاں آتے ہیں، جہاں قرآن کی آیت کچھ اور کہتی ہے اور روایات کچھ اور حکم دیتی ہیں۔ مودودی صاحب بار بار اس کا اعلان کئے جاتے ہیں کہ انسانی زندگی کو حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون اور ضابطہ صرف اللہ کا ہونا چاہیے۔ دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دینے چاہئیں" (ص۲۵۲) وہ کھلے الفاظ میں کہتے ہیں کہ "حلال وہی ہے جو اللہ نے حلال کیا اور حرام وہی ہے جو اللہ نے حرام کیا" (ص۴۹۸)۔

حرام و حلال کے اختیارات

وہ اُن لوگوں کی سخت مذمت کرتے ہیں جنہوں نے بعض چیزوں کو آپ ہی آپ حلال قرار دے لیا، حالانکہ اللہ کی نظر میں وہ حرام ہیں اور بعض چیزوں کو انہوں نے خود حرام ٹھہرا لیا، حالانکہ اللہ نے انہیں حلال کیا ہے" (ص۵۶۷) وہ دوسری جگہ کہتے ہیں کہ:۔

> حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لئے قانونِ شرع تجویز کرنا یہ سب خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔ (ص۵۹۸)

مودودی صاحب نے جو کچھ یہاں لکھا ہے اس کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھیئے۔ وہ واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا یہ سب خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے لیکن اس کے بعد یہ دیکھئے کہ مودودی صاحب از تمام امور میں اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو شریک کرتے ہوئے کس طرح خود اپنے الفاظ میں شرک کے مرتکب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً مندرجہ بالا اقتباس ص۵۹۸ پر ہے اور اس کے بالکل سامنے ص۵۹۹ پر ہمیں یہ عبارت ملتی ہے۔

> انسانی جان جو فی الاصل خدا کی طرف سے حرام ٹھہرائی گئی ہے ہلاک نہ کی جائے مگر حق کے ساتھ۔ اب رہا یہ سوال کہ حق کے ساتھ کا کیا مفہوم ہے، تو اس کی تین صورتیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور دو صورتیں اس پر زائد نبی صلعم نے بیان فرمائی ہیں۔ (اور یہ دو زائد صورتیں یہ ہیں) شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے اور ارتداد اور خروج از جماعت کا مرتکب ہو۔

مودودی صاحب نے پہلے خود ہی یہ اصول بیان کیا ہے کہ حرام و حلال کی حدود مقرر کرنا خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں کسی غیر اللہ کو شریک کرنا شرک ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ (مودودی صاحب کے بیان کے مطابق) جب رسول اللہ صلعم نے خدا کی بیان کردہ تین صورتوں پر دو صورتوں کا اضافہ اپنی طرف سے کیا تو کیا یہ خداوندی کے مخصوص اختیارات میں شریک ہونا ہوا یا نہیں؟

قتل نفس اور روایات

اسی طرح وہ ص۵۹۳ پر کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ شریعت الٰہی میں قطعی حرمت ان چار ہی چیزوں کی ہے جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے اور قرآن نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ سب کچھ حلال ہے بجز اس کے جس کی حرمت کی تصریح

کردی جائے (صٓ۳۴۵) لیکن اس کے باوجود وہ فرماتے ہیں کہ:۔

کھانے پینے میں نبیٔ اکرم صلعم نے حدیث میں صاف حکم دے دیا کہ درندے حرام ہیں۔ اسی طرح حضور نے اُن پرندوں کو بھی حرام قرار دیدیا جن کے پنجے ہیں اور جو دوسرے جانوروں کو شکار کرکے کھاتے ہیں یا مردار خور ہوتے ہیں (صٓ۳۴۷)

اسی طرح قرآن نے جہاں وصیت کا حکم دیا ہے وہاں اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی لیکن مودودی صاحب (روایات کی بناء پر) لکھتے ہیں کہ "آدمی کو اپنے کُل مال کے ۱/۳ کی حد تک وصیت کرنے کا اختیار ہے۔

قتل کے متعلق ابھی ابھی اوپر لکھا جا چکا ہے کہ مودودی صاحب کے بیان کے مطابق خدا کی بیان کردہ تین صورتوں پر دو صورتوں کا اضافہ رسول اللہ نے فرما دیا لیکن وہ تفسیر کے صٓ۴۳۶ پر ان دو صورتوں میں ایک صورت کا اور بھی اضافہ فرماتے ہیں جہاں لکھتے ہیں کہ "آنحضرت نے یہ قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا تھا کہ جو شخص محرمات میں کسی کے ساتھ زنا کرے اسے قتل کر دو۔ لطف یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ "فقہا کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے[1] (صٓ۴۳۶) اور چوتھی صورت (جس کا اضافہ مودودی صاحب کے بیان کے مطابق نبی صلعم نے فرمایا) جنگ کے قیدیوں کا قتل ہے (صٓ۱۵۳) یعنی خدا نے کسی شخص کے قتل کے لیے صرف تین صورتیں جائز رکھی تھیں لیکن مودودی صاحب کے بیان کے مطابق رسول اللہ نے ان پر چار صورتوں کا اضافہ اپنی طرف سے فرما دیا اور اس کے باوجود مودودی صاحب کا یہ دعویٰ اپنی جگہ پر قائم رہا۔

---

[1] مودودی صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ جب رسول اللہ کا صریح حکم سامنے آگیا تو پھر اس میں فقہاء کو اختلاف کا حق کیسے حاصل ہو گیا؟

کہ حُرمت و حلّت کے حدود مقرر کرنا خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں کسی غیراللہ کو شریک کرنا شرک ہے۔ اور یہ اضافہ اُس رسول نے کیا جو خود مودودی صاحب کے الفاظ میں "انسانی کمزوریوں سے مبرا نہیں تھے" (ص۵۴۲) یہاں تک کہ حضورؐ نے خود فرمایا کہ "میں ایک انسان ہی ہوں، ہو سکتا ہے کہ تم ایک مقدمہ میرے پاس لاؤ اور تم میں سے ایک فریق دوسرے کی بہ نسبت زیادہ چرب زبان ہو اور اُس کے دلائل سُن کر میں اُس کے حق میں فیصلہ کر دوں"۔ (ص۱۳۸)

مُرتد کی سزا آپ دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب نے مُرتد کی سزا بھی قتل لکھی ہے، مُرتد وہ ہے جو اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے حالانکہ یہی مودودی صاحب تفسیر کے صفحہ ۱۹۶ پر لکھتے ہیں کہ:۔

> اسلام کا یہ اعتقادی اور اخلاقی و عملی نظام کسی پر زبردستی نہیں ٹھونسا جا سکتا یہ ایسی چیز ہی نہیں ہے جو کسی کے سر جبراً منڈھی جائے۔ (ص۱۹۶)

قرآن اور روایات میں جہاں تضاد واقع ہوتا ہے اس کی کئی ایک اور مثالیں بھی اس تفسیر میں موجود ہیں مثلاً وہ از روئے نصِ قرآنی، فال گیری اور قرعہ اندازی کو حرام قرار دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

> ان تین اقسام کو حرام قرار دینے کے بعد قرعہ اندازی کی صرف وہ سادہ صورت اسلام میں جائز رکھی گئی ہے جس میں دو برابر کے جائز کاموں یا دو برابر کے حقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو۔ (ص۴۴۲)

یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بعض روایات میں ہے کہ حضور رسول اللہ صلعم بعض معاملات کے فیصلے (معاذ اللہ) قرعہ اندازی سے کیا کرتے تھے۔

طلاق کے احکام اس قسم کی ایک دلچسپ مثال احکامِ طلاق کے متعلق ہے مودودی

صاحب پہلے کہتے ہیں کہ:۔

جو شخص اپنی منکوحہ کو دو مرتبہ طلاق دے کر اس سے رجوع کر چکا ہو وہ اپنی عمر میں جب کبھی اس کو تیسری طلاق دیگا عورت اس سے مستقل طور پر جدا ہو جائے گی۔ (صہ۱۷۶)

یہ چیز قرآن کے مطابق ہے۔ (یعنی جو شخص اپنی عمر میں تیسری مرتبہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اس کے بعد وہ اس سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا تاوقتیکہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے اور وہ مرد اُسے (قرآنی طلاق نہ دیدے یا فوت نہ ہو جائے لیکن مودودی صاحب اس کے ساتھ ہی (اسی صفحہ پر) یہ بھی لکھتے ہیں کہ تین طلاقوں سے مطلب یہ ہے کہ ہر مہینے حالتِ طہر میں طلاق دے دی جائے اسی طرح

تیسرے طہر میں تیسری بار طلاق دینے کے بعد نہ تو شوہر کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ اس کا ہی کوئی موقع رہتا ہے کہ دونوں کا پھر نکاح ہو سکے۔

آپ غور کیجئے کہ یہ دونوں صورتیں بالکل متضاد ہیں۔ یعنی پہلے یہ کہا گیا ہے کہ وہ شخص اپنی تمام عمر میں جب تیسری مرتبہ طلاق دے گا تو یہ صورت واقع ہو گی اور اس کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ جب وہ تیسرے مہینے تیسری طلاق کہہ دے گا تو پھر یہ صورت پیدا ہو گی۔ پہلی صورت قرآن کے مطابق ہے اور دوسری روایات کے مطابق لیکن مودودی صاحب ان دونوں متضاد صورتوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں گویا ان میں کوئی تضاد نہیں حالانکہ دوسری صورت یکسر قرآن کے خلاف ہے۔ با ایں ہمہ مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ:۔

میری انتہائی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی ایسی بحث نہ چھیڑی جائے جو ناظر کی توجہ قرآن سے ہٹا کر کسی دوسری طرف پھیر دے۔ (دیباچہ ص۱۱)

ان تضادات کی وجہ بالکل ظاہر ہے اور وہ یہ کہ مودودی صاحب، روایات کو قرآن کے

اِطاعتِ رسُولؐ ساتھ قرآن کی مثل (مثلہٗ معہٗ) مانتے ہیں چنانچہ وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ :-

کوئی اطاعت خدا رسول کی سند کے بغیر معتبر نہیں۔ (ص۳۶۳)

کہنے کو تو بات چھوٹی ہے لیکن اسے کہنے کے لئے کسی ایسے شخص ہی کے دل گردہ کی ضرورت ہے جسے اس کا قطعاً احساس نہ ہو کہ میں خدا کے بارے میں کیا کہہ رہا ہوں۔ خدا نے قرآن نازل کیا اس کی حفاظت کا ذمہ خود لیا۔ اس قرآن کو ایک مکمل اور مرتب شکل میں رسول اللہ صلعم نے امت کو دیا لیکن مودودی صاحب کے نزدیک خدا کی اطاعت کی سند قرآن نہیں بلکہ قرآن محتاج ہے اُن روایات کی سند کا جن کی حفاظت کا ذمہ نہ خدا نے لیا اور نہ جنہیں رسول اللہ صلعم نے امت کو دیا بلکہ جنہیں رسول اللہ صلعم کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد لوگوں نے اپنے اپنے طور پر جمع کیا اور جن میں خود مودودی صاحب کے قول کے مطابق غلط اور صحیح سب قسم کی روایات موجود ہیں اس سارے قصے سے مقصود صرف اپنے خدائی اختیارات کا تسلیم کرانا ہے اور یہ اس طرح کہ :-

(۱) کوئی اطاعتِ خدا، رسول کی سند کے بغیر معتبر نہیں۔

(۲) رسولؐ کی سند روایات سے مل سکتی ہے۔

(۳) روایات میں غلط بھی ہیں اور صحیح بھی۔

(۴) صحیح وہ ہے جسے مزاج شناسِ رسول صحیح کہہ دے اور غلط وہ ہے جسے وہ غلط ٹھہرا دے اور

(۵) یہ مزاج شناسِ رسول خود مودودی صاحب ہیں۔ (ملاحظہ ہو امین احسن اصلاحی صاحب کا عدالت میں بیان)

لہٰذا آج امت کے لئے اطاعتِ خدا کی سند مودودی صاحب کا فیصلہ ہوگا۔

مودودی صاحب اپنے مندرجہ بالا قول کی سند میں اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کی آیت پیش کرتے ہیں۔ لیکن وہ خود ہی دوسرے مقام پر اللہ اور رسول کا وہ مفہوم بیان کر جاتے ہیں جو اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کی تفسیر خود کر دیتا ہے۔ وہ سورۂ مائدہ کی آیت ۳۳ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

اللہ اور رسول کا صحیح مفہوم

خدا اور رسولؐ سے لڑنے کا مطلب اُس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو..... ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا...... دراصل خدا اور اس کے رسول کے خلاف جنگ ہے جیسے تعزیراتِ ہند میں ہر اُس شخص کو جو ہندستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے "بادشاہ کے خلاف لڑائی" کا مجرم قرار دیا گیا ہے۔

(صـ ۴۶۵)

یہ چیز بعینہٖ وہی ہے جسے طلوعِ اسلام کی طرف سے شروع سے پیش کیا جا رہا ہے اور جس کی مسلسل مخالفت مودودی صاحب اور اُن کی جماعت کی طرف سے اس شدت سے کی جا رہی ہے۔ کہ باید و شاید۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ اگر یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (خدا اور اس کے رسول کے خلاف جنگ) اُس نظام کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلامی حکومت نے قائم کر رکھا ہو تو خدا اور رسول کی اطاعت سے مراد اُس نظامِ صالح کی اطاعت کیوں نہیں جسے اسلامی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو لیکن چونکہ اطاعت خدا اور رسول کا یہ مفہوم لینے سے اطاعت، اسلامی نظام کی ہوتی ہے جس سے کسی مزاج شناس رسول

کی آمریت باقی نہیں رہتی، اس لئے ان حضرات کے نزدیک اطاعتِ خدا اور رسول سے مفہوم روایات کی اطاعت ہی لیا جائے گا!

اطاعتِ رسول کی ضرورت کے متعلق یہ حضرات ایک دلیل یہ دیا کرتے ہیں کہ قرآن نے جن احکام کو مجمل طور پر بیان کیا ہے اُن کی تفاصیل روایات میں ملتی ہیں۔ اس لئے روایات کی اطاعت ناگزیر ہے۔ اس کا جواب ہماری طرف سے نہیں، خود مودودی صاحب کی طرف سے سنئے۔ انہوں

قرآن کے مجمل احکام!

نے اپنی تفسیر جلد اوّل کے صفحہ ۵۰۸ پر دو حدیثیں نقل کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اللہ نے کچھ فرائض تم پر عائد کئے ہیں۔ انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے، اُن کے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں اُن سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے بغیر اس کے کہ اُسے بھول لاحق ہوئی ہو۔ لہٰذا اُن کی کھوج نہ لگاؤ۔ ان احادیث کو نقل کرنے کے بعد مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

> ان دونوں حدیثوں میں ایک اہم حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے جن امور کو شارع نے مجملاً بیان کیا ہے اور اُن کی تفصیل نہیں بتائی یا جو احکام بر سبیلِ اجمال دیئے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دوسرے تعیّنات کا ذکر نہیں کیا ہے اُن میں اجمال اور عدم تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہوگئی تفصیلات بتانی چاہیں تھیں مگر نہ بتائیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لئے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔

یہ مسلک لفظاً لفظاً وہی ہے جسے طلوعِ اسلام پیش کرتا چلا آرہا ہے لیکن طلوعِ اسلام اِن حضرات کے نزدیک گردن زدنی اور جہنمی ہے اور یہ حضرات نظامِ دین کے ستون ہیں۔

تفسیری نِکات

یہاں تک تو احکام کے متعلق مودودی صاحب کے تضادات کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ اب تھوڑا سا نمونہ ان کے تفسیری نِکات کا بھی ملاحظہ فرمایئے۔ وہ ہاروت اور ماروت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو پیروں اور فقیروں کی شکل میں اسرائیلیوں کے پاس بھیجا۔ وہاں انہوں نے ایک طرف بازارِ ساحری میں اپنی دکان لگائی لیکن دوسری طرف وہ اتمام حجّت کے لئے ہر ایک کو خبردار کر دیتے تھے کہ دیکھو ہم تمہارے لئے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو مگر اس کے باوجود لوگ اُن کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے تھے۔

ہاروت وماروت

یہ کچھ لکھنے کے بعد مودودی صاحب خدا کی اس "حکمتِ بالغہ" کو بیان کرتے ہیں جس کے مطابق اُس نے لوگوں کی آزمائش کے لئے یہ شکل اختیار کی۔ فرماتے ہیں:۔

رہا فرشتوں کو ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بُری تھی تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خور حاکم کو نشان زدہ سکّے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اُسے عین حالتِ ارتکابِ جرم میں پکڑیں اور اس کے لئے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔ (ص۹۸)

تفسیرِ قرآن کی اس نکتہ آفرینی کے متعلق کچھ بھی لکھنا آپ کے اس لطف کو خراب کر دے گا جو تفسیر پڑھنے سے آپ کو حاصل ہو رہا ہے۔ اس لئے ہم آپ کے اس لطف میں خلل انداز ہوئے بغیر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔

محکمات ومتشابہات

(۲) محکمات ومتشابہات کے متعلق ارشاد ہے۔

متشابہات وہ آیات ہیں جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہو۔ (صفحہ ۲۳۴)

حَلّ تَحَلّلۂ! یعنی قرآن میں ایسی آیات بھی ہیں جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔
یعنی اُس قرآن میں جس کی ابتدا اس دعویٰ سے ہوتی ہے کہ ذَالِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيهِ۔ ﷺ
اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

جو لوگ طالبِ حق ہیں اور ذوقِ فضول نہیں رکھتے وہ تو متشابہات سے حقیقت کے اس دھندلے تصور پر قناعت کر لیتے ہیں جو کام چلانے کے لئے کافی ہے اور اپنی تمام تر توجہات محکمات پر صرف کرتے ہیں۔ (ایضاً)

یعنی قرآن نے محض کام چلانے کے لئے حقیقت کے دھندلے تصورات بھی دیئے ہیں اور اُن میں غور و فکر کرنا ذوقِ فضول ہے۔

مذہب کی تاریخ (۳) مودودی صاحب مذہب کی تاریخ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا کیا تھا اُس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور تیرے لئے صحیح راستہ کون سا ہے۔ اس کے بعد ایک مدت تک نسلِ آدم راہِ راست پر قائم رہی اور ایک اُمت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لئے۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کو حقیقت نہیں بتائی گئی تھی بلکہ اس وجہ سے کہ حق کو جاننے کے بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات، فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے اس خرابی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث کرنا شروع کیا۔ (صفحہ ۱۹۲-۱۹۳)

یعنی پہلے اللہ نے انسانوں کو انبیائے کرام کی وساطت کے بغیر براہِ راست ہدایت دی۔

اور جب یہ طریقہ ناکام ثابت ہوا تو پھر انبیائے کرام کو بھیجنا شروع کیا۔ اگر کوئی ان سے یہ پوچھ لے کہ اللہ نے پھر انبیاء کا سلسلہ کیوں ختم کر دیا تو معلوم نہیں ہمارے یہ منکرِ قرآن اس کا کیا جواب دینگے؟

(۴) ہجرت کے ضمن میں آپ کہتے ہیں کہ یہ ضروری ہے کہ دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کی جائے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم دنیا میں کوئی ایسا دار الاسلام پاتے ہی نہیں جہاں ہم ہجرت کر کے جا سکیں انہیں جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

دار الاسلام نہ ہو تو؟

اگر کوئی دار الاسلام موجود نہیں ہے تو کیا خدا کی زمین میں کوئی پہاڑ یا کوئی جنگل بھی ایسا نہیں ہے جہاں کوئی آدمی درختوں کے پتے کھا کر اور بکریوں کا دودھ پی کر گزر کر سکے اور احکام کفر کی اطاعت سے بچا رہے۔ (ص۳۸۸)

۴/۵۹

(۵) قرآن نے جہاں اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ کی اطاعت کا حکم دیا ہے، وہاں لکھتے ہیں کہ اُولِی الْاَمْر میں علماء بھی شامل ہیں۔ (ص۳۶۲)

جبر کا عقیدہ

(۶) جبر اور قدر کے متعلق بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

قرآن کی رُو سے اللہ کی مشیّت اور اس کی رضا میں بڑا فرق ہے جس کو نظر انداز کر دینے سے بالعموم شدید غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں۔ کسی چیز کا اللہ کی مشیّت اور اُس کے اِذن کے تحت رونما ہونا لازمی طور پر یہ معنی نہیں رکھتا کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے[1]...... کسی چور کی چوری، کسی قاتل کا

---

[1] یعنی اللہ ان کو پسند نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود انہیں بھیجے چلے جاتا ہے! اُف، کس قدر مجبوری کا مقام ہے۔ (معاذ اللہ)

قتل، کسی ظالم و مفسد کا ظلم و فساد اور کسی کا فر و مشرک کا کفر و شرک اللہ کی مشیّت کے بغیر ممکن نہیں، اور اسی طرح کسی مومن اور متقی انسان کا ایمان اور تقویٰ بھی مشیّتِ الٰہی کے بغیر محال ہے۔ دونوں قسم کے واقعات یکساں طور پر مشیّت کے تحت رونما ہوتے ہیں مگر پہلی قسم کے واقعات سے اللہ راضی نہیں ہے اور اس کے برعکس دوسری قسم کے واقعات کو اس کی رضا اور اُس کی پسندیدگی و محبوبیت کی سند حاصل ہے۔ (ص۵۷۳)

غالباً اسی عقیدۂ جبر کا اثر ہے جس کے ماتحت وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:۔

اعمال کے نتائج

قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ بھلائی کی جزاء اور برائی کی سزا دینا بالکل اللہ کے اختیار میں ہے تمہیں جس بھلائی پر انعام ملتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے،[1] بلکہ اللہ کا فضل ہے، چاہے عنایت فرمائے چاہے نہ فرمائے۔ اسی طرح جس برائی پر تمہیں سزا ملتی ہے وہ بھی برائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے کہ لازماً مرتب ہو کر ہی رہے بلکہ اللہ پورا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے معاف کر دے اور چاہے سزا دیدے۔ (ص۶۸)

اگرچہ خود ہی دوسری جگہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:۔

"ملکِ عظیم" سے مراد دنیا کی امامت و رہنمائی اور اقوامِ عالم پر قائدانہ اقتدار ہے جو کتاب اللہ کا علم پانے اور اس علم و حکمت کے مطابق عمل کرنے سے لازماً حاصل ہوتا ہے (ص۳۶۱)

یہ ہیں چند ایک نمونے اُن تفسیری نکات کے جو تفہیم القرآن میں بیان ہوئے ہیں۔

---

[1] حالانکہ قرآن بار بار انہیں جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ) کہہ کر پیش کرتا ہے۔ (۲۴/۱۲)

الیکشن

خدماتِ جلیلہ کا تذکرہ

(الیکشن کے لئے)

(جنوری، فروری ۱۹۵۰ء)

گذشتہ اشاعت[1] میں جماعتِ اسلامی کے متعلق جو تصریحات شائع کی گئی تھیں، ہمیں خوشی ہوئی کہ بہت سی سعید روحوں نے اس سے استفادہ کیا اور حقیقتِ حالی منکشف ہونے پر انہوں نے اپنے مستقبل کے متعلق بھی سوچا کہ راہِ صواب کون سی ہے ہم نے کہا تھا کہ جماعتِ اسلامی کے اربابِ حل و عقد کے پیشِ نظر شروع ہی سے اپنی قیادت کا حصول، قیام تھا اور اس کے لئے اُن کا مدار کارِ عظیم تخریبی تھا یعنی قائدِ اعظم کی قیادت کی مخاصمت اور اُن کے پیش کردہ مسلک یعنی تحریکِ پاکستان کی مخالفت لیکن اس مقصد تک پہنچنے کے لئے انہوں نے وہی ٹکنیک اختیار کی جو اس سے پیشتر قادیانی نبوت اختیار کر چکی تھی یعنی مسلمانوں کے درد مند ریفارمر، مجدّد، مہدی، مثیلِ مسیح کے بعد مقامِ نبوت پر فائز ہونے کا تدریجی اسلوبِ کار اور اس دوران میں قرآن اٹھا اٹھا کر یہ اعلانات کہ جو یہ کہتا ہے کہ ہم آگے چل کر دعوئے نبوت

---

[1] ملاحظہ ہو "صحیح اور غلط قیادت"۔ (باب اوّل)

کریں گے" وہ ہم پر سخت اتہام لگاتا ہے، بہتان تراشتا ہے۔ ہم تو مدعیٔ نبوت کو کافر سمجھتے ہیں جماعت اسلامی کے دل میں جب ہوسِ اقتدار نے کروٹ لی تو اُس وقت مسلمان اپنی

پہلا قدم

جداگانہ قومیت کے دعویٰ کو ہندو اور انگریز سے منوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان حضرات نے نہایت مشفقانہ اور مصلحانہ انداز میں مسلمانوں کے اس دعوے کی تائید شروع کی اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے خلاف اس جدوجہد میں شریک ہو گئے اور اس طرح اپنی مقبولیت بڑھانی شروع کر دی۔ چنانچہ یہ خود لکھتے ہیں۔

> جماعت کے ابتدائی دور میں جب وطنی قومیت کی تحریک مسلمانوں کو نگل لینے کے لئے سرگرم عمل تھی اور خود مسلمانوں کے بہت سے لیڈر اور کارکن اپنی خدمات اس تحریک کے لئے وقف کئے ہوئے تھے تو اس نازک لمحے میں جماعتِ اسلامی نے ملت کے سینے میں اس فریضۂ اقامتِ دین کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جو طبعی طور پر ملت سے اپنے جداگانہ وجود کو برقرار رکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۴۹ء)

واضح رہے کہ ستمبر ۱۹۴۹ء کے ترجمان القرآن میں، جس سے مندرجہ بالا اقتباس لیا گیا ہے۔ جماعتِ اسلامی نے اپنی ان خدماتِ جلیلہ کو گنایا ہے جس کے پیشِ نظر وہ قوم سے آئندہ انتخابات میں ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مندرجہ صدر اقتباس سے ایک ناواقف کو یقیناً یہ خیال پیدا ہوگا کہ جماعتِ اسلامی کے ابتدائی دور میں مسلمان عام طور پر قومیت پرستی کی تحریک میں بہے جا رہے تھے اور یہ جماعتِ اسلامی تھی جس نے اُن میں اپنے جداگانہ قومی تشخص کا احساس پیدا کیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کا احساس علامہ اقبالؒ ۱۹۰۷ء سے پیدا کرتے چلے آرہے تھے ۱۹۳۰ء میں انہوں نے الہ آباد کے

مقام پر اسی جداگانہ قومیت کی بنیاد پر جداگانہ مملکت کا تصور بیدار کیا جسے ۱۹۳۹ء میں قائدِ اعظم مرحوم نے ایک مثبت سیاسی دعوے کی حیثیت سے پیش کیا۔ جماعتِ اسلامی کا نام ہی پہلی بار ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۱ء میں سنا گیا۔ بایں ہمہ اس جماعت کا اب دعویٰ یہ ہے کہ اسی نے ملت کے سینہ میں اس فریضۂ اقامتِ دین کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ (احساس پیدا کرنے کے الفاظ پر غور کیجئے) گویا اس سے پہلے ملت کے دل میں اس کا احساس تک پیدا نہیں ہوا تھا یہ احساس جماعتِ اسلامی کا پیدا کردہ ہے پھر اسے بھی سامنے رکھیئے کہ اُس وقت بھی مسلمانوں کی قیادت وہی تھی جسے آگے چل کر اسلامی جماعت نے "غیر صالح قیادت" قرار دے کر بدترین مخالفت شروع کر دی تھی لیکن اُس وقت چونکہ مسلمانوں میں مقبول بننا مقصود تھا اس لئے اُس وقت اس سوال کو بالکل نہیں چھیڑا گیا۔ تدریجی نبوت کی ٹکنیک کا ایسا ہی تقاضا ہوتا ہے۔

خدماتِ جلیلہ

اب آگے چلئے ارشاد ہے:۔

> پھر جب وطنی تحریک کے گرداب سے ملت کا سفینہ نکل آیا اور مسلمان جداگانہ طور پر تحریکِ پاکستان کے لئے منظم ہو کر سرگرمِ عمل ہونے لگے تو جماعتِ اسلامی نے ان کو مسلسل یہ دعوت دی کہ وہ اپنی تحریک کو خالص اسلامی طرز پر نشوونما دیں۔

یعنی جب جماعتِ اسلامی کی کوششوں سے ملت کا سفینہ وطنی تحریک کے گرداب سے نکل آیا (کتنا بڑا احسان ہے ملت کی گردن پر اس مقدس جماعت کا جس نے ملت کو ایسے گرداب سے نجات دلائی) اور کیسی محسن کش ہے یہ ملت کہ اس نے اس کے باوجود انہیں چھوڑ کر مسٹر جناح کو اپنا قائد بنا لیا۔

اس کے بعد ارشاد ہے :۔

جب نواکھالی ، شمالی پنجاب اور صوبہ بہار میں فسادات کا طوفان اٹھا تو جماعتِ اسلامی احترامِ انسانیت ، قیامِ امن ، اعانتِ مظلوم ، مدافعتِ ظلم اور سچائی و اخلاق کے پیغام لے کر اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اس کے کارکنوں نے جہاں ایک طرف بساط بھر مسلمانوں کو منظم کرنے ، ان کے حوصلے (MORAL) کو بحال کرنے اور ان کو مختلف طریقوں سے امداد بہم پہنچانے کی کوشش کی ، وہاں دوسری طرف مسلمانوں کو بھی اور غیر مسلمانوں کو بھی باہمی قتل ، مقاتلہ اور بوڑھوں اور بچوں پر دراز دستی اور عورتوں پر زیادتی کرنے سے باز رکھنے کے لئے ان کے شریفانہ جذبات سے اپیل کی ۔

کھُلی ہوئی فریب دہی

یہ حصّہ تلبیسِ حق و باطل اور کتمانِ حقیقت کی بڑی پُر فریب مثال پیش کرتا ہے یہ وہ وقت تھا جب اس جماعت نے مسلمانوں کی قیادت اور اُن کے دعوئے پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا تھا ۔ انہوں نے شروع میں جس "جداگانہ" قومیت کی تائید کی تھی اب اُسی جداگانہ قومیت کے خلاف یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ مسلمان محض مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو کر ایک الگ قوم کے دعویدار بن رہے ہیں یہ جب تک پورے کے پورے مسلمان نہ بن جائیں ، ان کی جداگانہ قومیت کا دعویٰ ایک سیاسی ہتھکنڈہ ہے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور اُن کے مخالفین کی طرف سے نیشنلزم کی تحریک کی کشمکش انتہائی نازک مقام پر پہنچ چکی تھی اور فیصلہ کی گھڑیاں قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھیں ۔ اس جماعت نے عین اُس وقت اس فتنہ کا آغاز کیا اور کھلے بندوں پاکستان کے مطالبہ

کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ اُس وقت "مصلحینِ ملت" کے اس مقدس طائفہ" کا ایک ایک کارکن جناح کو گالیاں دینے اور پاکستان کو غیر اسلامی ثابت کرنے میں مصروفِ عمل تھا۔ اگر کسی جگہ مسلمان قتل ہوتے تھے تو اس جماعت کا ردِ عمل یہ ہوتا تھا کہ ان پیدائشی مسلمانوں اور غیر مسلموں میں فرق کیا ہے یہ مسلمان باقی رہیں یا نہ رہیں، اس سے اسلام پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ان کے اس وقت کے لٹریچر کو اٹھا کر دیکھئے۔ یہ لوگ کس طرح مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے کے "جہادِ عظیم" میں مصروفِ تگ و تاز تھے۔ آج یہ لوگ ملت پر اپنے احسان جتاتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ عوام کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے اور انہیں تقدس کے جاذبِ نگاہ نقاب میں جلد فریب دیا جاسکتا ہے۔ لیکن واقعات کو کہاں تک چھپایا جاسکتا ہے! ہم اُس جماعت کو دعوت دیتے ہیں کہ اگر ان میں اخلاقی جرأت کی کوئی رمق موجود ہے تو یہ اپنے اس زمانہ کے لٹریچر کو جب یہ مسٹر جناح کی قیادت اور مسلمانوں کے مطالبۂ حصولِ پاکستان کی اس طرح مخالفت کیا کرتے تھے، ذرا منظرِ عام پر لائیں اور اس کے بعد قوم سے اپنے ان "احسانات" کا معاوضہ مانگیں؟ ان سے اُس زمانہ میں کہا جاتا تھا کہ بابا! خدا کے لئے اُن تیروں کو اپنے ترکش میں رہنے دو۔ ان سے ملت کا سینہ فگار مت کرو۔ مسلمانوں پر بڑا نازک وقت آپڑا ہے۔ ہندو اور انگریز کی متحدہ قوتیں انہیں ہندستان سے ختم کر دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کی قسمت کے فیصلے آئینی بساط پر ہو رہے ہیں۔ انہیں ایک خطۂ زمین حاصل کر لینے دو۔ اس کے بعد آپ انہیں مسلمان بنا لینا۔ لیکن یہ ہر ایک کا مضحکہ اڑاتے اور ایسا کہنے والوں کو اسلام کا بدترین دشمن بتاتے تھے۔ آج یہ لوگ ووٹ حاصل کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ :-

ہمارے نزدیک پاکستان کے دفاع کی حیثیت وہی ہے جو اس قطعۂ زمین

کی حفاظت کی ہوتی ہے جو مسجد بنانے کے لئے حاصل کیا گیا ہو۔

ہائے قیادت! بعینہٖ یہی بات ان سے اُس وقت کہی جاتی تھی اور یہ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اعصاب پر جناح کی قیادت کا بھوت اس بُری طرح سوار تھا کہ یہ جوشِ انتقام میں اندھے ہو رہے تھے۔ اگر جناح کی قیادت کی شکست و ریخت میں ساری کی ساری قوم تباہ ہوتی تھی تو بھی انہیں اس میں ذرا سا تامل نہ تھا۔ انہیں مسلمانوں کے خلاف غصہ ہی اس بات پر تھا کہ انہوں نے انہیں چھوڑ کر جناح کو قائد کیوں بنا لیا ہے۔ اس جرم کی پاداش میں یہ لوگ مسلمانوں کو انتہائی سزا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ تو یوں کہیے کہ یہ کچھ اللہ ہی کو منظور تھا کہ اس نے یہاں کے پانچ چھ کروڑ مسلمانوں کو محفوظ رکھ لیا، ورنہ اس مقدس جماعت نے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

پھر لکھتے ہیں:-

> اسی طرح جب صوبہ سرحد کے باشندوں سے پاکستان اور انڈین یونین میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستہ ہونے کے بارے میں استصواب کیا گیا تو جماعتِ اسلامی کے کارکنوں نے اپنی آراء پاکستان کے حق میں دیں اور دوسروں کو بھی یہی رہنمائی دی۔

ہمیں اس دیدہ دلیری پر بڑی حیرت ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ اُس زمانہ میں جماعتِ

دیدہ دلیری اسلامی نے فیصلہ یہ کیا تھا کہ تحریکِ پاکستان میں تعاون تعاون علی الاثم والعدوان (گناہ اور سرکشی کے کاموں میں معاونت) ہے۔ اس لئے اس جماعت کے افراد کو اس قسم کے استصوابات میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہیئے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے استصواب سرحد کے سلسلہ میں دارالاسلام میں ان کا ایک اجتماع بھی ہوا تھا جس میں یہی فیصلہ کیا گیا تھا آج ان کی جرأت ملاحظہ فرمائیے کہ وہ استصواب سرحد میں کامیابی کا سہرا بھی جماعتِ اسلامی ہی کی رہنمائی کے سر باندھ رہے ہیں۔ کیا جماعت اسلامی اپنی کسی قرارداد یا کارکنوں کے نام اپنی کسی ہدایت کو پیش کر سکتی ہے جو اس نے استصواب سرحد کے سلسلہ میں پاس کی ہو یا بطور رہنمائی شائع کی ہو؟ بات صاف ہو جائے گی۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔

پھر جب تقسیم ملک واقع ہو گئی اور خستہ حال مہاجرین پاکستان آنا شروع ہوئے تو جماعتِ اسلامی کے کارکنوں نے..... (مختلف) کیمپوں میں مہاجرین کی مختلف خدمات انجام دے کر اس امر کا مظاہرہ کیا کہ اسلام مسلمانوں سے مہاجر مسلمانوں کے لئے کس قسم کی انصاریت کا مطالبہ کرتا ہے۔

غور فرمائیے یہ اُس جماعت کا بیان ہے جس کے ارکان اُس زمانہ میں جب مسلمانوں پر یہ قیامت ٹوٹ رہی تھی، ہر جگہ یہ کہتے پھرتے تھے کہ یہ سب کچھ اُس قیادت کی وجہ سے ہوا ہے جس کے خلاف ہم اتنے عرصہ سے مسلمانوں کو متنبہ کرتے چلے آرہے تھے

قراردادِ مقاصد

اس کے بعد تحریر ہے کہ پھر جماعت اسلامی نے "مطالبۂ نظام اسلامی" کے لئے اتنی منظم تحریک برپا کی کہ "دستور ساز اسمبلی" نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو اس مطالبہ کو دستوری حیثیت سے تسلیم کر کے وہ قراردادِ مقاصد پاس کر دی کہ جس کے ہوتے ہوئے کسی غیر اسلامی دستور و نظام کو جاری کرنے کے دستوری راستے بہرحال بند ہیں۔

یعنی قراردادِ مقاصد بھی اسلامی جماعت ہی کی منظم تحریک کا نتیجہ تھی! ان کے نزدیک

زمین و آسمان میں آج جو حرکت بھی ہو رہی ہے سب اسلامی جماعت کی "منظّم تحریک" کے صدقے ہو رہی ہے، معلوم نہیں یہ خود فریبی ہے یا ابلہ فریبی!

اب وہ منزل سامنے آرہی ہے جس کے لئے یہ سب پاپڑ بیلے گئے تھے یعنی حصولِ قیادت کا موقع! چنانچہ ارشاد ہے:۔

> پھر اس قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے کے بعد جب جماعتِ اسلامی نے یہ محسوس کیا کہ اس قرارداد کے تقاضوں کے مطابق ملّت میں تبدیلیوں کے ظہور کی آرزومند ہے اُن کے واقع ہونے میں بدقسمتی سے اربابِ اقتدار کا وہ گروہ حائل ہے جو اپنے ذہن و سیرت کی مخصوص ساخت کی وجہ سے یہ اہلیت نہیں رکھتا کہ اسلامی نظام کی امامت کا فرض ادا کر سکے تو جماعت نے پورے دلائل کے ساتھ انقلابِ قیادت کی دعوت کو عوام تک پہنچانے کا آغاز کر دیا اب اس انقلابِ قیادت کو اسلام کے منشاء کے مطابق برپا کرنے کے لئے رائے عامہ کو اسلامی اصولوں کی تربیت دینے کا جو مرحلہ سامنے آگیا ہے اس میں جماعتِ اسلامی قول و عمل سے شہادتِ حق کا فریضہ انجام دینے اٹھی ہے۔

اور اس انقلابِ قیادت کو اسلام کے منشاء کے مطابق برپا کرنے کے لئے کیا کیا جائیگا؟ الیکشن لڑا جائے گا!

انتخابات

اب جبکہ ہم نے اپنے حقیر سے سرمایۂ ایمان و اخلاق کو انتخابات میں اسی طرح استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس طرح پہلے فسادات میں، پھر سرحد کے ریفرینڈم میں، پھر مہاجرین کی بحالی کے کام اور پھر تحریکِ مطالبہ میں اسے استعمال کیا تھا تو ہمیں وہ سارے اہتمام کرنے چاہییں جو اسے نہ صرف

ٹوٹنے سے بچائیں بلکہ اس پر ملک و ملت کو بھی اور خود ہم کو مزید منافع دلائیں۔

(ترجمان القرآن بابت اکتوبر ۱۹۴۹ء)

لیجئے صاحب! اب اس "سرمایۂ ایمان و اخلاق" کو ٹھکانے لگانے کا وقت آگیا ہے جس کے لئے اتنے عرصے سے دوسروں کی قیادت میں کیڑے ڈالے جا رہے تھے۔

جماعت اسلامی نے اپنی خدماتِ اسلامی کی جو مدّ یجی تفصیل اوپر گنائی ہے، اس میں ایک کڑی باقی رہ گئی ہے جس کا ذکر ناگزیر ہے۔ یعنی جب انہوں نے اپنی بیش بہا قربانیوں سے پاکستان دلا دیا، سرحد کے ریفرنڈم میں اپنی بصیرت افروز رہنمائی سے کامیابی بھی دلا دی۔ اور اپنی جانفروشیوں سے مہاجرین کی بحالی کا مسئلہ بھی حل کرا دیا اور اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ہندو کے

سب سے بڑی خدمت

عزائم مشئومہ اب کشمیر کے راستے پاکستان کے لئے مستقل خطرہ بن کر سامنے آ رہے ہیں، تو ان کی حمیتِ اسلامی پھر جوش میں آئی اور انہوں نے فتویٰ صادر فرما دیا کہ کشمیر کی جنگ کوئی اسلامی جنگ نہیں اس لئے اس میں سپاہیوں کی حیثیت سے شرکت جائز نہیں قرار دی جا سکتی! اور یہ فتویٰ یہ جانتے ہوئے صادر فرمایا کہ اس سے جنگِ کشمیر کو کس قدر نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ اس باب میں خود ترجمان القرآن رقمطراز ہے۔

> پشاور میں جب سائل نے ان سے (امیرِ جماعتِ اسلامی سے) کہا کہ میں تو اس بات (یعنی ان کے فتویٰ) کو شائع کراؤں گا تو مولانا نے ان کو اس حرکت سے باز رہنے کے لئے یہ کہا کہ اس حرکت سے تم جتنا نقصان مجھے پہنچانا چاہتے ہو، اس سے زیادہ نقصان تم جہادِ کشمیر کو پہنچاؤ گے۔

ذرا غور فرمائیے حضرتِ امیرِ جماعتِ اسلامی کی اس "مآل اندیشی" کو وہ یہ جانتے ہیں کہ اُن

کا یہ فتویٰ جہادِ کشمیر کو کس قدر نقصان پہنچائے گا۔ (یعنی بالفاظِ دیگر ہندوؤں کو کتنا فائدہ پہنچائے گا) لیکن اس کے باوجود سائل کو یہ فتویٰ دے دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ تاکید کر دیتے ہیں کہ دیکھنا بھائی! میں نے یہ بات صرف تم ہی سے کہی ہے، اسے کسی دوسرے سے نہ کہنا! اور اس کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں کہ میں نے اپنا فریضہ دین بھی ادا کر دیا اور ملت کو اس کے مہلک اثرات سے بھی بچا لیا! قربانت شوم۔ کیا سادگی ہے۔ اللہ والوں کی باتیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں اربابِ جماعت اسلامی سے کہ اگر یہ فتویٰ ایسا تھا کہ اس کی اشاعت سے جہادِ کشمیر کو اس قدر نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا تو وہ کون سی مجبوری تھی جس کے ماتحت ان کے امیر نے سائل کو اس زہر کا سراغ دے دیا! اور اگر مجبوری یہ تھی کہ حق بات کو چھپانا گناہ ہے تو پھر جنابِ امیر نے اس سائل کو اس کی تاکید کیوں کر دی کہ وہ اس حق بات کو آگے نہ پھیلائے۔ اگر یہ بات حق تھی تو اس کا چھپانا سائل کے لئے بھی ایسا ہی گناہ تھا جیسا مودودی صاحب کے لئے۔ اور اگر جہادِ کشمیر کو نقصان سے بچانا زیادہ ضروری تھا تو امیر صاحب نے خود اس پر عمل کیوں نہ کیا؟ "آگ لگا کر جمالو دور کھڑی" کی کہاوت تو عامیانہ ہے لیکن ہے کس قدر برجستہ۔ سائل سے ایسی خطرناک بات بھی کہہ دیتے ہیں اور اس کے بعد نہایت معصومیت سے فرماتے ہیں کہ میں نے تو اس کے ساتھ ہی کہہ دیا تھا کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ لہٰذا جہادِ کشمیر کو نقصان پہنچانے کا ذمّہ دار سائل ہے، میں تھوڑا ہوں؟

یہ ہے وہ خدمتِ جلیلہ جس کا ذکر ترجمان القرآن نے اپنی فہرستِ خدمات میں نہیں کیا۔ یعنی ایک اس بات کا کہ جماعت اسلامی نے پاکستان بننے سے پہلے پاکستان کے خلاف کس قدر زہر اگلا اور دوسرے یہ کہ جب ان کی مخالفتوں کے علی الرّغم پاکستان بن گیا

تو انہوں نے مسئلہ کشمیر کے راستے اس کے لئے خطرات پیدا کرنے کے لئے کیا کچھ کیا یہ ہے وہ جماعت جو اپنے "سرمایۂ ایمان واخلاق" کو لے کر الیکشن لڑنے کے لئے میدان میں آرہی ہے! ہم حیران ہیں کہ مسلمان کس قدر سادہ لوح واقع ہوا ہے جو ایسے کھلے ہوئے حقائق کو بھی آنکھوں سے اوجھل کر دیتا ہے لیکن اس میں مسلمان بیچارا کیا کرے جو فتنہ تقدیس کی راہوں سے کھڑا کیا جاتا ہے، اُس کی رو میں بڑے بڑے بہہ جاتے ہیں یہ وہ جماعت ہے جو غیر صالح قیادت کے خلاف بڑے شدومد سے یہ الزام دھرتی رہی کہ یہ لوگ ان مناصب کے لئے امیدوار بن کر آگے آتے ہیں، حالانکہ اسلام میں کسی ایسے شخص کو منصب نہیں دیا جا سکتا جو اس کے لئے امیدوار ہو اور اس کی سند میں رسول اللہؐ کی یہ حدیث بڑے زور و شور سے پیش کرتی رہی کہ :-

قال رسول اللہؐ انا واللہ لا نولی علی ھذا العمل احدا سئلہ

او احدا حرص علیہ۔ (صحیح مسلم)

حضورؐ نے فرمایا کہ ہم بخدا یہ منصب حکومت کسی ایسے شخص کے حوالے نہیں کر سکتے جو اس کے لئے درخواست کرے یا اس کا طالب ہو۔

اب یہی جماعت، الیکشن میں اپنے امیدوار کھڑے کرے گی اور اس کا یہ عمل نہ اسلام کے اصولِ انتخاب کے خلاف جائے گا نہ رسول اللہؐ کے ارشادِ گرامی کے خلاف۔ یہ ہے "صالحین کی وہ جماعت" جو انقلابِ قیادت برپا کرنے کے لئے نیزوں پر قرآن لٹکا کر میدان میں آرہی ہے۔

طلوعِ اسلام کی نہ کوئی اپنی پارٹی ہے نہ اس کا کوئی امیدوار۔ اس لئے ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ الیکشن جیتنے کے لئے نہیں کہہ رہے ہیں۔ ہم مسلمانوں سے اتنا کہنا

چاہتے ہیں کہ اگر وہ "تقویٰ اور تقدس" کے نعروں سے متأثر ہو کر ان لوگوں کی تائید کرنے لگ گئے، تو دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو کر رہے گی۔

اپنا اقتدار

اگر حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں آگئی تو پاکستان پر پیشوائیت (THEOCRACY) کی وہ لعنت مسلط ہو جائے گی جسے اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اور اگر ان لوگوں نے دیکھا کہ زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ سے نکلے جا رہی ہے تو یہ پورے پاکستان کو تباہ کر دینے میں ذرا بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ ان کے پیشِ نظر محض اپنا ذاتی اقتدار ہے اور بس۔ نہ یہ پاکستان کے حامی ہیں نہ مسلمانوں کے ہمدرد۔ پاکستان کی حمایت اس لئے ہو رہی ہے کہ اس میں انہیں اپنا اقتدار قائم کرنے کے مواقع نظر آتے ہیں۔ اگر انہیں یقین ہو گیا کہ اس میں ان کا اقتدار قائم نہیں ہو سکتا، تو جس طرح یہ لوگ جناح کی قیادت کی شکست و ریخت میں پورا زور لگا رہے تھے، اسی طرح پاکستان کی تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ اللہ قوم کو ان مقدس فتنوں سے محفوظ رکھے۔

(۲) تعمیرِ سیرت نہیں الیکشن

سرمایہ داری کا نظام

جولائی سنہ ۱۹۵۰ء

ہمیں قائدینِ طلوعِ اسلام کی طرف سے استفسارات موصول ہو رہے ہیں کہ جب جماعتِ اسلامی بھی ملک میں قانونِ شریعت کا نفاذ چاہتی ہے اور طلوعِ اسلام کا مسلک بھی یہی ہے، تو پھر طلوعِ اسلام، جماعتِ اسلامی کی مخالفت کیوں کرتا ہے۔ اس موضوع پر ہم اس سے پہلے طلوعِ اسلام کی دو تین اشاعتوں میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں لیکن ان استفسارات سے مترشح ہوتا ہے کہ اس باب میں مزید تصریح کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے یہ کہا

دعویٰ سے کیا ہوتا ہے

جاتا ہے کہ جماعتِ اسلامی احیائے دین کی مدعی ہے اس لئے اس کی مخالفت درست نہیں۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا کسی فرد یا جماعت کا یہ دعویٰ کہ وہ دین کا احیاء یا قانونِ شریعت کا نفاذ چاہتی ہے تنہا اس امر کی دلیل بن سکتا ہے کہ اس فرد یا جماعت کی مخالفت، دین اور شریعت کی مخالفت ہے؟ قرنِ اوّل سے آج تک مسلمانوں کی تاریخ پر غور کیجئے۔ کتنے فتنے تھے جو خود مسلمانوں میں سے اسلام کی تخریب کے لئے اٹھے۔ کیا ان میں کوئی

بھی ایسا نہ تھا جس نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ میں دین کو مٹانے یا شریعت کو نیست و نابود
کرنے کیلئے میدان میں آیا ہوں۔ اُن میں سے ہر ایک یہی دعویٰ لے کر اٹھا تھا کہ وہ دین کے احیاء
اور شریعت کے نفاذ کے لیے مصروفِ سعی و عمل ہے۔ مسلمانوں کا ہر فرقہ اسی دعوے کی بنیاد پر
اٹھا اور اسی دعوت کے سہارے کھڑا رہا۔ اور تو اور مدعیانِ نبوت تک نے یہ نہیں کہا کہ
وہ اسلام کو مٹانے اور شریعت کو تباہ کرنے کے لئے مبعوث ہوئے ہیں وہ بھی اُٹھے تو
ہیا دلِ تھامے ہوئے گویا وہ قوم کے درد میں ڈوبا جا رہا ہے، اور یہ کہتے ہوئے کہ وہ تجدیدِ دین
اور احیائے شریعت کے لئے مامور ہوئے ہیں۔ ان حالات کے ماتحت کسی جماعت کے برسرِ
حق ہونے کے لئے محض یہ دلیل کہ اس کا دعویٰ شریعت کا نفاذ ہے کچھ وزن نہیں رکھتی۔ دیکھنا یہ
ہوگا کہ وہ کون سی شریعت ہے جس کا نفاذ وہ چاہتی ہے اور وہ کیا مقصد ہے جس کے لئے
وہ اس تحریک کو آگے بڑھا رہی ہے۔

جماعتِ اسلامی کی تحریک کا آغاز اس دعوے سے ہوا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان
صرف پیدائشی مسلمان ہیں انہیں صحیح معنوں میں مسلمان بننے کے لئے جماعتِ اسلامی کے امیر کے
ہاتھ پر تجدیدِ ایمانی کرنی چاہیئے۔ چنانچہ اس جماعت کے پہلے اجتماع میں اس تجدیدِ ایمان کا
مظاہرہ بھی کیا گیا۔ اس سے واضح ہے کہ اس جماعت کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کے ارکین یا کم ازکم
اس کے اربابِ بست و کشاد سچے معنوں میں مسلمان ہیں اور ان کی زندگی وہ معیار ہے جس پر
ہر سچے مسلمان کو پورا اترنا چاہیئے۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی بار بار اس دعویٰ کو دہراتی رہتی ہے کہ
علاوہ اُس کی قیادت بہترین افراد کے ہاتھوں میں ہے۔ یہاں تک کہ اس جماعت کے ایک مؤیّد مجلّے[1]

[1] پیامِ حق۔

نے یہ بھی لکھا تھا کہ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب" اپنے آپ کو چالیس کروڑ مسلمانوں میں تنہا پاتے ہیں" یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی معیاری زندگی کے مدعیوں میں کم از کم دیانت تو ضرور ہونی چاہیئے اب یہ دیکھئے کہ اس اعتبار سے واقعات ہمیں کس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں۔

اس حقیقت سے کون بے خبر ہے کہ تقسیمِ ہند سے پہلے جماعتِ اسلامی تحریکِ پاکستان کو غیر اسلامی تحریک قرار دیتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس تحریک میں چھوٹے سے چھوٹے تعاون کو بھی تعاون علی الاثم والعدوان (گناہ اور معصیت کے کاموں میں معاونت) تصور کرتی تھی چنانچہ یہ جماعت آخر تک تحریکِ پاکستان کی شدت سے مخالفت کرتی رہی لیکن پاکستان بننے کے بعد یہی جماعت اپنے آپ کو پاکستان کی سچی بہی خواہ بتا رہی ہے۔ ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۰ء کے ارشادات کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے " پاکستان کے تین سچے بہی خواہ جو تحریک اقامتِ دین کی سربراہ کاری کے جرم میں حوالۂ زنداں کئے گئے تھے" (پاکستان کے یہ تین سچے بہی خواہ ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، امین احسن صاحب اصلاحی اور میاں طفیل محمد ہیں)۔

دیانتداری

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو تحریک ابھی کل تک خلافِ اسلام قرار دی جا رہی تھی وہ اپنی کامیابی کے بعد کس طرح سے عین اسلام قرار پا گئی؟ وہی پاکستان جسے اس وقت "زہر ہلاہل" کہا جاتا تھا اپنے قیام کے بعد کس طرح منزل من اللہ مائدہ بن گیا جو خاص طور پر مقدسین کے اس طائفہ کے لئے آسمان سے اترا ہے اور جسے کسی "غیر مقدس" کو چھونے تک کی اجازت نہیں دی جا رہی۔ کیا دیانتداری اسی کا نام ہے؟

پاکستان کی مخالفت

اور آگے بڑھیئے۔ پاکستان کی مخالفت میں یہ جماعت دلیل یہ لایا کرتی تھی کہ مسلمانوں کو اپنی تعمیرِ سیرت اور

تطہیرِ کردار کی فکر کرنی چاہیئے۔ جب یہ ہو جائے گا تو سلطنت خود بخود ان کے پاؤں چومے گی۔

اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا تھا کہ خارجی حوادث اور ہنگامی واقعات سے حالات ایسے پیدا ہو رہے ہیں کہ ہندوستان سے انگریزی حکومت کی بساط سمٹتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ ہندوؤں کی حکومت کی بساط ساتھ کے ساتھ بچھتی جا رہی ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس وقت اپنی جداگانہ آزادی کے لئے جدوجہد نہ کی یا اس میں تساہل برتا تو انہیں صدیوں تک ہندوؤں کا غلام رہنا پڑے گا۔ اس لئے حالات کی تبدیلی کی بناء پر یہ ضروری ہے کہ حصولِ پاکستان کی تحریک کو کامیاب بنایا جائے۔ جب اپنی حکومت قائم ہو جائے گی تو تعمیرِ سیرت اور تطہیرِ کردار کے لئے تمام اسباب میسّر ہو جائیں گے۔ اُس وقت پورے اطمینان کے ساتھ یہ سب کچھ کیا جا سکے گا۔ اس پران کا جواب یہ تھا کہ تعمیرِ سیرت کے بغیر مسلمانوں کی آزادی اور ہندوؤں کی غلامی برابر ہے۔ اس لئے اصل کام تعمیرِ سیرت ہے جس کے بغیر سیاسی جدوجہد میں حصہ لینا گناہ کا کام ہے۔ یہ تھا اُن معیاری مسلمانوں کا مسلک قیامِ پاکستان سے قبل حصولِ پاکستان کے بعد یہ خود عملی سیاست کے میدان میں اتر آئے اور مسندِ حکومت و اقتدار پر متمکن ہونے کے لئے پورے جذب و انہماک سے مصروفِ عمل ہو گئے۔ کسی نے ان پر اعتراض کیا ہے کہ جماعتِ اسلامی کا اصلی کام تو تعمیرِ سیرت تھا۔ یہ مسلمانانِ پاکستان کی سیرت کی تبدیلی کے کاموں کو چھوڑ کر انتخابی مہموں کے پیچھے کیوں پڑ گئی؟ اس کے جواب میں ترجمان القرآن بابت جون ۱۹۵۱ء کے اشارات میں لفظاً لفظاً وہی کچھ کہا گیا ہے جو تحریکِ پاکستان کے حامی،

تعمیرِ سیرت نہیں، الیکشن

جماعتِ اسلامی سے قیامِ پاکستان سے پہلے کہا کرتے تھے۔ چند فقرے انہیں کے الفاظ میں دیکھئے۔ فرماتے ہیں :-

جماعت اسلامی ابتدائی تیاری (یعنی تعمیر سیرت) کے دور کو لمبا کرنا چاہتی تھی لیکن حالات نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے میدانِ کار میں طلب کر لیا ہے۔ ہمارے ماحول میں اسلامی اور غیر اسلامی فکر کے درمیان جو آویزش دھیمی دھیمی چلی آ رہی تھی، وہ تقسیم ہند سے قبل ہی خاصی تیز ہو چکی تھی لیکن آزادی اور تقسیم کے بعد وہ معاً انتہائی اشتعال پر پہنچ گئی۔ اب جب کہ حالات بتا رہے تھے کہ اس کشمکش کا فیصلہ اِدھر یا اُدھر بہت جلد ہو جانے والا ہے اور آزادی کے بعد کے ابتدائی پانچ سال (یا زیادہ سے زیادہ دس سال) اسلام کے لئے بالکل فیصلہ کن ہیں، تو جماعت اسلامی کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ بہر تن "عشق تبتّے اور بے خطر آتشِ نمرود" میں کود جانے اور اس موقع پر عقل کو محوِ تماشائے لبِ بام چھوڑنے کے علاوہ کوئی دوسری صورت تھی ہی نہیں۔ تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک انتہائی اہم موڑ مڑنے والی ہے اور اگر اسے غلط راستے پر جانے سے روکنے کے لئے فوراً ہی ایک منظم قوت اس کے آگے نہ آئے، تو پھر یہ دریا الحاد کے رُخ بہ جانے کے بعد جب کناروں کو کاٹتا ہوا اپنی رودگاہ کو گہرا اور اپنے پاٹ کو چوڑا کر چکے گا تو پھر اسے ایک نئی سمت میں موڑ دینا ایک محال کام ہو گا یہ اللہ کا احسان ہے کہ جماعت اسلامی کے راہنماؤں نے اپنے ماحول، اپنی حریف طاقتوں، اپنے دور کی تاریخ، اور اپنے وقت کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" کا ڈھنگ اختیار نہیں کیا کہ چاہے تمدن اور سیاست کی ساری بازی شاطرِ الحاد جیت جائے لیکن وہ ایک گوشے میں بیٹھے تعمیر سیرت کے کام میں لگے رہیں۔ جب اسلام دشمن طاقتیں زندگی کے حرم کے دروازے توڑ کر اس پر اپنا جھنڈا لہرانے کے لئے آخری ہلّہ بول رہی ہوں

تو ان لوگوں کی سیرت میں اور تقویٰ کس کام کا، جو اپنی جانوں کو بچانے کے لئے گھروں کے دروازے بند کئے بیٹھے رہیں۔

جماعتِ اسلامی کے اِس مسلک اور اُس مسلک کی تائید میں ان کے پیش کردہ دلائل کو غور سے دیکھئے اور پھر ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر اس پر نظر ڈالئے کہ جب حصولِ پاکستان کی تحریک کے دوران میں ان لوگوں سے یہی کچھ کہا جاتا تھا تو وہ اس قسم کے مسلک کو کس قدر غیر اسلامی اور اس قسم کے دلائل کو کس قدر پُر فریب بتایا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک خواہ سارے کے سارے مسلمان ہندوؤں کی غلامی میں جکڑے جاتے لیکن تعمیرِ سیرت کا کام مؤخر نہیں قرار دیا جاسکتا تھا لیکن آج جب ہوسِ اقتدار انہیں الیکشن لڑنے کے لئے کشاں کشاں لئے آرہی ہے تو تعمیرِ سیرت کے کام کو چھوڑ کر میدانِ سیاست میں ان کا ہر قدم اُسوۂ ابراہیمی کے اِتباع میں ہمہ تن عشق بن جاتا ہے اور تعمیرِ سیرت کے مستقل تقاضوں کو بے محابا محوِ تماشائے لبِ بام چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ ہے دیانتداری سے مفہوم جماعتِ اسلامی کی لغت میں!

اور رنگ بدلا ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ جماعت اسلامی، غیر اسلامی حکومت کی عدالتوں کی طرف رجوع کرنے کو تحاکم الی الطاغوت (یعنی اپنے مقدمات کے فیصلوں کے لئے غیر خدائی قانون کی طرف رخ کرنا) قرار دیا کرتی تھی اور اپنے اِس "تقویٰ" کے اظہار میں اس درجہ شدت برتتی تھی کہ عدالتی کاروبار سے متعلق ملازمتوں تک کو حرام کی روزی قرار دیتی تھی۔ پاکستان میں ابھی تک وہی عدالتی نظام کارفرما ہے جسے یہ جماعت طاغوتی نظام کہا کرتی تھی لیکن اب اسی جماعت کی حالت یہ ہے کہ مودودی صاحب اور ان کے دور فقائے کار کی نظر بندی کے سلسلے میں ان کا مسلسل تقاضا یہ رہا کہ

حکومت ان کے خلاف سوچ کر متعین جرم عاید کرے اور پھر اسے باقاعدہ عدالت

کے سامنے لایا گئے جو ملزم کو جواب دعویٰ پیش کرنے کا پورا پورا موقع دے اور پھر
پبلک لاء کے ماتحت معاملہ کا باقاعدہ فیصلہ ہو۔

(ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۰ء)

"باقاعدہ عدالت کی تصریح کرتے ہوئے ترجمان القرآن نے لکھا ہے کہ سیفٹی ایکٹ اور سیفٹی
آرڈیننس کے ماتحت کارروائی، باقاعدہ عدالتی کارروائی نہیں کہلا سکتی۔ باقاعدہ عدالت وہ ہے
جو عام قانون کے ماتحت عدالت کی حیثیت رکھتی ہے۔

خود مودودی صاحب نے اپنی پچھلی پریس کانفرنس میں موجودہ حکومتِ پاکستان کو غیر
اسلامی قرار دیا ہے۔ لہٰذا اُس حکومت کا عدالتی نظام وہی طاغوتی نظام ہے جس کی طرف
رجوع کرنے کو دوسروں کے لئے کفر کا موجب بتایا جاتا ہے۔ لیکن جب معاملہ خود اپنی ذات
کا آپڑا تو بار بار تقاضا کیا جاتا رہا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ اُسی طاغوتی عدالت سے ہونا چاہیئے،
اور وہ بھی قرآنی قانون کے ماتحت نہیں، بلکہ موجودہ "پبلک لاء" کے ماتحت۔

یہ ہے وہ جماعت جس کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کی زندگیوں نے عہدِ صحابہؓ کے سچے
اسلام کے نمونوں کو دوبارہ اجاگر کر دیا ہے۔!

ایک قدم اور بھی آگے بڑھیے آپ جماعتِ اسلامی کے لٹریچر کو دیکھئے اس میں ایک
ایک صفحہ پر آپ کو "کتاب و سنّت" کی طرف دعوت، اور اطاعتِ خدا اور رسول کی طرف رجعت
کا بلند آہنگ دعویٰ ملے گا۔ سنّت یا اطاعتِ رسول سے ان کی مراد یہ ہے کہ جو کچھ احادیثِ
نبوی صلعم میں درج ہے اس کی اطاعت عین دین ہے۔ چنانچہ یہ ہر اُس فرد یا جماعت کے

زمینداری عینِ اسلام ہے

خلاف جہاد کا اعلان کرتے رہتے ہیں جو روایات
کو قرآنی روشنی میں پرکھنے کی جرأت رکھتا ہو۔ اپنے

اس مسلک سے یہ لوگ ظاہر یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم ہمہ تن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہ دعویٰ ہے اور دوسری طرف حالت یہ ہے کہ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ الیکشن لڑنے کے لئے جاگیرداروں اور زمینداروں سے ساز باز ضروری ہے، تو جاگیرداری اور زمین داری کو عین اسلام بتلانے کے لئے کتابوں پر کتابیں لکھ ماریں۔ قرآن تو ان لوگوں کے نزدیک دین میں سند کی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ اصلی سند ہیں احادیث۔ لیکن بد قسمتی سے ایسی احادیث بھی موجود ہیں جو زمین کو بٹائی پر دینے کی مخالفت کرتی ہیں یہ مقام ذرا دشوار گزار ہے، قرآن سے بھاگ کر روایات کے دامن میں پناہ لینے کیلئے آئے لیکن دیکھا کہ زمینداری کے جواز میں یہاں بھی پناہ نہیں مل سکتی۔ آپ متعجب ہوں گے کہ احیائے سنّت کے یہ مدعیٔ اب کون سی راہِ فرار اپنے لئے پائیں گے لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات ہی نہیں، جن کے نزدیک مذہب صرف ایک ذریعہ ہو حصولِ مقصد کا اُن کے لئے گریز کے ہزاروں دروازے کھلے ہوتے ہیں، چنانچہ جناب امیر جماعتِ اسلامی نے نہایت مجتہدانہ شان سے فرما دیا کہ ان احادیث میں

دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ اور تھا اور وہ روایات میں کسی اور طرح بیان ہو گیا۔

ان روایات کے راوی صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ یا تو یہ صحابہؓ ارشادِ رسالت مآبؐ کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہ سکے اور یا (معاذ اللہ) انہوں نے دانستہ کچھ کا کچھ روایت کر دیا۔ آپ شاید یہ سوال کریں کہ خود مودودی صاحب کو اس کا علم کیسے ہو گیا کہ رسول اللہ نے کچھ اور ارشاد فرمایا تھا لیکن اس کا جواب تو بڑا آسان ہے۔ مودودی صاحب ماشاء اللہ خود سیّد ہیں۔ اس لئے یہ باتیں تو اُن کے اپنے گھرانے کی ہیں [1] سیّد ابوالاعلیٰ صحیح طور پر نہ جانیں تو اور کون جانے گا؟ اتنا ہی نہیں بلکہ حدیث کے

---

[1] فٹ نوٹ صفحہ ۳۶۷ پر ملاحظہ فرمایئے۔

بارے میں ان کا مسلک یہ بھی ہے کہ :۔

روایات کے باب میں محدثین کا مستند ہونا یہ معنی کب رکھتا ہے کہ جن امور کا تعلق عقل، درایت اور فہم واستنباط سے ہے ان میں بھی وہ بالکل معتمد سمجھے جائیں۔

یعنی جب قرآن اپنے مقصد کے خلاف جائے تو کہہ دیا کہ قرآن کا صحیح مفہوم احادیث میں مل سکتا ہے اور جب احادیث اپنے مطلب کے خلاف جائیں تو کہہ دیا کہ نامعلوم رسول اللہ نے کیا ارشاد فرمایا اور صحابہؓ نے کیا روایت کر دیا۔ اور اگر کسی نے کسی روایت کا مستند ہونا ثابت کر دیا تو کہہ دیا کہ ہمارا استنباط ان کی سند کو منسوخ کرتا ہے۔

یہ ہے مقام امیر جماعت اسلامی کا! سبحان اللہ! اعظم شانہٗ۔

یہ ہیں چند مثالیں ان لوگوں کی دیانت کی جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کی زندگی اسلام کی معیاری زندگی ہے اور پیدائشی مسلمانوں کو ان کے ہاتھ پر تجدید ایمان کرنی چاہیئے۔ اگر صرف پاکستان کی تائید اور مخالفت کے معیار پر ہی دیکھا جائے تو ان لوگوں سے زیادہ اپنے قول کے سچے تو وہ نیشنلسٹ مسلمان ہیں جو پاکستان کی مخالفت کرتے رہے اور آج بھی ہندوستان ہی میں ہندی قوم کے افراد کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنی پاکستان کے مسلمانوں کو وہ فریب نہیں دے سکتے جو جماعت اسلامی کے یہ نقاب پوش ناصحینِ مُشفق دے رہے ہیں۔ اسی لئے تو قرآن مفاد پرستوں کو جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں جگہ دیتا ہے۔

فٹ نوٹ[1] صفحہ ۳۴۴

[1] احادیث کے بارے میں مودودی صاحب کے اس فیصلہ کے متعلق کہ انہیں ایک مزاج شناسِ رسول ہی پرکھ سکتا ہے، (باب سوم اور پنجم دیکھئے)۔

جماعتِ اسلامی کا اسلامی نظام

یہاں تک تو ہم نے یہ بتایا ہے کہ جماعتِ اسلامی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کس حد تک دیانت کے ساتھ چلتی ہے۔ اب دوسری چیز یہ دیکھنے کی ہے کہ وہ جس اسلامی نظام کے قیام کی مدعی ہے وہ نظام ہے کیا؟ طلوعِ اسلام کے صفحات میں یہ حقیقت متعدد بار دہرائی جا چکی ہے کہ ہمارا موجودہ مذہب جو ظنیات کے آسرے پر قائم ہے ہمارے دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح شخصی اجارہ داریوں کو قائم رکھا جائے۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ شخصی اجارہ داریاں قائم نہیں رہ سکتیں تاوقتیکہ انہیں اربابِ مذہب کی تائید حاصل نہ ہو۔ جس طرح روما کے قیصر کے لئے پوپ کی ضرورت تھی اور ہندوستانی راجاؤں کے لئے برہمنوں کی، اسی طرح مسلمان بادشاہوں، نوابوں، جاگیرداروں، زمینداروں اور سرمایہ داروں کے لئے محراب و منبر سے تائید کی ضرورت تھی۔ یہ ہماری بدبختی ہے کہ آج جب کہ ساری دنیا رفتہ رفتہ زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ملوکیت کی لعنت کو جسدِ انسانیت سے الگ کر چکی ہے یا الگ کرنے کے لئے کوشاں ہے، ملوکیت اپنے تمام استبداد و قہرمانیت کے ساتھ اگر کہیں مسلط ہے تو مسلمانوں کے ملکوں میں۔ پاکستان کی مملکت نئی نئی وجود میں آئی ہے لہٰذا یہاں توقع کی جا سکتی ہے کہ ملوکیت کی لعنت اس پر مسلط نہیں ہو گی لیکن جماعتِ اسلامی ایک عجیب فریب انگیز انداز میں شخصی اجارہ داریوں کی لعنت کو پاکستان پر مسلط کرنے کے درپے ہے۔ بظاہر دیکھئے تو ملّا ازم کے دشمن، لیکن ذرا نقاب سرکا کر جھانکیے، تو وہی ملوکیت کے قائم کرنے والے متشدد ملّا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ہم قدامت پرست ملّا نہیں بلکہ ماڈرن لیڈر ہیں، انہوں نے انگریزی کے چند الفاظ یاد کر رکھے ہیں اور موقع بے موقع انہیں کو دہراتے رہتے ہیں۔ ملوکیت

کی لعنت کو پاکستان پر مسلط کرنے میں ان کی دو اغراض پوشیدہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں ان کا ذاتی فائدہ ہے کہ جو جماعت شخصی اجارہ داریوں کو قائم رکھے گی شخصی اجارہ داری بہر حال، اس کا معاوضہ دے گی اور دوسرے یہ کہ پاکستان کے قیام اور تشکیل کے خلاف جو جذباتِ مخالفت ان کے سینے میں دس سال تک موجزن رہے ہیں، وہ انہیں آج بھی رہ رہ کر اُکسا رہے ہیں کہ پاکستان کو ایک ایسی مملکت نہ بننے دیا جائے جس سے یہ دنیا میں سر اونچا کر کے چل سکے یہ لوگ چاہتے یہ ہیں کہ پاکستان بھی افغانستان، عرب، ایران وغیرہ کی طرح ملّاؤں کے قبضہ میں جکڑا رہے اور اس طرح دنیا کی زندہ قوموں کے رحم و کرم پر اپنی زندگی کے دن گزارے۔

سرمایہ داری کا نظام

قرآن ہر قسم کی شخصی اجارہ داری اور سرمایہ داری کے خلاف ایک برہنہ شمشیر تھا۔ اس نے دنیا میں سب سے پہلے ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کیا جس میں نہ کوئی شخص کسی دوسرے کا محکوم تھا نہ محتاج، زمین اور اس کے تمام خزانے، آسمان اور اس کی تمام برکتیں، بالفاظِ دیگر خدا کی ربوبیتِ عامہ کے تمام وسائل اور ذرائع، ہر انسان کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے، جن سے وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشو و نما کر سکے اور اس طرح نوعِ انسانی شرفِ انسانیت کے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اقطار السموات والارض سے بھی بلند ہو جائے کہ یہی قرآن کا مقصود اور اسلامی نظام سے مفہوم تھا لیکن ملوکیت کی اجارہ داریوں نے مذہبی آسروں کی بدولت وسائل و ذرائع ربوبیت کو پھر سے شخصی ملکیتوں میں لے لیا اور اس طرح رزق کے سرچشموں پر قابض ہو کر دوسرے انسانوں کو اپنی ہوسناکیوں کا آلۂ کار بننے پر مجبور کر دیا۔ یاد رہے کہ ملوکیت سے مراد صرف بادشاہت ہی نہیں، اس کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ ہر وہ نظام جو رزق کے سرچشموں کو انفرادی ملکیت میں دے دیتا ہے یا ایسے نظامِ زندگی کی حمایت کرتا ہے، نظام

ملوکیت کے دائرہ میں شامل ہے خواہ وہ مغفور و خاقان ہو یا گاؤں کا بسوہ دار یا ان کی حمایت کرنے والا ملا۔ پاکستان میں قرآنی نظام کے نفاذ کا مطالبہ اسی مقصود کو لئے ہوئے ہے کہ اللہ نے جب ہمیں یہ امکانی قوت عطا کی ہے کہ ہم اس سرزمین میں جس قسم کا معاشرتی نظام چاہیں قائم کرلیں تو یہاں وہی نظام ربوبیت قائم ہونا چاہیئے جس میں انسانیت نہ اجارہ داروں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہو اور نہ ان کے حمایتیوں کی تسبیحوں کے تاگوں میں پروئی ہوئی۔ یہ نظام ہر قسم کے سرمایہ دار اور اس کے حمایتی کے لئے پیغام موت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار یا تو بلاواسطہ اس کی علانیہ مخالفت کر رہے ہیں اور یا بالواسطہ مخالفت کے لئے اپنے حمایتی ڈھونڈ رہے ہیں۔ جماعتِ اسلامی پاکستان کی مخالفت کی وجہ سے بدنام ہو چکی ہے۔ اس لئے وہ بھی اس تلاش میں تھی کہ انہیں حصول مدارج کے لئے کہیں سے تقویت کا سامان مل جائے۔ یہی وہ تقاضے ہوتے ہیں جہاں ملوکیت اور ملائیت میں سمجھوتہ ہوا کرتا ہے۔ آنے والے انتخابات نے اس کے لئے اور بھی فضا سازگار کردی اور یہ سمجھوتہ عمل میں آگیا۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی جاگیرداری اور زمینداری کو عین کتاب و سنت کے مطابق ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے اور اس کا نام رکھ رہی ہے احیائے دین اور قانون شریعت کا نفاذ۔

اے بسا گر قیامت را برآری سرز خاک — سربرآرد ایں قیامت درمیان خلق ہیں

اور اس پر طرہ یہ کہ اپنے آپ کو یہ جماعت سرمایہ داری اور جامد مذہبیت کی مخالف قرار دیتی ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کی نظر بندی کے سلسلے میں ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۰ء کے اشارات میں ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

خدا کے دین کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کا علَم جب بھی کسی

> بندۂ حق نے اٹھایا ہے، تو اس کا راستہ روکنے کے لئے حکومت، سرمایہ داری اور جامد مذہبیت کی مختلف طاقتیں دوش بدوش کھڑی ہو گئی ہیں۔

کتنا بڑا ہے یہ فریب جو بھولے بھالے مسلمانوں کو دیا جا رہا ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ وجوہات جن کی بنا پر طلوعِ اسلام، جماعتِ اسلامی کے مسلک کی مخالفت کرتا ہے۔ ہم اس باب میں صرف اتنا گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ آپ مخالفت اور موافقت کے تمام تاثرات سے الگ ہٹ کر ان تصریحات پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے جو سطورِ بالا میں پیش کی گئی ہیں اور اس کے بعد سوچئے کہ کیا کوئی ایسا مسلمان جو مفاد پرستی کے جذبات سے الگ ہو کر اپنا لائحہ عمل قرآن کی روشنی میں متعین کرنا چاہتا ہو، کسی صورت میں بھی جماعتِ اسلامی کے مسلک کی تائید کر سکتا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے اربابِ اقتدار اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی زندگیوں میں جماعتِ اسلامی کو اپنے حق میں پروپیگنڈہ کرنے کے لئے بہت سا مسالا مل جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام خود ان لوگوں کی نہج زندگی کے خلاف سرتاپا صدائے احتجاج ہے۔ لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ ہم موجودہ بساط کی جگہ جو نئی بساط بچھانا چاہتے ہیں، وہ کیسی ہے۔ طلوعِ اسلام خالص قرآنی نظامِ ربوبیت کے نفاذ کا مدعی ہے۔ جماعتِ اسلامی اس کے برعکس شخصی اجارہ داری اور اس اجارہ داری سے وابستہ عیش پرستیوں کے لئے شرعی جوازؔ کی سندیں مہیا کرنے اور انسان کی فکری صلاحیتوں

؎ جماعتِ اسلامی غلامی کو عین شریعت کے مطابق بتاتی ہے۔ چنانچہ طلوعِ اسلام میں مودودی صاحب کا وہ مضمون شایع ہو چکا ہے جس میں انہوں نے جنگ کے قیدیوں کو غلام اور اُن کی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر بلا قیدِ تعداد امراء کے محلات میں داخل کرنے کو شریعتِ حقّہ کے

کو معطّل کر دینے والی ملّائیت کے نظام کو مسلّط کر دینے کے لئے کوشاں ہے اور اس کا نام انہوں نے رکھا ہے نظامِ اسلامی اور قانونِ شریعت۔ اب آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ اس نظام کو اسلام سے کیا واسطہ ہے اور طلوعِ اسلام کس طرح اس نظام اور اسے اسلامی کہہ کر پیش کرنے والوں کی حمایت کر سکتا ہے۔
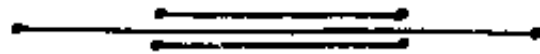
تقاضوں میں سے بتایا تھا اور ملوکیت کی اس ہوس پرستانہ لعنت کو اسلام کیلئے وجہ فخر قرار دیا تھا۔ یہ مضمون "تین اہم عنوانات" کے نام سے الگ کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

انتخابی مہمات

(دسمبر ۱۹۵۰ء)

پنجاب میں جوں جوں انتخابات کا زمانہ قریب آتا جاتا ہے، انتخابی اکھاڑے میں شریک ہونے والی پارٹیاں اپنی اپنی کوششوں میں تیز تر ہوتی جارہی ہیں۔ ہر پارٹی اپنی خدمات جلیلہ کے منشور اس طرح ووٹروں کے حضور پیش کر رہی ہے، جیسے انگریزوں کے زمانے میں گاؤں کے سفید پوش، ڈپٹی کمشنروں کے سرٹیفکیٹ یا بعض اوقات اپنی بھیجی ہوئی چٹھیوں کی رسیدیں فراہم کرا کر لئے لئے پھرا کرتے تھے۔ اس تیز خرامی میں اسلامی جماعت بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ ان کے من میں ایک چور ہے۔ انہیں یہ کھٹکا ہے کہ لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ تم ساری عمر پاکستان کی مخالفت کرتے رہے ہو، تقسیم ہند تک اس تجویز میں کیڑے ڈالتے رہے اور آج تم پاکستان کے سب سے بڑے حامی بن کر پاکستان کے نام پر ووٹ مانگتے ہو۔ تمہیں پاکستان کے

خدمات شماری

نام پر ووٹ لینے کا کیا حق ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ یہ اعتراض پیدا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے ابھی سے اس کی پیش بندی شروع کر دی ہے، یعنی اپنی تحریروں میں ظاہر کرنا شروع کر دیا ہے کہ اسلامی جماعت شروع سے پاکستان کی حامی رہی ہے بلکہ یہ تو اس باب میں مسٹر جناح سے بھی ایک قدم آگے تھی مثلاً ترجمان القرآن بابت ماہ اکتوبر کے اشارات میں تحریر فرماتے ہیں۔

ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لئے کوشش کی تو اس لئے نہیں کہ دوسری قومیں

کی طرح اس قوم کا بھی امتیازی وجود برقرار رہے بلکہ صرف اس لئے کہ یہ قوم دنیا میں
حق کی شہادت ادا کرنے کے لئے زندہ رہے۔ ہم نے ایک آزاد مسلم مملکت کا قیام
بھی چاہا تو اس غرض سے نہیں کہ روئے زمین پر ایک اور ترکی یا ایک اور مصر یا ایران
کا اضافہ ہو جائے بلکہ صرف اس غرض سے کہ ایک خالص اسلامی ریاست قائم
ہو جو اسلامی نظامِ زندگی کا مکمل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔

مودودی صاحب نے یہاں یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ بھی پاکستان کے قیام کی حمایت کرتے تھے۔

ترجمان القرآن نومبر کی اشاعت کے اشارات میں مودودی صاحب نے لکھا ہے
کہ جب مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ:۔

واحد قومیت کے اصول پر جو جمہوری نظام بنے گا، اس میں کوئی آئینی تحفظات
کے کام نہیں آسکتا مگر اب اس پیچیدگی کا حل کیا ہے یہ سوال سخت پریشان کن تھا
ایک گروہ نے یہ خیال پیش کیا کہ تقسیمِ ملک کا مطالبہ پیش کیا جائے اور ان علاقوں کو
ہندوستان سے الگ کرا لیا جائے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن بہت سے لوگوں کو
جن میں ابتداءً خود مسٹر جناح مرحوم بھی شامل تھے اس حل کو قبول کرنے میں اس بناء
پر تامل تھا کہ یہ صرف آدھی قوم کے مسئلہ کو حل کرتا ہے۔ بقیہ آدھی جو ہندوستان کے
بڑے حصے میں کمزور اقلیت کی حیثیت سے منتشر ہے بالکل اکثریت کے رحم پر چھوٹ جاتی ہے۔

اس کے لئے انہوں نے لکھا ہے کہ اسلامی جماعت نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اگر مسلمان" قومی
مفاد کی بجائے" اپنے اصول اور اپنے نظریۂ حیات کے لئے جدوجہد شروع کر دیں تو چند
سال کے اندر پورا ہندوستان دارالاسلام بن جائے گا اس کے بعد ارشاد ہے کہ اس
نظریہ نے قوم کی اکثریت کو اپیل نہ کیا اور مسلمانوں نے بحیثیت ایک قوم کے" پاکستان کے

نظریہ کو اپنا مطمحِ نظر بنالیا۔"

اب آگے دیکھئے مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اس کے بعد جماعتِ اسلامی کی بنیاد ڈالی گئی۔

اس تنظیم سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ اسی وقت سے ایک ایسے منظم و تربیت یافتہ گروہ کو تیار کرنا شروع کر دیا جائے جو برِّ عظیم میں اسلام کے غلبہ کے لئے کام کرنے کے قابل ہو۔ اگر خدانخواستہ مسلمان تقسیم ملک کی جدوجہد میں ناکام ہو جائیں تو یہ گروہ اس ناکامی کے خوفناک نتائج کا مقابلہ کرنے کے لئے موجود رہے اور اگر ملک تقسیم ہو جائے تو ہندوستان اور پاکستان دونوں میں یہ گروہ اسلام کا علَم بلند کرنے کے لئے تیار رہے۔

ہوشیار جرنلسٹ

مودودی صاحب ایک بڑے ہوشیار جرنلسٹ ہیں۔ اور دورِ حاضرہ میں جرنلزم کی خوبی یہ ہے کہ بات کبھی صاف صاف نہ کی جائے۔ ایسا تلبیس پہلو اختیار کیا جائے کہ قارئین کو شعوری طور پر اپنا ہم نوا بنا لیا جائے۔ مودودی صاحب نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ جماعتِ اسلامی پاکستان کی مخالفت کرتی رہی اور پاکستان کے حامیوں کو گالیاں دیتی رہی۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ پاکستان کے حامی تو صرف حصولِ پاکستان کی فکر کر رہے تھے اور ہماری جماعت اس معاملہ میں ان سے بھی دو قدم آگے تھی۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان نہ بن سکا تو مسلمانوں کو کیسے بچایا جائے گا اور اگر پاکستان بن گیا تو جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کی حفاظت کا انتظام کس طرح کیا جائے گا۔ غور کیجئے انہوں نے کس طرح اپنے آپ کو نہ صرف پاکستان کا حامی ہی بتلا دیا، بلکہ قوم کے سر پہ یہ احسانِ عظیم رکھا ہے کہ تم اور تمہارے لیڈر

صرف پاکستان بنانے کی فکر میں تھے اور ہم دونوں صورتوں کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کو بچانے کی فکر میں۔

چیلنج ان لوگوں نے خوب سمجھ رکھا ہے کہ پبلک کا حافظہ بڑا کمزور ہوتا ہے اور لفظی اُتار چڑھاؤ سے انہیں بڑی آسانی سے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔

لیکن ہم مودودی صاحب کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ جماعتِ اسلامی کے قیام کے بعد تقسیم ملک تک اپنے سارے لٹریچر سے کہیں سے بھی یہ ثابت کر دیں کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی حمایت کی تھی اور اپنی جماعت سے یہ کہا تھا کہ تم اس مقصد کے لئے تیار رہو تاکہ اگر خدانخواستہ پاکستان نہ بن سکا تو اس ناکامی کے خوفناک نتائج کا مقابلہ کیا جائے گا۔ وہ اپنے سارے لٹریچر سے کہیں سے یہ بات نکال دیں جہاں سے اُن کے اِس دعوے کی تصدیق ہوتی ہو، یعنی یہ کہ انہوں نے

(۱) ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کی حمایت کی تھی۔ اور

(۲) یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر خدانخواستہ پاکستان نہ بنا تو پھر ان کی جماعت مسلمانوں کے تحفظ کے لئے تیار ہو گی۔

مودودی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسلامی جماعت نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر ملک تقسیم ہو گیا تو اسلامی جماعت ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اسلام کا عَلَم بلند کرنے کے لئے تیار رہے گی۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ اسلامی جماعت ہندوستان میں اسلام کا عَلَم بلند کرنے کے لئے کیا کر رہی ہے۔؟

ضمناً یہ بھی دیکھئے کہ مودودی صاحب نے انہی اشارات میں فرمایا ہے کہ جماعتِ اسلامی کی تحریک کا آغاز ۱۹۳۳ء میں ہوا تھا۔

اس کے بعد انہوں نے اُس ابتدائی منزل کی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے (جس کا انہوں نے خود بھی ذکر کیا ہے) کہ اسلامی جماعت کی بنیاد ہی ۱۹۴۱ء میں ڈالی گئی تھی۔ غالباً اپنی بنیاد سے پہلے یہ جماعت "عالمِ امر" میں تھی۔

وزارتوں کی کرسیاں تو واقعی بڑی چمکیلی ہوتی ہیں لیکن ان کے حصول کے لئے انسان کو جو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، وہ بھی کچھ کم جگر خراش نہیں ہوتے۔ اور یہ جگر خراشی اور بھی شدید ہو جاتی ہے جب کوئی شخص کھلے بندوں سامنے آنے کی بجائے اس میدان میں مذہب کے سائے میں اس طرح دبے پاؤں آگے بڑھے۔

چوں زاہدے کہ بہ بزمِ شراب می آید!

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا!

(اپریل ۱۹۵۱ء)

امیرِ جماعتِ اسلامی، سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اکتوبر ۱۹۵۰ء میں حکومت کے مسودۂ دستورِ پاکستان کے خلاف لمبی چوڑی تقریر فرمائی۔ دورانِ تقریر میں کسی شخص نے حسبِ ذیل سوال کیا۔

آپ نے پاکستان کو اسلامی ریاست اس بناء پر مانا تھا کہ قراردادِ مقاصد پاس کر دی گئی تھی لیکن اب جبکہ اس قرارداد کو لپیٹ کر رکھ دیا گیا ہے اور ایک غیر اسلامی دستور بنایا جا رہا ہے کیا اب بھی اس ریاست کی وہی پوزیشن باقی رہے گی؟ کیا ایک غیر اسلامی دستور بن جانے سے یہ ریاست غیر اسلامی نہ ہو جائے گی؟

اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:۔

پاکستان کو جس چیز نے اسلامی ریاست بنایا وہ یہ چیز نہیں تھی کہ دستور ساز اسمبلی کے ممبروں نے قراردادِ مقاصد پاس کر دی۔ بلکہ یہ تھی کہ باشندگانِ پاکستان نے بالاتفاق مطالبہ کر کے اس قرارداد کو پاس کروایا اس لئے کہ ملک دستور ساز اسمبلی کے ممبروں کا نہیں ہے۔ بلکہ پاکستان کے عوام کا ہے۔ عوام نے جب چاہا کہ ان کا ملک خدا کا ملک قرار پائے اور اس کا باقاعدہ اظہار انہوں نے

اپنی آئینی زبان یعنی دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ سے کردیا، تو یہ ملک فی الواقع اللہ تعالیٰ کی نذر ہوگیا اور ہماری ریاست ایک اسلامی ریاست بن گئی۔ اب اگر اس ملک اور اس ریاست کی نوعیت کو کوئی چیز بدل سکتی ہے تو وہ دستور ساز اسمبلی کے ممبروں کا کوئی فعل نہیں، بلکہ پاکستان کے عوام کی مجموعی خواہش ہی بدل سکتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ امیر جماعتِ اسلامی نے لفظوں کی سحر کاری سے بزعمِ خویش کیسی عمدہ پناہ تراشی ہے۔ اس وقت اگر یہ پوچھا جاتا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ قرار دادِ مقاصد کو باشندگانِ پاکستان نے بالاتفاق مطالبہ کرکے پاس کروایا ہے، تو اس کیلئے شاید لفظی نزاع شروع ہو جاتی لیکن اب ایک ایسی صورت سامنے آئی ہے جو اس مسئلہ میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ مختصر الفاظ میں مودودی صاحب کی دلیل یہ تھی کہ یہ صرف صاحبِ اقتدار طبقہ کے چند افراد ہیں جو ملک میں صالح نظام کو رائج نہیں ہونے دیتے۔ ورنہ یہاں کے جمہور مسلمان بالاتفاق یہی

ایک محکم دلیل

چاہتے ہیں کہ یہاں اسلامی نظام رائج ہو جس کی زمامِ اقتدار صالح افراد امت کے ہاتھ میں ہو۔ پنجاب کے الیکشن نے یہ موقع بھی بہم پہنچا دیا کہ اس امر کا بین ثبوت مل جائے کہ جمہور مسلمان فی الواقع اسلامی نظام کے خواہاں ہیں یا یہ بات بھی مودودی صاحب نے محض اپنی بات کی نزیچ میں کہہ دی تھی۔ اس الیکشن میں اسلامی جماعت نے اپنے امیدوار کھڑے کئے۔ ان امیدواروں کا دعویٰ یہ تھا کہ اسلامی نظام کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اور جماعتِ اسلامی کی طرف سے انہیں صالح ہونے کی سند بھی حاصل تھی۔ اگر مودودی صاحب کا یہ دعویٰ صحیح ہوتا کہ جمہور مسلمان اسلامی نظام کے خواہاں ہیں اور اس مقصد کے لئے انہوں نے قرار دادِ مقاصد بالاتفاق پاس کرا دی تھی تو اس کے ثبوت میں اتنا ہونا ضروری تھا کہ جمہور مسلمان اسلامی جماعت کے نمایندوں کو ووٹ دیکر

انہیں کامیاب بنا دیتے۔ لیکن ہُوا یہ ہے کہ ان تمام نمایندوں میں سے صرف ایک شخص کامیاب ہو سکا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کم از کم پنجاب کے جمہور مسلمان اس کے خواہاں نہیں کہ وہاں اسلامی نظام قائم ہو یا زمامِ اقتدار صالحین کے ہاتھ میں آئے۔ لہٰذا اس سے یہ واضح ہے کہ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے، قرار دادِ مقاصد جمہور مسلمانوں نے بالاتفاق پاس نہیں کرائی تھی۔ اس بناء پر وہ اعتراض اپنی جگہ قائم رہتا ہے جو مودودی صاحب کی مذکورہ صدر تقریر کے دوران میں کسی صاحب نے کیا تھا۔ یعنی یہ ثابت ہو گیا کہ پنجاب اسلامی ریاست نہیں ہے۔ لہٰذا اب یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ جب پنجاب کی ریاست اسلامی نہیں رہی تو اس کے متعلق اسلامی جماعت کا کیا رویہ ہو گا[1]

دیانت پسند نگاہوں میں یہ بات اتنی واضح ہے کہ اب جماعت اسلامی کے لئے اس الجھاؤ سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی لیکن آپ دیکھیں گے کہ اب اس کے امیر

اس کے بعد

کوئی اور پینترا بدلیں گے جس طرح مرزا صاحب قادیانی کی حالت تھی کہ جب اُن کی ایک پیش گوئی غلط ثابت ہوا کرتی تھی اور لوگ سمجھتے تھے کہ اب یہ اپنے دعوے سے باز آ جائیں گے تو وہ باز آنے کی بجائے دو پیشین گوئیاں اور کر دیا کرتے تھے۔ چونکہ جماعتِ اسلامی کی مطلب برآری اسی سے ہو سکتی ہے کہ وہ پاکستان کو اسلامی ریاست قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس کے

---

[1] اس کے بعد صوبہ سرحد اور سندھ کے الیکشنوں میں بھی یہی کچھ ہوا۔ لہٰذا مغربی پاکستان کے متعلق تو یہ ثابت ہو گیا کہ یہاں کے عوام مودودی صاحب کا اسلامی نظام نہیں چاہتے۔

غیراسلامی تسلیم کرلینے سے اس جماعت کے لئے الیکشن بازی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، اس لئے اب یہ حضرات اسے اسلامی ریاست ثابت کرنے کے لئے کوئی اور دلیل گھڑلیں گے۔

معاشی مجبوریاں بھی انسان سے کیا کچھ کراتی ہیں۔

”صالحین“ کی زبان

(1) صالحین کی زبان

(مئی ۱۹۵۲ء)

"یہ منکرینِ حدیث دراصل جہلِ مرکب میں مبتلا ہیں جس چیز کو نہیں جانتے اسے جاننے والوں سے پوچھنے اور سمجھنے کی بجائے عالم بن کر فیصلہ صادر کرتے ہیں اور پھر انہیں شائع کر کے عوام الناس کو گمراہ کرنا شروع کر دیتے ہیں ان کی گمراہ کن تحریریں اکثر ہماری نگاہ سے گذرتی رہتی ہیں اور ان کا کوئی اعتراض ایسا نہیں جس کو دلائل سے رد نہ کیا جا سکتا ہو لیکن جس وجہ سے مجبوراً خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے، وہ دراصل یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی بحث میں بالعموم بازاری غنڈوں کا سا طرز اختیار کرتے ہیں۔ ان کے مضامین پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک غلاظت بھری جھاڑو ہاتھ میں لئے کھڑا ہو اور زبان کھولنے کے ساتھ ہی مخاطب کے منہ پہ اس جھاڑو کا ایک ہاتھ رسید کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے منہ لگنا کسی شریف آدمی کے بس کی بات نہیں ہے اور نہ اس قماش کے لوگ اس لائق سمجھے جا سکتے ہیں کہ ان سے کوئی علمی بحث کی جائے۔"

(ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۲ء)

قدم بہ قدم

اس کے ساتھ اس عبارت کو بھی ملا کر پڑھ لیجئے۔

قادیان میں ایک بدگو مخالف آیا ہوا تھا جس نے حضرت کے خدام

میں سے ایک کو اپنے پاس بُلا بھیجا جو اس کے ساتھ گفتگو کرنے چلا گیا جب اس امر کی حضرت مسیحِ موعود کو خبر ملی تو آپ نے فرمایا کہ ایسے خبیث مُفسِد کو اتنی عزت نہیں دینی چاہیئے کہ اس کے ساتھ تم میں سے کوئی بات چیت کرے۔" (ملفوظاتِ احمدیہ، حصہ چہارم ص۱۴۵) —— "حیرت ہے کہ ان لوگوں (یعنی میرزا صاحب کے مخالفین) کو نجاست خواری کا کیوں شوق ہو گیا۔"

(ارشادِ میرزا صاحب، مندرجہ تبلیغِ رسالت جلد دوم ص۹۴)

صالحین کی زبان

(اپریل ۱۹۵۲ء)

سوال:۔ ابھی ابھی ایک پرچہ "طلوعِ اسلام" نظر سے گذرا۔ یہ پرچہ قریب قریب اُن مضامین پر مشتمل ہے جن میں آپ کی کتاب "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" کی قرآن کی رو سے تردید کی گئی ہے۔ پرچے کے جملے ایسے ہیں جیسے برسوں کی چھپی ہوئی دشمنی کا بدلہ نکال رہے ہیں۔ اس پرچہ کے آخر میں یعنی آخری صفحہ پر مفتی محمد شفیع کے ایک تازہ فتوے کی جسے مولانا سید سلیمان ندوی کی تائید حاصل ہے تردید بھی کی گئی ہے۔

ہماری سمجھ میں یہ نہ آسکا کہ آخر کس ہستی کو یہ لوگ مستند خیال کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آئندہ ماہ کے "ترجمان القرآن" میں آپ اس کا جواب لکھ رہے ہیں یا نہیں؟ اگر کسی دوسرے پرچہ میں اس کا جواب لکھ رہے ہوں تو ہمیں آگاہ کر دیں تاکہ جو لوگ اس پرچے (طلوعِ اسلام) کو پڑھ کر آپ کی طرف سے بددل ہو گئے ہیں ان کا ازالہ کر دیا جائے۔

جواب:۔ ہمیں تعجب ہے کہ طلوعِ اسلام کے تازہ ارشادات پر آپ نے ہمیں توجہ دلانے کی ضرورت کیوں محسوس فرمائی۔ یہ لوگ تو مسلسل دس سال سے ہم پر ایسی ہی

عنایات کی بارش کئے جا رہے ہیں اور کراچی سے نیا "طلوعِ اسلام" شروع ہونے کے بعد تو شاید کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرا ہے جس میں موسلا دھار بارش نہ ہوئی ہو۔ پھر اس موقع پر کیا خاص بات ایسی پیش آگئی کہ آپ نے ہم سے ان کے جواب کی فرمائش کرنا ضروری سمجھا۔ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ترجمان القرآن کے صفحات میں آج تک ہم نے کبھی ان حضرات کو مخاطب نہیں کیا ہے؟

ہم توقع رکھتے تھے کہ ان کے حملوں پر ہمارے توجہ نہ کرنے کی وجہ ہر معقول آدمی، جو طلوعِ اسلام اور ترجمان القرآن دونوں کو پڑھتا ہے خود سمجھ لے گا لیکن آپ کے اس خط سے محسوس ہوا کہ شاید بعض لوگوں کے لئے اس سلسلہ میں ہماری طرف سے کچھ تصریح کی ضرورت بھی ہے۔ لہٰذا یہاں دو اصولی باتیں عرض کی جاتی ہیں جن سے آپ کو نہ صرف طلوعِ اسلام کے معاملہ میں، بلکہ اُن بہت سے دوسرے لوگوں کے معاملہ میں بھی ہمارے سکوت کی وجہ معلوم ہو جائے گی جو اخبارات، رسائل اور پمفلٹوں میں ہم پر آئے دن حملے کرتے رہتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ جو لوگ کسی شخص کی عبارات کو توڑ مروڑ کر اور اُن کے ساتھ کچھ اپنی من گھڑت باتیں ملا کر پہلے اس کی ایک غلط پوزیشن بناتے ہیں اور پھر اپنی ہی بنائی ہوئی اُس پوزیشن پر حملہ کرتے ہیں۔ ان کی اس حرکت سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ تین قسم کی کمزوریوں میں مبتلا ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اخلاق و ذہن کے اعتبار سے نامرد ہیں۔ ان میں یہ جرأت نہیں ہے کہ آدمی کی اصلی پوزیشن پر حملہ کر سکیں۔ اس لئے پہلے وہ اس کی ایک ایسی کمزور پوزیشن بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس پر حملہ کرنا آسان ہو۔ پھر بہادروں کی سی شان کے ساتھ اُس پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ بے حیا ہیں۔

انہیں اس کی کچھ پروا نہیں ہے کہ جن لوگوں کو اس شخص کی اصلی پوزیشن معلوم ہے وہ ان کی اس کاریگری کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ ان کی نگاہ میں بس یہ کامیابی کافی ہے کہ کچھ ناواقف لوگوں کو وہ غلط فہمی میں مبتلا کر دیں۔ تیسرے یہ کہ وہ خدا کے خوف اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے بالکل فارغ ہیں۔ ان کے لئے جو کچھ ہے بس پبلک ہے جسے دھوکا دے کر اگر وہ اپنا کام نکال لے گئے تو گویا انہیں فلاح حاصل ہو گئی۔ اوپر کوئی عالم الغیب اگر جانتا ہے کہ انہوں نے کن افترا پردازیوں سے اپنا کام نکالا ہے تو جانا کرے۔ یہ نامردی اور بے حیائی اور یہ ناخدا ترسی جن لوگوں کے طرزِ عمل میں صاف جھلک رہی ہے۔ ان کو اپنا مدِ مقابل بنانے کے لئے ہم کسی طرح تیار نہیں ہیں۔ وہ اپنی ساری عمر بھی اگر ہم پر حملہ کرنے میں کھپا دیں تو شوق سے کھپاتے رہیں۔ ہم کبھی ان کا جواب نہ دیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قومی مسائل ہوں یا علمی مسائل، ان میں اگر آدمیت اور معقولیت کے ساتھ گفتگو کی جائے تو دلیل کا جواب دلیل ہی سے دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے مباحثے مفید و نتیجہ خیز بھی ہوتے ہیں اور دلچسپ بھی۔ ان میں ہم احقاقِ حق اور افہام و تفہیم کے لئے بھی حصہ لینے کے لئے تیار ہیں اور طلبِ علم اور طلبِ حق کے لئے بھی ہمیں اپنی ہی بات منوانے پر اصرار نہیں۔ دوسرے کی بات معقول و مدلل ہو تو ہم کھلے دل سے اس کو مان لیں گے۔ مگر جو لوگ دلیل کے کم اور گالی سے زیادہ کام لیں، جو زبان کھولتے ہی پہلے آدمی کی عزت پر حملہ کریں، جن کی تقریر کا اصل مدعا آدمی کو بدنیت اور بے ایمان ثابت کرنا ہو اور جنہیں کوئی ذلیل سے ذلیل تہمت تراشنے میں بھی تامل نہ ہو، ان کو کسی علمی یا قومی مسئلے میں بحث کا مخاطب بنانا کسی شریف اور معقول

آدمی کے لئے تو ممکن نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی باتوں کا جواب دینے کی فرمائش جو لوگ ہم سے کرتے ہیں اُن کی اِس فرمائش سے ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو ہمیں بھی اسی قماش کا آدمی سمجھتے ہیں اور یہ ہماری توہین ہے یا خود شرافت اور رذالت کا فرق محسوس نہیں کرتے اور یہ اُن کی اپنی توہین ہے۔

(از ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بحوالہ ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۲ء)

(۳) "حسبنا کتاب اللہ" کہنے والے کافر!

(نومبر ۱۹۵۲ء)

جماعتِ اسلامی کے ایک ذمہ دار رکن محترم امین احسن اصلاحی صاحب نے حسب ذیل فتویٰ صادر فرمایا ہے۔

بعض لوگ اسلامی شریعت کے اختلافات کا حوالہ دیکر مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اس ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا تو کوئی امکان نہیں ہے، البتہ قرآن کے اصولوں پر اس ملک میں حکومت قائم کرو۔ اگر یہ مشورہ دینے والوں کا مطلب یہ ہے کہ شریعت صرف اتنی ہی ہے جتنی قرآن میں ہے، باقی اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ شریعت نہیں ہے تو یہ صریح کفر ہے اور بالکل اسی طرح کا کفر ہے جس طرح کا کفر قادیانیوں کا ہے، بلکہ کچھ اس سے بھی سخت اور شدید ہے۔ قادیانیوں نے رسول اللہ کی خاتمیت کا انکار کیا ہے اور یہ رسول اللہ کے شارع اور واجب الاطاعت اور واجب الاتباع ہونے کے منکر ہیں۔ اگر یہ عقیدہ رکھنے والے کچھ افراد مسلمانوں کے اندر موجود ہیں۔ تو ان پر یہ حقیقت واضح رہنی چاہیئے کہ ایسے افراد کے لئے امتِ مسلمہ کے اندر کوئی جگہ نہیں ہے۔

(روزنامہ تسنیم لاہور صہ ۱۵،۲ اگست ۱۹۵۲ء)

(۴) ایک اور نمونہ

(نومبر سنہ۱۹۵۲ء)

اسلامی جماعت کے اخبار تسنیم (لاہور) کے استقلال نمبر میں امین احسن صاحب اصلاحی کا ایک مضمون شایع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "کون سی شریعت" جس میں زبان کا انداز اس قسم کا ہے۔

اس کے اندر کچھ لوگ ایسے ہیں جو ہمیشہ سے ذہنی اور قلمی قحبہ گری کے پیشہ میں مبتلا رہے ہیں اسی طرح کے ذہنی عصمت فروشوں کی ایک ٹولی بھی ہمارے اندر پہلے سے موجود تھی۔

جب ملک میں شریعت کا نظام نافذ ہوگا اور زمامِ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آئے گی تو یہ زبان (جس کا نمونہ اوپر دیا گیا ہے) پاکستان کی سرکاری زبان قرار دی جائے گی۔

بابِ یازدہم

مُتَفَرِّقَات

(۱) مُسلمانانِ ہندوستان

اُن کے ساتھ شادی بیاہ جائز نہیں

(اگست ۱۹۵۱ء)

آج ہندوستان کے مسلمانوں کی جو حالت ہو چکی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان کے لئے وہاں زندگی حرام کر دی گئی ہے اور باہر نکلنے کی راہیں مسدود ہیں۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ ہمارا ان کے لئے شمشیر بکف اٹھ کھڑے ہونا تو ایک طرف، ان کے لئے دعائے خیر تک بھی ہماری زبانوں پر نہیں آتی حتّٰی کہ اسلامی جماعت کی بارگاہِ امارت سے تو ان سوختہ سامانوں کے حق میں یہ فتویٰ بھی صادر ہو چکا ہے کہ انکے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات بھی ناجائز ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب کے اس سوال کے جواب میں کہ

> موجودہ حالات کے پیشِ نظر کوئی پاکستانی (مہاجر یا اصلی باشندہ) ہندوستانی مسلمان لڑکی سے شادی کر سکتا ہے یا نہیں؟ کرنے کی صورت میں تعلقات جائز سمجھے جائیں گے یا ناجائز؟

حضرت امیر جماعت ایدہ اللہ بنصرہ نے اپنی مسندِ رشادت سے بیک جنبشِ قلم فیصلہ صادر فرما دیا کہ :-

نکاح کے بارے میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہجرت سے نکاح آپ ہی آپ تو ٹوٹ نہیں سکتا، لیکن زوجین میں سے ایک دارالاسلام میں ہجرت کر آیا ہو اور دوسرا ہجرت پر تیار نہ ہو تو عدالت میں اس بنیاد پر درخواست دی جاسکتی ہے اور ایسے زوجین کا نکاح فسخ کیا جاسکتا ہے۔ آئندہ شادی بیاہ کا تعلق پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان نہ ہونا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن جون ۱۹۵۱ء صہ ۹۱)

یعنی یہ حضرات جو تمام تحریک پاکستان کے دوران میں پاکستان کی مخالفت کرتے رہے اور قائدین تحریک کو گالیاں دیتے رہے، وہ تو آج اس قابل ہیں کہ حکومت پاکستان کی مسندیں ان کے حوالے کر دی جائیں اور جن مسلمانوں کے صدقے پاکستان وجود میں آیا ہے جو ابھی تک وہاں کے ہندوؤں کے مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں جن پر گوشۂ عافیت تنگ ہو چکا ہے ان سے پاکستانی مسلمانوں کا رشتہ بیاہ بھی ناجائز قرار پا گیا۔ ہم تجردِ جہالت کے ان برخود غلط ائمہ سے (جنہیں دعویٰ یہ ہے کہ وہ خاص مزاج شناس رسالتمآب واقع ہوئے ہیں اور جن کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ہجرت کسے کہتے ہیں اور اس کے احوال و ظروف کیا ہوتے ہیں) اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت ہندوستان کا مسلمان سخت ناتواں اور بے چارہ ہے اس لئے تمہارے ستم دستاں کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن ڈرو اس وقت سے جب اس کمزور و ناتواں مسلمان کا ہاتھ ہوگا اور تمہارا گریبان اور کوئی پوچھنے والا پوچھے گا کہ ـــــ بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۹/۸ ـــــ بالآخر کس جرم کی پاداش میں انہیں اس طرح

قتل کیا گیا تھا؟ سوچو کر اس وقت تمہارا کیا جواب ہو گا؟ لیکن سوچے تو وہ جسے اس امر کا یقین ہو کر ایک دن کسی پوچھنے والے کے سامنے جانا ہے!

بظاہر یہ سمجھنا مشکل ہو گا کہ مودودی صاحب کے اس فتوے کا محرک جذبہ کیا ہے۔ لیکن جب آپ یہ دیکھیں گے کہ ان کی تحریک جس تحریک (مرزائیت) کے نقش قدم پر جارہی ہے، اس نے شادی بیاہ کے معاملہ میں کس طرح مسلمانوں کا بائیکاٹ کیا تھا، یہ بات سمجھ میں آجائے گی۔ اسلامی جماعت نے پہلے "نسلی مسلمانوں" اور "اصلی مسلمانوں" (یعنی جماعتِ اسلامی کے ممبروں اور غیر ممبروں) میں وہی تخصیص پیدا کی تھی جو اس سے پہلے مرزائیوں نے اپنوں اور غیر مرزائیوں میں پیدا کی تھی۔ آج کل چونکہ (مرزائیوں کی طرح) اسلامی جماعت والوں کے سیاسی مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ پاکستانی مسلمانوں کے خلاف کھلا زہر نہ اگلا جائے۔ اس لئے یہ کچھ وقت کے لئے ان کے ناوکِ ستم سے مامون ہیں (اگرچہ دشنۂ پنہاں کی زد سے محفوظ نہیں) لیکن ہندی مسلمان چونکہ بے بس ہیں اور اُن سے اِن کے مفاد وابستہ نہیں، اس لئے ان سے شادی بیاہ کے تعلقات ناجائز قرار دیئے گئے ہیں۔ ان حضرات کو ذرا برسرِ اقتدار آنے دیجئے، پھر پاکستان میں بھی وہی نسلی اور اصلی مسلمان کی تفریق شروع ہو جائے گی۔ دراصل مذہبی فرقوں کے وجود کا راز ہی اس میں ہوتا ہے کہ اپنے فرقے کے لوگوں کے اندر عصبیت پیدا کی جائے اور اپنے سے باہر والوں کو غیر قرار دے کر اُن کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارے جائیں۔

چونکہ اس جماعت کے اغراض ہی معاشی اور سیاسی ہیں، اس لئے ان کا مسلک سیاسی مصالح کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق نسلی اور اصلی تفریق کا سوال پیش پیش تھا۔ تقسیم کے بعد جب

حکومت کی کرسیوں کا تصور انہیں بے چین کرنے لگا تو جہاں تک پاکستان کے مسلمانوں کا تعلق تھا، یہ تفریق سمٹ کر پیچھے چلی گئی۔ اب پاکستان کے مسلمان ایسے سچے اور پکے مسلمان بن گئے کہ انہوں نے قرار دادِ مقاصد پاس کرا کر مملکت کو بھی مسلمان کر دیا تاکہ صالحین کی یہ جماعت اس "اسلامی مملکت" کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ اب وہی جذبۂ نفرت ہندوستان کے مسلمانوں کے خلاف ابھرا ہے لیکن عین اس وقت جب اس جماعت کی پاکستانی شاخ کے امیر ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق یہ کچھ ارشاد فرما رہے تھے۔ اس کی ہندوستانی شاخ کے امیر (ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی) اپنی رامپور کی تقریر میں یہ فرما رہے تھے کہ

> اسلام جیسا کہ میں پہلے تشریح کر چکا ہوں، مسلمانوں کا کوئی مخصوص مذہب نہیں بلکہ وہ آپ کا بھی ایسا ہی ہے جیسا مسلمانوں کا۔ اگر مسلمان اس کو اپنا مخصوص مذہب سمجھتے ہیں تو یہ ان کی غلطی ہے۔

یعنی اِدھر یہ شدّت اور غُلُوْ ہے کہ نسلی مسلمان، مسلمان ہی نہیں اور ہندی مسلمان کے ساتھ شادی بیاہ تک بھی جائز نہیں اور اُدھر یہ مداہنت کہ اسلام ایک برہمو سماجی یا کبیر پنتھی قسم کا مسلک ہے جو ہندوؤں کا بھی ایسا ہی ہے جیسا مسلمانوں کا۔ اب اگر آپ پاکستانی شاخ سے اس کے متعلق پوچھیں گے تو وہ صاف کہہ دے گی کہ ہندوستانی شاخ سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں جس طرح لاہوری میرزائی کہہ دیا کرتے ہیں کہ قادیانی میرزائیوں سے ہمارا کچھ تعلق نہیں، حالانکہ اصل میں دونوں ایک ہیں۔" یہ ہے اسلامی جماعت"۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں — کہ درویشی بھی عیّاری ہے سلطانی بھی عیّاری

(۲) اسلاف کی عظمت

(۱) حضرت علیؓ

(دسمبر ۱۹۵۰ء)

تاریخ اور اسلاف کے بارے میں طلوعِ اسلام کا مسلک قارئینِ طلوعِ اسلام کے سامنے ہے۔ بزرگانِ اُمّت میں سے جب کسی کے متعلق تاریخ کوئی ایسی بات کہتی ہے جو اُن کے شایانِ شان نہ ہو تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ تاریخ کی غلطی ہے۔ اُن بزرگوں کا مقام اس سے بلند تھا کہ وہ دیدہ و دانستہ اس قسم کی بات کرتے لیکن مولوی صاحبان یہ کہتے ہیں کہ اُن بزرگوں کے متعلق جو کچھ تاریخ میں مذکور ہے وہ حقیقتِ ثابتہ ہے۔ اب اگر تمہیں ان کے کسی عمل اور قرآن کے کسی حکم میں تضاد نظر آتا ہے تو تم یوں سمجھو کہ تم نے قرآن کو صحیح نہیں سمجھا قرآن کا صحیح منشا یہی تھا جو ان بزرگوں کے عمل سے ظاہر ہے۔ تمہیں اپنے فہمِ قرآن کو اُن بزرگوں کے اعمال کے مطابق بدلنا ہوگا کیونکہ وہ تم سے زیادہ قرآن سمجھتے تھے لیکن اب دیکھئے کہ خود مولوی صاحبان کا اس باب میں کیا مسلک ہے۔

مودودی صاحب نے ایک اصول پیش کیا ہے کہ جو شخص کسی منصب کے لئے امیدوار ہو اُسے اُس منصب سے محروم کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق کسی منصب کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا قرآن کے بھی خلاف ہے اور احادیث کے بھی۔ کسی

حضرت علیؓ کے متعلق

شخص نے ان پر اعتراض کیا کہ آپ اس مسلک کو خدا اور رسولؐ کے حکم کے خلاف قرار دیتے ہیں مگر حضرت علیؓ نے اپنے آپ کو خلافت کے لئے خود بطور امیدوار پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں:-

آخری فیصلہ کُن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ یا بزرگانِ سلف میں سے
کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اُس کے رسول کے صاف صاف ارشادات
دوسری طرف تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ خدا اور رسول کے فرمان
کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں جس کا جو عمل بھی
فرمانِ خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت، ان بزرگوں کی خوبیاں
اور خدمات تو اتنی زیادہ تھیں کہ اُن کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی مگر ہم سے زیادہ
بدقسمت کون ہوگا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن
چن کر اپنی زندگی میں جمع کرلیں۔

یعنی مودودی صاحب کے بیان کے مطابق حضرت علیؓ قرآن اور رسول صلعم کے فرمان کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ قرآن اور احادیث کا صحیح منشا مودودی صاحب سمجھتے ہیں اور چونکہ حضرت علیؓ کا یہ عمل اُس منشا کے مطابق نہیں جو مودودی صاحب سمجھتے ہیں اس لئے حضرت علیؓ سے اس باب میں لغزش ہوئی۔ لہٰذا اُن کا یہ عمل مودودی صاحب کے لئے حجت نہیں۔

یعنی دوسروں کے لئے تو یہ ارشاد ہوتا ہے کہ جب کبھی ایسا ہو کہ کسی بزرگ کا کوئی عمل تمہارے فہمِ قرآن کے خلاف جائے، تو اپنے فہمِ قرآن کو اُن کے عمل کے مطابق ڈھالو کیونکہ وہ قرآنِ کریم کو تم سے بہتر سمجھتے تھے۔ لیکن جب کسی بزرگ کا کوئی عمل مودودی صاحب کے خلاف جائے تو مودودی صاحب کا فہم ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ ان بزرگوں کے عمل کو لغزش قرار دیا جائے گا۔ دوسروں کے لئے وہ معیار اور اپنے لئے یہ معیار۔ لیکن ٹھیک ہے امارت اپنی امتیازی شان رکھتی ہے۔

---

(۲) حضرت عائشہؓ

(ترجمان القرآن)

آئینِ پاکستان کے ضمن میں مودودی صاحب نے فتویٰ دیا کہ عورتوں کو امورِ مملکت میں حصّہ لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس پر کسی نے اعتراض کر دیا کہ جب حضرت عائشہؓ نے حضرت عثمان کے قتل کے سلسلہ میں ایک تحریک اٹھائی تھی اور خود میدانِ جنگ میں تشریف لے آئی تھیں، تو عورتوں کا سیاست میں حصّہ لینا کس طرح ناجائز ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں مودودی صاحب کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے۔

سیاست و ملک داری میں عورت کے دخل کو جائز ٹھہرانے والے اگر دلیل رکھتے ہیں تو وہ بس یہ کہ حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کے خون کا دعویٰ لے کر اٹھیں اور حضرت علیؓ کے خلاف جنگِ جمل میں نبرد آزما ہوئیں۔ مگر اوّل تو یہ دلیل اصولاً ہی غلط ہے۔ اس لئے کہ جس مسئلہ میں اللہ اور اس کے رسول کی واضح ہدایت موجود ہو اُس میں کسی صحابی کا کوئی انفرادی فعل جو اُس ہدایت کے خلاف نظر آتا ہو، ہرگز حجت نہیں بن سکتا۔ صحابہ کی پاکیزہ زندگیاں بلاشبہ ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ہیں مگر اس غرض کے لئے کہ ہم انکی روشنی میں اللہ اور رسول کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں۔ نہ اس غرض کے لئے کہ ہم اللہ اور رسول کی ہدایت چھوڑ کر ان میں سے کسی کی انفرادی لغزشوں کا اتّباع کریں۔ پھر جس فعل کو اُسی زمانہ میں جلیل القدر صحابہ نے غلط قرار دیا تھا اور جس پر بعد میں خود اُم المومنینؓ بھی نادم ہوئیں اُسے آخر کس طرح اسلام میں ایک نئی بدعت کا آغاز کرنے کے لئے دلیل قرار دیا جا سکتا ہے؟

حضرت عائشہؓ کے اِس اقدام کی اطلاع پاتے ہی اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سلمہ نے اُن کو جو خط لکھا تھا وہ پورے کا پورا ابن قتیبہ نے الامامۃ والسیاسۃ اور ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں نقل کیا ہے۔ اسے ملاحظہ فرمایئے کتنے پر زور الفاظ میں وہ فرماتی ہیں کہ آپ کے دامن کو قرآن نے سمیٹ دیا ہے۔ آپ اسے پھیلایئے نہیں اور کیا آپ کو یاد نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو دین میں افراط برتنے سے روکا ہے" اور یہ کہ آپ رسول اللہ کو کیا جواب دیتیں اگر وہ آپ کو اس طرح کسی صحرا میں ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ کی طرف اونٹ دوڑاتے ہوئے دیکھ لیتے؟"

پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس قول کو یاد کیجئے کہ "عائشہ کے لئے اُن کا گھر اُن کے ہودے سے بہتر ہے"

اور حضرت ابوبکرہؓ کا یہ قول بخاری میں ملاحظہ فرمالیجئے کہ میں جنگِ جمل کے فتنے میں مبتلا ہونے سے صرف اس لئے بچ گیا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد آگیا کہ "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کر دیئے ہوں"

حضرت علیؓ سے بڑھ کر اُس زمانے میں کون شریعت کا جاننے والا[1] تھا۔ انہوں نے صاف الفاظ میں حضرت عائشہؓ کو لکھا کہ آپ کا یہ اقدام حدودِ شریعت سے متجاوز ہے۔

[1] ابھی ابھی آپ (پچھلے صفحات میں) دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت علیؓ کا ایک فیصلہ مودودی صاحب کے منشاء کیخلاف جاتا تھا تو انہوں نے حضرت علی کے متعلق کیا کچھ کہہ دیا تھا اور اب چونکہ حضرت علیؓ کا اقدام مودودی صاحب کے حق میں جاتا ہے اس لئے انہیں سب سے زیادہ شریعت کا جاننے والا قرار دے دیا جاتا ہے۔

اور حضرت عائشہؓ اپنی کمال درجے کی ذہانت وفقاہت کے باوجود اس کے جواب میں کوئی دلیل نہ پیش کرسکیں حضرت علیؓ کے الفاظ یہ تھے "بلاشبہ آپ اللہ اور اس کے رسول ہی کی خاطر غضبناک ہوکر نکلی ہیں مگر آپ ایک ایسے کام کے پیچھے پڑی ہیں جس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ڈالی گئی عورتوں کو آخر جنگ اور اصلاح بین الناس سے کیا تعلق؟ آپ عثمانؓ کے خون کا دعویٰ لیکر اٹھی ہیں۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جس شخص نے آپ کو اس بلا میں ڈالا اور اس معصیت پر آمادہ کیا وہ آپ کے حق میں عثمان کے قاتلوں سے زیادہ گنہگار ہے"۔

دیکھئے اس خط میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ حضرت عائشہؓ کے فعل کو صریحاً خلافِ شرع قرار دے رہے ہیں مگر حضرت عائشہؓ اس کا کوئی جواب نہ دے سکیں کہ جل الامر عن العتاب۔ معاملہ اب اس حد سے گزر چکا ہے کہ عتاب وملامت سے کام چل سکے۔

پھر جنگِ جمل کے خاتمے پر جب حضرت علیؓ ام المومنینؓ سے ملنے تشریف لے گئے تو انہوں نے کہا۔ يَا صَاحِبَةَ الْهَوْدَجِ قَدْ أَمَرَكِ اللَّهُ أَنْ تَقْعُدِي فِي بَيْتِكِ ثُمَّ خَرَجْتِ تُقَاتِلِينَ۔؟ اے ہودج والی! اللہ نے آپ کو گھر میں بیٹھنے کا حکم دیا تھا اور آپ لڑنے کے لئے نکل پڑیں مگر اُس وقت بھی حضرت عائشہؓ یہ نہ کہہ سکیں کہ اللہ نے ہم عورتوں کو گھر میں بیٹھنے کا حکم نہیں دیا ہے اور ہمیں سیاست اور جنگ میں حصہ لینے کا حق ہے۔

(ترجمان القرآن بابت ستمبر ۵۲ء)

ہم اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کی نزاع میں حضرت عائشہؓ کا اقدام کیسا تھا؟ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ اُن کے نزدیک دین اُن کی اپنی رائے کا نام ہے (اس لئے کہ یہ مزاج شناس رسول ہیں) اسلاف (حتیٰ کہ صحابہؓ) میں سے جس جس کا کوئی قول یا عمل ان کی رائے کے مطابق

ہوتا ہے، اُسے برسرِ حق قرار دیدیتے ہیں اور جس کا کوئی فیصلہ یا عمل ان کی رائے کے خلاف جاتا ہے، وہ ان کے نزدیک غلط روش کا پیرو ہوتا ہے۔ پہلے مسئلہ (منصب کی امیدواری) میں حضرت علیؓ کا اقدام ان کی رائے کے خلاف تھا تو حضرت علیؓ غلط روش پر چلنے والے قرار پاگئے۔ اور اب اس دوسرے مسئلہ میں حضرت عائشہؓ کا اقدام ان کی رائے کے خلاف تھا تو حضرت علیؓ برسرِحق اور حضرت عائشہؓ غلطی پر قرار دیدی گئیں۔

یہ ہے امارت کا مقام!

(۴) وہی مرجبی وہی عنتری

(اکتوبر ۱۹۵۲ء)

قرآنِ کریم میں ہے کہ جب حضرات انبیاء کرامؑ اپنی قوم سے کہتے کہ جو کچھ ان کے خدا نے اُن کی طرف نازل کیا ہے اُسے ضابطۂ زندگی بنائیں تو وہ اس کے جواب میں کہتے کہ ہمارے نزدیک صحیح مسلک وہ ہے جو ہمارے آبا و اجداد سے متوارث چلا آرہا ہے ہم اسے چھوڑکر تمہاری بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔ وہ لوگ رسول کو تو یہ جواب دیتے اور دوسرے لوگوں کو رسول کی بات نہ سُننے کے لئے کہتے کہ اس کے پاس نہ جانا یہ تو رجُلٌ مَّسْحُوْرٌ (یعنی مخبوط الحواس) ہے۔ قرآن نے اُن کی اِس روش کا بار بار ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ غور کرو کہ کسی مسلک کے سچے یا جھوٹے ہونے کی یہی دلیل ہو سکتی ہے جو وہ لوگ پیش کیا کرتے تھے؟ قرآن نے حضرت نوحؑ سے یہی کہا اور رسول اللہ صلعم تک تمام اقوامِ سابقہ کی مذکورہ صدر روش کا ذکر کیا ہے لیکن حقیقت

یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت سے لیکر آج تک بھی رہی کچھ ہوتا چلا آرہا ہے جو اس سے پہلے ہوتا تھا آج بھی جب کسی سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن میں یہ حکم دیا ہے تو اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ کیا جو کچھ تیرہ سو برس سے ہوتا چلا آیا ہے وہ سب غلط ہے۔ اور دوسری سے یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کی طرف بلانے والے سب مخبوط الحواس ہیں۔

مخبوط الحواس

طلوعِ اسلام نے اپنی سابقہ اشاعت میں قرآنی دلائل سے یہ ثابت کیا کہ یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے محروم نہیں ہو سکتا۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب کی طرف سے جو جواب شائع ہوا وہ ملاحظہ فرمائیے:۔

میں نے پوتے کی وراثت کے معاملہ میں تمام دلائل بیان کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ صرف اختصار کے ساتھ یہ بتایا تھا کہ اس مسئلے میں جذبات کی بناء پر فیصلے کرنے کی بجائے اگر معقول اصولوں کی بناء پر غور کیا جائے تو جو کچھ فقہا نے بالاجماع رائے قدیم کی ہے، وہی سراسر معقول معلوم ہوتی ہے۔ میرے بیان کردہ دلائل پر مزید بہت سے دلائل کا اضافہ کیا جا سکتا ہے مگر خصوصیت کے ساتھ جو بات اس معاملہ میں سب سے زیادہ وزنی ہے وہ یہ ہے کہ سلف سے لیکر خلف تک تمام امت کے اہلِ علم اس پر متفق رہے ہیں۔ ایسے متفق علیہ مسائل کا متفق علیہ ہونا ہی بجائے خود اپنے اندر اتنا وزن رکھتا ہے کہ کوئی معقول آدمی ان سے اختلاف کی اُس وقت تک جرأت نہیں کر سکتا جب تک کہ اُس کے پاس دلائل کی کوئی بڑی غیر معمولی طاقت نہ ہو۔ اور یہاں حال یہ ہے کہ جن لوگوں نے اختلاف کی جرأت کی ہے، ایک طرف تو ان کے دلائل ایسے قوی نہیں ہیں کہ ان کی بنا پر امت کے کسی متفق علیہ مسئلہ میں تغیر کیا جا سکے اور دوسری جگہ وہ قریب قریب سب کے سب کچھ ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگ ہیں جو ہر دینی مسئلہ میں

ہمیشہ ایک نرالی اُپج کی بات نکالا کرتے ہیں۔ ان کی بات اگر مانی جائے تو یہی کہنا پڑے گا کہ اسی ایک مسئلہ میں نہیں بلکہ پورے دین کے سمجھنے میں پہلی صدی سے لیکر آج تک ساری امت غلطی کرتی رہی ہے اور دین کو اگر سمجھا ہے تو صرف اس دور کے تین چار آدمیوں نے سمجھا ہے۔ اس طرح کے خبطیوں کی بات آخر کس التفات کی مستحق ہو سکتی ہے۔؟ (سید ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن بابت جون جولائی ۱۹۵۰ء)

دیکھئے اس جواب میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ قرآن کی رو سے فلاں بات صحیح ہے اور فلاں غلط۔ کہا وہی گیا ہے جو اس سے پیشتر کہا جاتا رہا ہے یعنی یہ کہ صحیح وہ ہے جو ہمارے آبا و اجداد کے وقت سے ہوتا چلا آرہا ہے اور دعیٔ خداوندی کی طرف بلانے والے مخبوط الحواس ہیں۔

ستیزہ گاہ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فگن نئے — وہی فطرتِ اسداللّٰہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

—————(०)—————

۵ مُلّا کا اسلام

(اصلاحی صاحب اور مودودی صاحب کے ارشادات)

(جولائی ۱۹۵۳ء)

ماہوار مجلہ چراغ راہ کی اشاعت بابت مئی ۱۹۵۳ء کے پہلے صفحہ پر امین احسن اصلاحی صاحب کا ایک شذرہ شائع ہوا ہے۔ اصلاحی صاحب کے متعلق آپ شاید اتنا ہی جانتے ہوں کہ وہ جماعتِ اسلامی کے اساطین میں سے ہیں لیکن ان کا تفصیلی تعارف ماہر القادری صاحب نے ان الفاظ میں کرایا ہے۔

عالم، بلند نظر اور متبحر عالم جس کی نگاہ خاک کے ذروں کا بھی جائزہ لیتی ہے اور مہ و انجم

کی گندگاہوں کا بھی سفر کرتی ہے۔ دس بیس نہیں ہزاروں راتیں صرف قرآن کریم کے مطالعہ میں بسر کی ہیں جن کی ذات قرآنی علوم کے لئے قابلِ وثوق سند ہے۔ قرآن کا مفسّر اور حدیث و فقہ میں جس کی ژرف نگاہی مسلّم۔ (فاران جون ۱۹۵۳ء)

انہیں امین احسن اصلاحی صاحب نے چراغِ راہ میں تحریر فرمایا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا ہے کہ ہم ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی حکومت کی طرح ایک حکومت قائم کر دیں۔ نہ بندوں کو اس بات کی طاقت حاصل ہے نہ خدا نے اس کی تکلیف دی ہے۔

آپ نے غور کیا کہ اصلاحی صاحب نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ —— بندوں کو اس کی طاقت حاصل نہیں کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمرؓ کی حکومت کی طرح حکومت قائم کر دیں۔ گویا حضرت صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ بندے نہیں تھے، بندوں سے اوپر کچھ اور تھے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ خود نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا بھی بندہ ہی قرار دیتا ہے۔ اور ہر انسان اس شہادت کے بعد مسلمان ہو سکتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمدؐ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں (اشھدان لا الٰہ الا اللہ واشھدان محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ) یعنی اصلاحی صاحب کے ارشاد کے مطابق حضرت صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ رسول اللہ سے بھی (معاذ اللہ) اونچے تھے۔

اور پھر یہ ارشاد بھی ملاحظہ فرمایئے کہ خدا نے بھی مومنین کو یہ تکلیف نہیں دی کہ وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسی حکومت قائم کریں۔

اسی قسم کے وہ احبار و رہبان ہیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے کہ کیا تم نے

ان لوگوں سے کہا تھا کہ وہ تمہیں خدا کے بندے سے آگے کچھ اور سمجھیں تو وہ جواب میں کہیں گے کہ حاشا وکلا ہمیں اس کی جرأت کس طرح سے کر سکتا تھا!

یہ تو ہیں اصلاحی صاحب جن کے نزدیک صحابۂ کبار بندے نہیں، بندے سے آگے کچھ اور ہیں لیکن دوسری طرف اسی جماعتِ اسلامی کے امیر (مودودی صاحب) ان صحابہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ:۔

آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابۂ اکرام یا بزرگانِ سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسول کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف، تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ خدا اور رسول کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں۔ جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ اُن بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ ہیں کہ اُن کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کرلیں۔ (ملاحظہ ہو عنوان "اسلاف کی عظمت")

یہ کچھ مودودی صاحب نے حضرت علیؓ کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔ اسی قسم کے خیالات انہوں نے حضرت عائشہؓ کے متعلق بھی تحریر کئے تھے۔ (ایضاً)۔ یعنی اس جماعت کے ایک رکنِ اعلیٰ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ صحابۂ کبار بندے نہیں تھے، بندوں سے آگے کچھ اور تھے اور خدا نے بندوں کو قطعاً اس کا مکلف نہیں ٹھہرایا کہ وہ ان جیسے بنیں اور ان جیسی حکومت قائم کریں۔ اور اسی جماعت کے امیر کا یہ ارشاد ہے کہ اولوالعزم صحابہ، خدا ور رسول کے فیصلوں کے خلاف بھی کام کرتے تھے اور اُن سے لغزشیں بھی سرزد ہوتی تھیں

جن کی ہمیں تقلید نہیں کرنی چاہیئے۔

اور جماعتِ اسلامی کے عقیدت مندوں کا حلقہ اصلاحی صاحب کو بھی قرآن کا بے بدل عالم قرار دیتا ہے اور امیر جماعتِ اسلامی کے لئے بھی یہ لکھتا ہے کہ ؛

کوئی شک نہیں کہ مودودی صاحب کی شخصیت امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے (فاران بابت جون ۱۹۵۳ء)

---

(۶) خدا یا شیطان

(اکتوبر ۱۹۵۰ء)

امیر جماعتِ اسلامی سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی نظر بندی سے رہائی کے بعد یہ لکھا ہے کہ اس میں حیرت کی بات نہیں تھی کہ ہمیں کیوں نظر بند کر لیا گیا۔ بلکہ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ آخر شیطان اتنی مدت تک ہم جیسے قصور واروں کو برداشت کیسے کرتا رہا۔

(ترجمان القرآن بابت جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۵۰ء)

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک اُن کی نظر بندی شیطان کی مصلحت کے ماتحت عمل میں آئی لیکن اسی ترجمان القرآن جون ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں نعیم صدیقی صاحب نے یہ لکھا ہے کہ "جب اللہ کے نزدیک ان حضرات کا جیل جانا تحریکِ اسلامی کی ترقی کے لئے ضروری قرار پایا تو یہ نظر بند کر دیئے گئے۔ اور جب تحریک ہی کا یہ اقتضا ہوا کہ انہیں باہر آنا چاہیئے تو جیل کے پھاٹک از خود کھل گئے" یعنی صدیقی صاحب کے نزدیک مودودی صاحب کا نظر بند ہونا اللہ تعالےٰ کے منشا کے عین مطابق تھا جس کی مشیّت نے تحریکِ اسلامی کی ترقی کے

لئے یہ صورت پیدا کی۔

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس باب میں مودودی صاحب اور صدیقی صاحب میں کون سچا ہے؟ یعنی مودودی صاحب کی نظر بندی شیطان کی مصلحت کے مطابق عمل میں آئی تھی۔ یا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے مطابق۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جماعتِ اسلامی کے نزدیک یہ نظر بندی اللہ کی مشیت کے مطابق تھی اور ان حضرات کا نظر بند رہنا تحریکِ اسلامی کی ترقی کے لئے تھا تو خدا کی اس مصلحت کے خلاف ان حضرات کی نظر بندی کے خلاف اس قدر شور کیوں مچایا جا رہا تھا؟ کیا جماعت اسلامی کا یہ تمام ہنگامہ مصلحتِ خداوندی کے خلاف نہیں تھا؟

غور فرمایا آپ نے کہ تقدیر میں جبر کا عقیدہ کس طرح انسان کو بری الذمہ قرار دے کر سارا الزام شیطان کے سر تھوپ دیتا ہے۔ اور یا اسے مصلحتِ خداوندی قرار دے کر انسان اللہ کا مقرب بن جاتا ہے۔ یہی تھی نفسِ انسانی کی وہ مصلحت کوشیاں جن کے ماتحت بنی اُمیہ نے جبر کا عقیدہ پھیلایا تھا۔

---

(۷) یوں بھی اور یوں بھی

(اکتوبر ۱۹۵۰ء)

رسالہ ترجمان القرآن بابت جولائی، اگست ستمبر ۱۹۵۰ء کے باب "رسائل و مسائل" میں ایک صاحب نے دو سوال پوچھے یعنی (۱) ہوائی جہاز میں سوار ہو کر بادلوں سے اوپر جا کر چاند دیکھنا اور (۲) لاؤڈ اسپیکر کے ساتھ امامتِ نماز کرانا کیسا ہے؟ رویتِ ہلال کے ضمن میں یہ چیز بھی درجِ رسالہ ہے کہ عید وغیرہ کی تقاریب کے لئے کسی بڑے ملک یا بڑے علم یا

پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک ہی تاریخ کا متعین کر دینا جائز ہے یا نہیں؟ بحث کا یہ حصہ اس وقت ہمارے تبصرہ سے خارج ہے) ترجمان القرآن نے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو جائز قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ آلہ تکبیرات صلوٰۃ کو زیادہ صحت کے ساتھ اور زیادہ بروقت بلند کرتا ہے۔ اس لئے اس کا استعمال جائز ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ

آخر اللہ کے پیدا کردہ حالات و ذرائع سے خود اللہ ہی کا نام بلند کرنے کا کام لینا جائز نہ ہوا تو کیا پھر انہیں شیطان کا حکم بلند کرنے کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے؟

یہ تو خوشی ہے لاؤڈ اسپیکر کے متعلق جس کے جواز کے حق میں خود ترجمان القرآن ہے۔ یعنی ترجمان القرآن کے نزدیک جہاں اللہ کے پیدا کردہ حالات و ذرائع موجود ہوں وہاں صرف فطری ذرائع پر انحصار نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ اللہ کا نام بلند کرنے کے لئے ان آلات سے بھی کام لینا چاہیئے۔

بدقسمتی سے رویت ہلال کے متعلق ترجمان القرآن کی رائے یہ ہے کہ جہاز پر سوار ہو کر بادلوں کے اوپر جا کر چاند دیکھنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ اس بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ:۔

کثرت سے مائیں اس کے حق میں ہیں کہ رویت ہلال کے بارے میں فطری ذرائع پر انحصار کرنا چاہیئے...... اور ہماری رائے میں نصوص کی رو سے دوسرا مسلک ہی قابل ترجیح ہے۔ شریعت نے لوگوں کو اس کا مکلف نہیں کیا کہ وہ ہزاروں فٹ کی بلندی پر جا کر چاند دیکھیں بلکہ انہیں یہ سیدھا سادہ فطری طریق بتایا کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرلو۔

آپ نے غور فرمایا کہ مولوی صاحبان کی شریعت کن بنیادوں پر قائم ہوتی ہے؟ یعنی جب ان کے نزدیک لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو جائز قرار دینا ہو کیونکہ لاؤڈ اسپیکر خود ان کے اپنے جلسوں

میں بھی استعمال ہو رہا ہے لہٰذا سے ناجائز قرار دینے سے خود اپنے آپ پر زد پڑتی ہے)
تو دلیل یہ پیش کر دی کہ محض فطرت کے سیدھے سادے ذرائع پر ہی انحصار کیوں کیا جائے
یہ آلات بھی تو خدا کے ہی پیدا کردہ ہیں اور جب چاند دیکھنے کا مسئلہ پیش ہو جس میں ان کی
رائے ہوائی جہاز کے خلاف ہے تو اس وقت یہ ارشاد فرمایا کہ اسلام فطرت کے سیدھے
سادے ذرائع پر انحصار رکھنا ہی سکھاتا ہے۔

یہ ہے وہ طریقہ جس کی رُو سے یہ حاملینِ شرعِ متین امت کے لئے وہ فتاویٰ دیتے
ہیں جن کے مطابق چلنے سے جنت ملتی ہے اور جن کے خلاف جانے سے انسان سیدھا
جہنم کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔
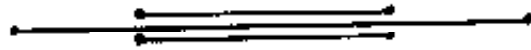
بابِ دوازدہم

نفسیاتی تجزیہ

مودودی صاحب کا نفسیاتی تجزیہ

(اُن کی خود نوشت سوانح حیات سے)

(اگست ۱۹۵۳ء)

کسی تحریک کا مطالعہ کرنے کے لئے اُس کے داعی کی نفسیات کا مطالعہ نہایت ضروری ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خود نبیٔ اکرمؐ کی زبان مبارک سے یہ کہلوا دیا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶) میں نے تمہارے اندر اپنی ساری عمر بسر کی ہے میں پیدائش سے کر اس دعوئے رسالت تک تمہارے پاس ہی رہا ہوں، کیا تم میری زندگی سے اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میری اس دعوت کے محرکات کیا ہیں؟ واضح رہے کہ اس مطالعہ سے مقصود کسی کی "پرائیویٹ زندگی" کے اندر جھانکنا نہیں ہوتا بلکہ اُن رجحانات و عواطف کا متعین کرنا ہوتا ہے جو اس کی تحریک کے ستون بنتے ہیں۔ اسلامی جماعت کی تحریک کے داعی سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی زندگی کے حالات پچھلے دنوں اس جماعت کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں بعض ٹکڑے ایسے ملتے ہیں جن سے ان کے نفسیاتی رجحانات کا صاف صاف پتا مل جاتا ہے اور جو یہ متعین کر دیتے ہیں کہ اس تحریک سے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) ان کا مقصد کیا ہے۔ مودودی صاحب اپنے بچپن کے حالات کے متعلق لکھتے ہیں کہ:-

مرکزِ نگاہ بننے کی ہوس

مجھے سب سے زیادہ لطف اُس وقت آتا تھا جب میں بیمار ہوتا تھا، جب مجھے کوئی چوٹ لگ جاتی تھی اور میرے والدین میرے لئے پریشان ہوتے تھے۔ اس لطف کی خاطر میں اپنے آپ کو کبھی جان بوجھ کر بھی خطرے میں ڈال دیتا تھا (چراغِ راہ جولائی ۱۹۵۳ء)

بن سطح بین حضرات کے نزدیک اس قسم کے واقعات محض بچوں کی باتیں ہوتے ہیں جن سے انسان دل بہلا سکتا ہے، وہ تو اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن جن حضرات کو علم النفس (PSYCHOLOGY) سے کچھ دلچسپی ہے وہ جانتے ہیں کہ بچپن کی یہی خصوصیات وہ بنیادیں ہوتی ہیں جن پر انسان کے کیریکٹر کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔ آپ علم تجزیہ نفس (PSYCHO ANALYSIS) کے ماہرین کی کتابوں میں دیکھئے یا اگر آپ کے قریب کوئی ایسے صاحب ہوں تو اُن سے پوچھئے کہ جس بچے میں وہ نفسیاتی رجحان موجود ہو جس کا ذکر مودودی صاحب نے کیا ہے اُس کی سیرت کی نمایاں خصوصیت کیا ہوا کرتی ہے۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ سائیکالوجی کی رو سے بچے میں اس رجحان کا نام (SELF-DISPLAY) ہوتا ہے اور اس رجحان والے انسان کی ہمیشہ خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی توجہات کا مرکز بنا رہے اور اپنے ہم عصروں میں نمایاں مقام کا مالک بن جائے۔ وہ جس طرح بچپن میں اپنے گھر والوں کی توجہات کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے جان بوجھ کر خطرہ مول لے لیتا ہے، اسی طرح بڑا ہو کر اپنے اس نفسیاتی تقاضے کی تسکین کے لئے ہر حربہ استعمال کر لیتا ہے۔ مودودی صاحب نے اپنے بچپن کے حالات کے متعلق ایک چیز اور بھی لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں

دوسروں کا حصہ لے لینے کی ہوس

میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا، میرے ایک بھائی مجھ سے تین چار برس بڑے تھے مجھے

کھانے کی جو چیز ملتی تھی اُسے میں فوراً کھالیتا تھا۔ مگر بھائی سنبھال کر کسی اچھے وقت پر کھانے کے لئے اٹھا رکھتے تھے۔ اسی طرح جو پیسے ملتے تھے میں اُن کو بھی فوراً خرچ کر ڈالتا تھا اور بھائی صاحب انہیں جمع کر کے کوئی اچھی چیز خرید لاتے تھے۔ بس یہ میرے اور اُن کے درمیان جھگڑے کی مستقل بنیاد تھی میں ہمیشہ اُن کے حصّہ میں سے اپنا حق وصول کرنے کی کوشش کرتا تھا اور وہ ہمیشہ تھوڑی دیر مقابلہ کرنے کے بعد کچھ نہ کچھ میرے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے اس طرح والدین کے حصّہ میں سے میں پچھتر فی صدی کا مالک ہوتا تھا۔ پچاس فی صدی اپنے حساب میں اور پچیس فی صدی بڑے بھائی کے حساب میں سے۔ (ایضاً)

اس کردار کے بچے کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ بڑا ہو کر کبھی اُس مقام سے مطمئن نہیں ہوتا جو اُسے معاشرہ میں اس کی ذاتی قابلیت کی بنا پر ملتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس کی کوشش کرتا ہے کہ جو بلند مقامات دوسروں کو حاصل ہیں وہ بھی اُس کے قبضے میں آجائیں۔

مودودی صاحب کے متعلّق چراغ راہ بابت جون ۱۹۵۳ء میں لکھا ہے کہ :۔

مولانا کا لکھنے پڑھنے میں بھی ایک خاص ذوق ہے۔ وہ ہر چیز اعلیٰ درجہ کی رکھتے ہیں، کاغذ، قلم، پنسل، فرنیچر، الماریاں، کتابیں غرضیکہ نفاست یہاں بھی پوری طرح موجود ہے۔ چنانچہ بعض دقیانوس قسم کے لوگ ان کی اس عادت کو غیر اسلامی سمجھتے ہیں اور ان کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ یہ علماء کی خصوصیات نہیں رکھتے۔

اعلیٰ درجہ کی چیزیں

نفاست پسندی اور حسنِ ذوق قابلِ ستایش جوہر ہیں لیکن نفاست اور شے ہے اور ہر چیز اعلیٰ درجہ کی رکھنا اور شے۔ نفسیاتی طور پر اس

کی تہ میں بھی وہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے جسے اوپر (SELF DISPLAY) کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے اور جس کا تقاضا اپنے آپ کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس رُجحان کا انسان کبھی غریبی میں گذارہ نہیں کر سکتا۔

یہ ہیں مودودی صاحب کے وہ نفسیاتی رُجحانات جن کا علم خود ان کی اپنی تحریروں سے ہوتا ہے۔ ان کے قیام حیدرآباد کے دوران میں جب نیشنلسٹ علما کا طبقہ متحدہ قومیت (نیشنلزم) کی تحریک کو آگے بڑھا رہا تھا، مودودی صاحب نے متحدہ قومیت کے خلاف لکھنا شروع کیا اور اس طرح انہیں سیاسی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہو گئی۔

مالی مشکلات

لیکن وہاں وہ مالی مشکلات سے بے حد پریشان تھے ترجمان القرآن کی اشاعت چھ سو کے قریب تھی جس میں سے تین سو ریاست خریدتی تھی اور تین سو عام خریدار۔ ریاست نے اپنی خریداری بند کر دی تو باقی تین سو خریدار رہ گئے جن کا مجموعی چندہ اٹھارہ سو روپیہ سالانہ ہوتا تھا۔ اس اٹھارہ سو میں سال بھر کے بارہ پرچے شائع کرنا ہی ناممکن تھا، چہ جائیکہ اس سے مودودی صاحب اپنے گذارہ کی صورت پیدا کر سکتے۔ ایک عطّار کی چھوٹی سی دکان میں مودودی صاحب کا کچھ حصہ تھا اور یہی کچھ ان کے معاش کا آسرا تھا لیکن اس کی آمدنی بہت قلیل تھی (یہ تمام باتیں خود مودودی صاحب اُس زمانے میں بیان فرمایا کرتے تھے ہمارے نزدیک غریب ہونا کوئی جرم نہیں لیکن ان کی زندگی کے جو حالات ان کی جماعت کے جرائد رسائل میں شائع ہوئے ہیں (خواہ وہ ان کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے ہوں یا دوسروں کی طرف سے) اُن میں اِن باتوں کا کوئی تذکرہ نہیں۔ ان معاشی مجبوریوں کی وجہ سے انہوں نے حیدرآباد کو چھوڑ کر شمالی ہند کا رُخ کیا۔ یہاں آکر وہ دارالاسلام (پٹھان کوٹ)

میں کس طرح پہنچے اور کس طرح وہاں سے نکلے، ہمیں ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں لیکن وہاں ان کے اندر جو تبدیلی واقع ہوئی اس کا بیان کرنا ضروری ہے۔ دارالاسلام پہنچ کر انہیں معاشی پریشانیوں کی طرف سے فراغت نصیب ہو گئی تو ان کا وہ جذبہ پھر ابھرا جس کا تقاضا اپنے لئے ایک نمایاں مقام حاصل کرنا تھا۔ اس وقت ان کی ظاہری ہیئت بالکل ایسی ہی تھی جیسی مسلم لیگ کے اکابر (مثلاً لیاقت علی خان مرحوم وغیرہ) کی تھی۔ سر پہ

ہیئت میں تبدیلی

انگریزی بال، ڈاڑھی بالکل صاف، سر سے پاؤں تک مولویت کا کوئی نشان تک بھی نہیں تھا۔ انہوں نے پہلے سر کے بالوں کو پٹھوں میں تبدیل کیا، ڈاڑھی بڑھائی۔ لبیں ترشوائیں اور اس کے بعد مسلم لیگ قیادت کے خلاف یہ آواز بلند کرنی شروع کی کہ یہ لوگ مغربی فیشن کے دلدادہ اور فرنگیانہ اسٹائل کے پرستار ہیں۔ اس لئے ان سے اسلام کی بہبودی کی توقع کرنا خیال خام ہے۔ اس آواز پر وہ لوگ ان کی طرف کھنچنے شروع ہو گئے جو سطحی مذہبیت کو سب سے بڑا تقویٰ اور خاص انداز کی شکل و شباہت کو جنت کی کنجی خیال کرتے ہیں۔ اس طرح اسلامی جماعت کی بنیاد پڑی اور مودودی صاحب نے اپنی مرکزی حیثیت کو بلند کرنے اور لیگ کی قیادت کو ذلیل کرنے کی مہم جاری کر دی۔ لیگ کی قیادت کی مخالفت ناممکن تھی جب تک خود پاکستان کے مطالبہ کی مخالفت نہ کی جاتی کیونکہ اس وقت جناح اور پاکستان لازم و ملزوم ہو چکے تھے۔ چنانچہ مودودی صاحب نے علانیہ لکھنا شروع کر دیا کہ :

پاکستان کے مطالبہ کی مخالفت

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہوں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔

اور یہ بھی کہ

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو۔

جب ان سے کہا جاتا کہ پاکستان کی سرزمین حاصل ہو جائے تو اس کے بعد کوشش کر لی جائے گی کہ اسے اسلامی مملکت بنا دیا جائے اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ:

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بناء پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا[1]

مودودی صاحب اور ان کی جماعت پاکستان کی مخالفت کے "جہادِ عظیم" میں مسلسل مصروف رہی لیکن جب ان کی مذموم کوششوں کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا تو یہ حضرات پاکستان میں آدھمکے اور ہندوستان کی طرف رخ نہیں کیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہندوستان میں مذہبیت کے نام پر اس تحریک کو چلا کر حکومت کی کرسیوں کا حاصل کرنا ناممکن تھا۔ نہ وہاں انہیں معاشی سہولتیں میسر آسکتی تھیں۔ اس کا تجربہ حیدرآباد میں انہیں ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس پاکستان کی زمین ان کے لئے بڑی سازگار ہو سکتی تھی۔ چنانچہ یہاں پہنچ کر انہوں نے اپنی قیادت کا علَم بلند کرنے کے لئے طرح طرح کی اسکیمیں بنانا شروع کیں۔

---

[1] مندرجہ بالا اقتباسات کے لئے دیکھئے ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۳۹ء مئی، جون، اگست اور دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء۔

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں مسلم لیگ کے حامیوں میں اکثریت ان کی تھی جن کی پوزیشن کا مدار ذاتی جوہروں سے زیادہ موروثی دولت پر تھا۔ ظاہر ہے کہ انقلاب کے بعد پہلے پہل اقتدار انہی کے ہاتھوں میں آنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جن حالات میں ہندوستان کی تقسیم ہوئی تھی،

حالات سے فائدہ اٹھالیا

وہ اچھی سے اچھی مستحکم حکومتوں میں تزلزل پیدا کر دینے کے لئے کافی تھی، چہ جائیکہ ایک ایسی حکومت جو ابھی وجود میں ہی نہیں آئی تھی۔ اس پیان لوگوں کی فرنگیانہ وضع قطع۔ مودودی صاحب نے ان تمام حالات سے فائدہ اٹھایا اور اپنی قیادت کو آگے بڑھانا شروع کیا جس کے بغیر ان کی سیرت کا نفسیاتی تقاضا کسی طرح پورا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ جس شخص کے نفسیاتی رجحانات یہ ہوں کہ وہ اپنے گردو پیش کے لوگوں میں مرکزِ توجہ بننے کے لئے اپنے آپ کو جان بوجھ کر خطرے میں ڈال دے۔ وہ اپنی قیادت قائم کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرے گا۔ اور جو شخص لڑ جھگڑ کر بھی ستر فیصدی حصہ پر قابض ہونے کا عادی ہو، وہ جمہوری نظامِ حکومت میں اپنی اکثریت قائم کرنے کے خیال کو کس طرح چھوڑ سکتا تھا؟ پھر جو شخص اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی چیزیں رکھنے کا شائق ہو اور اس کے پاس حصولِ معاش کا اور کوئی ذریعہ نہ ہو، وہ اس قسم کے ذرائعِ معاش کو کس طرح ترک کر سکتا تھا جس میں دھن بھی برسے اور لوگ ہاتھ بھی چومیں۔

مسلمانوں کے دل کی گہرائیوں میں مذہب سے محبت ہے۔ ان کا بیشتر حصہ مذہب کے نام پر بڑی سے بڑی قربانی کر دینے پر بلا تامل آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ مذہب کے ایک خاص تصور کو حقیقی اسلام سمجھتے ہیں۔ مودودی صاحب نے ان کے سامنے وہی اسلام پیش کیا۔ اس طرح سے یہ طبقہ نہایت نیک نیتی سے ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

یہ ہے وہ طاقت جس کی بنا پر مودودی صاحب اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین اور کم از کم پچھتر فیصدی حصہ حاصل کرنے کے جذبہ کی تشفی اور اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں خریدنے کے ذوق کی پرورش کا سامان فراہم کئے چلے جا رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کا یہ مخلص اور نیک نیت مذہب پرست طبقہ یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ اللہ کے راستے میں جہاد کر رہے ہیں۔

مولویوں کے اندر؟

مودودی صاحب کی ہوسِ انا الموجود لاغیری کی کیفیت یہ ہے کہ وہ صرف مغرب زدہ طبقہ کے مقابلہ میں اپنی قیادت پر ہی قانع نہیں بلکہ خود مولویوں کے حلقہ میں بھی اپنے آپ کو ان میں کا ایک سمجھنے پر راضی نہیں ہوتے۔ پہلے تو انہوں نے کبھی کسی مولوی کو منہ نہیں لگایا جب تک اس نے ان کے ہاتھ پر بیعتِ امارت نہیں کر لی۔ لیکن جب بعض سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے انہیں اکتیس۳۱ علماء کی جماعت میں شامل ہونا پڑا تو اُدھر اُن کی طرف سے مرتب کردہ دستوری سفارشات پر دستخط کئے اور ادھر اپنی طرف سے آٹھ نکاتی منشور الگ شائع کر دیا اور اپنی جماعت سے یہ کہا کہ وہ اس آٹھ نکاتی (جسے بعد میں نو نکاتی بنا دیا گیا تھا) منشور کے مطالبہ کے لئے حکومت کو چٹھیاں لکھیں اور ریزولیوشن پاس کریں یعنی اس میں بھی اپنی ہی قیادت کو آگے بڑھایا۔

ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ مودودی صاحب کے ارادت مندوں کے حلقہ کو یقیناً ناگوار گزرے گا۔ اس لئے کہ وہ تو انہیں (دفار ان کے بیان کے مطابق) امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ سے کم درجے پر نہیں سمجھتے۔ لیکن ہم ان حضرات سے جو حقائق کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں عرض کریں گے کہ وہ بغور دیکھیں کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بات حقیقت کے خلاف بھی ہے؟ دنیا کی تاریخ اس پر شاہد

ہے کہ بعض افراد اپنے مخصوص جذبات کی تسکین کے لیے کس طرح قوم کی قوم کو تباہ و برباد کرا دیتے ہیں۔ بعینہٖ یہی کچھ پاکستان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اربابِ حل و عقد میں صلاحیتوں کی پہلے ہی کمی تھی۔ اس پر ان لوگوں نے مذہب کے نام پر مسلسل چھیڑ چھاڑ سے ملک میں اس قدر ہڑبونگ مچا رکھی ہے کہ کئی موقعوں پر ارباب نظم و نسق بوکھلا گئے ہیں۔ ایک ایسا ملک جس میں آبادی کا بیشتر حصہ جذباتی ہو اور وہ مذہب کے نام پر بلا سوچے سمجھے سب کچھ کر دینے پر آمادہ ہو جاتا ہو، اس ملک میں لوگوں کے جذبات کو EXPLOIT کرنے والے عناصر بڑی آسانی سے تخریب پیدا کر سکتے ہیں۔[1]

---

[1] یہی کچھ انڈونیشیا کی نوزائیدہ مملکت میں وہاں کی "اسلامی جماعت" (دارالسلام والے) کر رہی ہے۔ چنانچہ اب وہاں صورتِ حالات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ملک میں حکومت ہی قائم نہیں ہوتی۔ یہی کچھ یہاں کی "اسلامی جماعت" چاہتی ہے۔

طلوعِ اسلام اور جماعتِ اسلامی

(۱) ہم میں اور ان میں فرق
(نام کے مسلمانوں کا وجود بھی ضروری ہے)

(جنوری ۱۹۴۹ء)

قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب کا خط:۔

میں "طلوعِ اسلام" ایک عرصہ سے پڑھتا ہوں اور اس کی حقیقت نگاری اور سلجھی ہوئی فکر کا مداح ہوں لیکن تازہ پرچہ (بابت ماہ نومبر ۱۹۴۸ء) کے لمعات[1] میں کچھ عجیب انتشارِ فکر اور تضاد سا محسوس کر رہا ہوں جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ نے ان صفحات میں قارئین کو اسلامی جماعت کے دینی اور سیاسی موقف سے خبردار کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ گروہ بھی قادیانیوں کی طرح مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتا بلکہ اسلام اور مسلمانوں کو دو علیٰحدہ چیزیں تصور کرتا ہے لیکن مجھے یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ جس جرم کا مجرم آپ ان کو گردانتے ہیں، اس کا ارتکاب خود آپ نے بھی کیا ہے صفحہ ۹ پر آخری پیراگراف میں آپ فرماتے ہیں کہ "آپ حیران ہوں گے کہ ہم نے یہ کیا کہہ دیا کہ ان کا یہ ڈر بجا ہوگا ہاں نہ صرف ان کا یہ ڈر بلکہ ایک حد تک وہ پروپیگنڈہ بھی جو مسلمانوں کے نظامِ حکومت کے خلاف دنیا کرتی چلی آئی ہے اور آج بھی کر رہی ہے۔ جیسا کہ ہم بار بار یا لوضاحت بیان کر چکے ہیں، مسلمانوں کا (اسلام کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا) نظامِ مملکت و آئینِ شریعت اپنے اکثر و بیشتر حصوں میں ایسا ہی رہا ہے جسے ہم دنیا کے سامنے کبھی بھی فخر کے ساتھ پیش

---

[1] ملاحظہ ہو "پاکستان کے نقاب پوش دشمن"۔

نہیں کر سکتے۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان پہلے یا اب جو کچھ بھی کرتے رہے ہیں وہ اسلام کی نمائندگی نہیں قرار دی جا سکتی۔ اگر اسلام کی نمائندگی کرنا ہے تو اسلام اور صرف اسلام ہی کو اختیار کرنا پڑے گا۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر آپ کا اسلامی جماعت پر یہ اعتراض کہ اس جماعت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے آپ کو اسلامی جماعت کہہ کر باقی مسلمانوں کے لئے گویا غیر اسلامی ہونے کا اعلان کر دیا اور اس طرح بُعد و منافرت کا وہی بیج جس پر تحریکِ قادیانیت کی اساس تھی از سرِ نو بو دیا گیا۔ اس کے بعد امیرِ جماعت نے جماعت کے اراکین کی تجدیدِ ایمان کی اور اس طرح اپنے دستِ حق پرست پر گویا از سرِ نو مسلمان کیا۔ کچھ بے معنی سا اعتراض معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا عجیب تضاد جو لمعات کے غائر مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ اسلامی نظام کی حمایت و وکالت کرتے ہوئے احوال و واقعات پر اسلامی اصولوں کی روشنی میں تنقید کرتے ہیں اور اسلامی اصولوں کی علمبرداری کے جوش میں اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھی اسلام کی کسوٹی پر پرکھ کر ناقص قرار دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف ایک اسلامی جماعت پر تنقید کرتے ہوئے اسے کبھی قیادت کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور کبھی قوم پرستی کے ترازو میں تولنے لگتے ہیں۔ قارئین تو متوقع ہیں کہ آپ قرآن وحدیث کی کسوٹی پر اس جماعت کو پرکھ کر بتائیں گے کہ آیا یہ گروہ خدا اور رسول کی اطاعت کی طرف بلا رہا ہے یا نہیں، شرک والحاد سے روکنے کی کوشش کر رہا ہے یا نہیں اسلامی نظامِ زندگی چاہتا ہے یا نہیں، منبعِ رشد و ہدایت قرآن وحدیث کو مانتا ہے یا نہیں اور آپ ہیں کہ کبھی تو کہتے ہیں کہ یہ لوگ اس لئے بُرے ہیں کہ مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتے کبھی کہتے ہیں کہ یہ قیادت میں کیڑے ڈالتے ہیں، قیادت کے منصب پر

حاملینِ شریعت کو فائز دیکھنا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مجھے توقع ہے کہ آئندہ اشاعت میں آپ اس تضاد کو رفع کر دیں گے اور اس جماعت پر خالص اسلامی نقطۂ نظر سے (یعنی آپ ہی کے لفظوں میں مسلمانوں کے نہیں بلکہ اسلام کے نقطۂ نظر سے) قرآن و حدیث کی روشنی میں تنقید فرما کر اس کے ہر غیر اسلامی پہلو کو بے نقاب کر دیں گے۔

طلوعِ اسلام

جماعت اسلامی کے متعلق جو کچھ طلوعِ اسلام میں لکھا گیا ہے اس کا اگر بغائر مطالعہ کر لیا جاتا تو یہ ذہنی انتشار اور تضاد محسوس نہ ہوتا۔

اسلامی جماعت اور طلوعِ اسلام کے مسالک میں کس حد تک اشتراک ہے اور کہاں سے ان کا مقام فراق شروع ہوتا ہے اس کے متعلق طلوعِ اسلام بابت ماہ ستمبر کے لمعات[1] میں بصراحت لکھا جا چکا ہے۔ اس پرچہ میں نیشنلسٹ مسلمانوں اور مسلم لیگ کے دعاوی کے تذکرہ کے بعد لکھا گیا تھا۔

> دورانِ تحریک میں ایک تیسری آواز اٹھی جس نے یہ کہا کہ بیشک مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قوم نہیں بن سکتے لیکن ہندوستان کے مسلمان محض پیدائشی مسلمان ہیں جن کا مسلمان ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ انہیں پہلے سچے معنوں میں مسلمان ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد آزادی کے طالب پیدائشی مسلمان انگریز یا ہندو کے غلام رہیں تو کیا اور اپنی الگ حکومت قائم کریں تو کیا۔ ان کی آزادی صحیح معنوں میں آزادی اسی صورت میں کہلا سکتی ہے جب یہ اپنے اندر اسلامی صفات پیدا کریں۔ اس نظریہ کے مدعیان نے اپنے آپ کو "اسلامی جماعت" کے نام سے متعارف کرایا۔

---

[1] فٹ نوٹ ملاحظہ ہو "ہندوستان جا رہے ہیں"

اس کے بعد لکھا گیا تھا۔

طلوعِ اسلام اس حد تک اسلامی جماعت کے ساتھ تھا کہ مسلمان صرف اُسی صورت میں آزاد کہلا سکتا ہے جب یہ اپنی مملکت میں خدا کا قانون رائج کرے۔ لیکن اس کا مسلک یہ تھا کہ خدا کے قانون کو رائج کرنے کے لئے کسی خطۂ زمین کی ضرورت ہے جب تک ہم ہندوستان میں کسی خطۂ زمین کے مالک نہیں بن جاتے اُس وقت تک حکومتِ خداوندی کے قیام کا امکان نہیں۔ لہٰذا مسلم لیگ کی تحریکِ تقسیم ہندوستان کو کامیاب بنانے کے لئے ہمیں پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ اس کی کامیابی سے ہمیں وہ امکانی قدرت حاصل ہو جائے گی جس سے اس زمین پر آسمان کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھ سکے۔ اگر ہم نے اس وقت تغافل برتا تو انگریز پورا ہندوستان ہندو کے سپرد کر دے گا جس سے ہمیں یہ امکانی قدرت حاصل نہ ہو سکے گی ہمیں مسلم لیگ کی اس سیاسی تحریک کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو قرآن کے قریب لانے کی کوشش بھی جاری رکھنی چاہیئے۔

اس کے بعد لکھا تھا۔

لیکن اسلامی جماعت کے نزدیک یہ مسلک قابلِ قبول نہ تھا۔ وہ پیدائشی مسلمان کے قومی اور اجتماعی مطالبات سے ہم آہنگی اور تعاون کو اسی طرح تعاون علی الاثم والعدوان سمجھتی تھی جس طرح مرزائی حضرات مسلمانوں سے روابط قائم کرنے میں کفر و فسق محسوس کرتے تھے چنانچہ اس جماعت نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی اس تحریک سے عملاً الگ رکھا اور دوسروں کو اس سے الگ رہنے کی تلقین کرتے رہے۔

ہم اپنے محترم بھائی سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا ان کے نزدیک تحریکِ پاکستان کے دوران میں

اسلامی جماعت کا یہ مسلک فی الواقع اسلام کی خدمت تھی؟

پاکستان کے بعد

یہ تو تھا تحریکِ پاکستان کے دوران میں تشکیلِ پاکستان کے بعد یہاں کا مسلمان جس نازک دور سے گذر رہا ہے اور جس طرح اس کے سامنے موت اور زندگی کا سوال پیش ہے، اس میں اس اسلامی جماعت کا جو مسلک ہے، وہ بھی ہر ایک کو معلوم ہے۔ وہ پھر اپنی اسی دعوت کو دہراتے چلے جا رہے ہیں کہ جب تک مسلمان سچے معنوں میں مسلمان نہیں بن جاتا، ان کے کسی اجتماعی مسئلہ میں تعاون اسلام کی رُو سے جائز نہیں ہے۔ آپ نے وہ خط دیکھ لیا ہوگا جس کی بنا پر مودودی صاحب کی گرفتاری عمل میں لائی گئی تھی اور جس میں مذکور تھا کہ جب تک یہاں اسلامی شریعت کا نفاذ نہیں ہو جاتا، پاکستان کی فوج میں بھرتی صحیح نہیں۔

ہم اپنے محترم بھائی سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اس وقت، اسلامی جماعت کا یہ مسلک اسلام کی خدمت ہے؟ یہ ہے قومیت پرستی کا وہ ترازو جس میں ہم اسلامی جماعت کے کارناموں کو تولتے ہیں!

پھر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ قائداعظم (مرحوم) کی یہ کوشش جس کی بنا پر پاکستان کا وجود عمل میں آگیا ہے موجبِ تشکر و امتنان ہے یا اس قابل کہ اس میں کیڑے ڈالے جائیں، سوچیے اور پھر خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ اسلامی جماعت نے اس وقت تک جو کچھ کیا ہے، اسے اسلام کی خدمت کہا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اسلامی جماعت کا مسلک یہ ہے کہ موجودہ مسلمان جو اسلام کے معیار پر پورا نہیں اترتا، زندہ رہ جائے یا فنا کر دیا جائے، برابر ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مسلک اسلام سے محبت نہیں اس سے سخت دشمنی ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ مسلمان جیسا کچھ بھی ہے، اسے زندہ رکھنے کی کوشش

مسلمان کو زندہ رکھیئے

کیجئے کہ اگر یہی باقی نہ رہا تو پھر صحیح معنوں میں مسلمان بناؤ گے کیسے؟ جاؤ اسپین میں اور وہاں کسی کو صحیح معنوں میں مسلمان بنا کر دکھاؤ! اگر یہاں بھی اسلامی جماعت کی مبارک کوششوں سے مسلمانوں کا وہی حشر ہو جائے جو اسپین میں ہو چکا ہے تو فرمائیے کہ یہ کوشش اسلام کے ساتھ دوستی کہلائے گی یا دشمنی۔ حیرت ہے کہ ہسپانیہ کے عیسائیوں کو آپ آج تک اسلام کا بدترین دشمن قرار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے وہاں سے مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیا لیکن یہاں جو جماعت یہ کہتی ہے کہ ہندوستان یا پاکستان میں مسلمانوں کا عدم و وجود برابر ہے اور ایسا طرزِ عمل اختیار کرتی ہے جس کا نتیجہ یہاں کے مسلمانوں کی بربادی اور تباہی ہو، تو اسے آپ اسلامی جماعت قرار دیتے ہیں اور ان کی مساعیِ جمیلہ کو اسلام کے لئے احسانِ عظیم منواتے ہیں۔ یہ ایک سیدھی سی بات ہے جس کے لئے کسی فقہی موشگافیوں اور شرعی نکات آفرینیوں کی ضرورت ہی نہیں۔ جذباتی طور پر یہ دعوت بڑی خوش آئند محسوس ہوتی ہے کہ ایسے نام کے مسلمانوں کے زندہ رہنے سے تو اچھا ہے کہ یہ کہیں فنا ہو جائیں اور ان کی وجہ سے اسلام بدنام نہ ہو لیکن سوچئے کہ یہ جذباتی شاعری اگر کہیں عملی صورت اختیار کر جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہو! اگر کہیں دو چار سو سال پہلے یہاں کوئی مودودی صاحب پیدا ہو گئے ہوتے تو آج یہاں یہ کہنے والا بھی کوئی نہ ہوتا کہ اسلام کو ایک عملی قوت بننا چاہیئے۔ آج جو حضرات اسلامی جماعت کے ارکان اور احیاء اسلام کی تحریک کے علمبردار بن رہے ہیں، وہ انہی مسلمانوں کی اولاد ہیں جو ہماری طرح غیر اسلامی اجتماعی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان حضرات کے مسلک کے مطابق جن کا عدم اور وجود برابر تھا۔ اُس زمانہ میں چونکہ کوئی اسلامی جماعت پیدا نہ ہوئی اس لئے اُن کا وجود باقی نہ رہا

اور اس طرح آج یہ لوگ مسلمانوں کے گھرانوں میں پیدا ہو کر اسلامی جماعت کے افراد بن گئے ہیں۔ اگر وہ مسلمان مسلمان نہ رہتے تو یہ حضرات آج کسی شردھانند اور ریارام کے گھر میں پیدا ہوتے اور انہیں عمر بھر اس کا خیال تک بھی نہ آتا کہ اسلام میں کوئی خوبی ہے۔ بلکہ یہ اسلام کے نام سے بیزار ہوتے اور دوسرے غیر مسلموں کی طرح اسے گالیاں دیا کرتے لہٰذا ہم عاصیوں اور خطا کاروں کے نزدیک گنہگار مسلمان کا وجود ان کے عدم وجود سے بہر حال بہتر ہے کہ اس سے اور کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو اس کا امکان تو ہو سکتا ہے کہ ان سے یا ان کی اولاد سے کوئی ایسا بھی پیدا ہو جائے گا جس کے دل میں اسلام کی بہبودی کی تڑپ ہو۔ اگر یہ گنہگار (پیدائشی) مسلمان باقی نہ رہیں (اور دشدھ ہو جائیں) تو یہ امکان بھی ختم ہو جائے۔

نفرت کا جذبہ اس کے بعد آپ سوچئے کہ ان حضرات کے اس مسلک کی بنیاد کس چیز پر ہے؟ اسی جذبۂ نفرت پر جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ نفرت تمام مسلمانوں سے بجز اُن چند لوگوں کے جو ان کی جماعت کے ممبر بن جائیں۔ لیکن اس نفرت کو مقدس اور حسین بنا لیا گیا ہے یہ کہہ کر کہ یہ لوگ مسلمان ہی نہیں ہیں۔ اس لئے ان سے محبت کیوں کی جائے۔ مسلمان صرف ہم ہیں (جنہوں نے اسلامی جماعت کی رکنیت قبول کر لی ہے) اور ہماری ایک دوسرے سے محبت ہے۔ ہم اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ مسلمانوں کے متعلق اس قسم کا جذبۂ منافرت کس حد تک جائز قرار دیا جا سکتا ہے اور ان کی تکفیر و تفسیق کہاں تک اسلامی خدمت۔ اس کے متعلق سرِ دست خود مودودی صاحب کے وہ الفاظ سن لیجئے جو انہوں نے اپنے دعوئے امارت سے پہلے تحریر فرمائے تھے اور جن میں

مسلمانوں کی تکفیر و تفسیق کی شدید مخالفت کے بعد لکھا تھا۔

تکفیر اس فتنے کی تحریک خواہ تنگ نظری ہو نیک نیتی کے ساتھ یا خود غرضی، حسد اور نفسانیت ہو بدنیتی کے ساتھ بہرحال اس نے جمعیتِ اسلامی کو جتنا نقصان پہنچایا ہے شاید اور کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ قطع نظر اس کے مسلمانوں کی تکفیر و تفسیق ایک سنگین قومی جرم بھی ہے۔ جو شخص کسی ایک مسلمان یا مسلمانوں کے کسی گروہ پر ناحق کفر کا فتویٰ لگاتا ہے وہ صرف اسی شخص یا گروہ کے حق میں ظلم نہیں کرتا بلکہ پوری اسلامی جمعیت پر ظلم کرتا اور خود اسلام کو ضررِ عظیم پہنچاتا ہے۔ اس کی وجہ ادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے۔ اسلام میں کسی شخص یا گروہ کو کافر کہہ دینے کے معنی صرف یہ نہیں کہ اس کے اعتقاد اور نیت پر حملہ کیا گیا، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی جمعیت اور اس کے ایک فرد یا چند افراد کے درمیان برادری، محبت، معاشرت، معاملت اور تعاونِ باہمی کے سارے رشتے کاٹ دیئے گئے اور امتِ مسلمہ کے جسم سے ایک عضو یا متعدد اعضاء کو چھانٹ کر پھینک دیا گیا۔ (ترجمان القرآن بابت ماہ صفر ۱۳۵۵ھ)

مودودی صاحب کے اس مضمون میں "جمعیتِ اسلامی" "قومی جرم" "اسلامی جمعیت" "امتِ مسلمہ کا جسم" وغیرہ اصطلاحات خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ یہ وہی "اسلامی جمعیت" اور قومیت ہے جس کی وہ آج اس طرح سے تضحیک و تحقیر کر رہے ہیں۔ آج ان کے نزدیک مسلمانوں کا ایک قوم ہونا انتہائی جرم ہے اور شدید ترین غیر اسلامی مسلک۔ حالانکہ کل تک وہ اس جمعیت اور قوم کی وحدت و اجتماعیت کو اس درجہ اہم خیال کرتے تھے۔ اس میں انتشار و افتراق ان کے نزدیک سنگین جرم

تھا، وہی جرم جس کے وہ آج خود اس شدت سے مرتکب ہو رہے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف کفر کا فتویٰ نہیں لگایا۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن انہوں نے اگر یہ الفاظ نہیں کہے تو اس سے اصل حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کا نتیجہ وہی ہے جو خود اُن کے الفاظ میں تکفیر و تفسیق کا نتیجہ ہوتا ہے یعنی مسلمانوں کی جمعیت میں انتشار، اُمتِ مسلمہ کے جسم سے ایک عضو یا متعدد اعضاء کو کاٹ کر الگ پھینک دینا، ان کے اجتماعی امور میں تعاون و تناصر کے تمام رشتوں کو کاٹ دینا۔ سوچئے کہ اسلامی جماعت نے یہی کچھ کیا ہے یا نہیں۔

تعمیری کام پھر یہ سوچئے کہ اس جماعت نے مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچانے کی کوششوں کے ساتھ اپنی اسلام دوستی میں کون سا تعمیری کام کیا ہے! انہوں نے تمام مسلمانوں کو نام کا مسلمان کہہ کر خود وہ کون سی زندگی اختیار کی ہے جسے سچے معنوں میں مسلمان کی زندگی کہا جاتا ہے۔ تعمیری کام جو کچھ انہوں نے کیا ہے، وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ ان کا سارا کارنامہ اپنا لٹریچر بیچنا ہے۔ باقی رہی ان کی اسلامی زندگی، سو اس موضوع پر بات ذاتیات تک آجاتی ہے، اس لئے اس سے احتراز کرنا چاہیئے (تاآنکہ معاملہ کی اہمیت خود اس کی مقتضی نہ ہو جائے)۔ بہ ہیئتِ مجموعی دیکھئے تو صاف نظر آجائے گا کہ ہندوستان میں جس قسم کی اجتماعی زندگی باقی مسلمان بسر کرتے تھے، وہی یہ لوگ بسر کرتے تھے۔ یہ بھی انگریز کے اُسی قانون کے پابند تھے جس کی پابندی دیگر مسلمان کرتے تھے۔ یہ بھی اُسی سرزمین میں رہتے تھے جہاں "طاغوت" کا نظام رائج تھا اور اُنہی پابندیوں کے ساتھ جو اُس نظام نے عائد کر رکھی تھیں۔ ان سے کہیں بہتر تو ہندوؤں کی وہ جماعتیں تھیں جنہوں نے انگریز

کے کئی ایسے قوانین توڑ ڈالے جنہیں وہ نادرست خیال کرتی تھیں خواہ ایسا کرنے میں انہیں کتنی مصیبتیں کیوں نہ اٹھانی پڑیں) تو فرمائیے کہ وہ کون سی مابہ الامتیاز خصوصیت تھی جس کی بناء پر یہ اپنے آپ کو سچے مسلمان اور باقی مسلمانوں کو پیدائشی مسلمان کہتے تھے (اور اب بھی کہتے ہیں) آپ کہہ دیں گے کہ یہ مسلمانوں کو سچے مسلمان بننے کی دعوت دیتے ہیں۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا محض اس دعوت دینے سے یہ لوگ سچے مسلمان بن جاتے ہیں۔ اور باقی مسلمان محض نام کے مسلمان رہ جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ کیا مسلمانوں کو سچے معنوں میں مسلمان بننے کی یہ آواز سب سے پہلی آواز ہے؟ کیا مودودی صاحب سے پہلے کسی نے مسلمانوں کو یہ دعوت نہیں دی اور جنہوں نے یہ دعوت دی اُن میں سے کسی نے یہ بھی کیا کہ اپنی اس دعوت کی بناء پر اپنے آپ اور اپنے متبعین کو سچا مسلمان اور باقیوں کو نام کا مسلمان قرار دے دیا ہو۔ آپ غور کریں گے تو اس باب میں صرف قادیانیوں کی جماعت آپ کو ایسی ملے گی جنہوں نے ایسا کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اُن کی دعوت کو صحیح نہ سمجھیں (جیسا کہ اسلامی جماعت کی دعوت کو وہ درست نہیں سمجھتے) لیکن اصل کے اعتبار سے دونوں میں یہ اشتراک ظاہر ہے۔

جذبات پرستی

اسلامی جماعت کا مدار اس پر ہے کہ وہ جذبات سے اپیل کرتی ہے حقائق سے نہیں۔ وہ کبھی نوجوانوں کو اس طرف نہیں آنے دے گی کہ جس قسم کے حالات سے ہم گزر رہے ہیں اُن میں ہمارے لئے راہِ صواب کون سی ہے۔ وہی جذبات پرستی (EMOTIONALISM) جو انسان کو ٹھوس حقائق (CONCRETE PROBLEMS) سے تصوراتی دنیا (ABSTRACTS) میں لئے پھرتی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ جو عملی مشکلات ہمارے سامنے ہیں اُن کا عملی

حل کیا ہے باقی سب شاعری ہے اور چونکہ مسلمان نوجوان کو شاعری زیادہ مرغوب ہے اس لئے ہر وہ تحریک جو شاعری (جذبات) کو اپیل کرے گی ان کے نزدیک مقبول ہو گی۔ اسلامی جماعت قوم کے نوجوانوں کی اس نفسیاتی کمزوری سے کھیل رہی ہے۔

فرق

مختصر الفاظ میں ہمارا مسلک یہ ہے کہ

(۱) پاکستان کی تحریک اسلام دوستی پر مبنی تھی۔	اس لئے کہ اس سے ہمیں ایک ایسی مملکت مل جاتی ہے۔
(۲) اب پاکستان کا تحفظ اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش، عین اسلامی خدمت ہے۔	جس میں اسلامی نظامِ زندگی کے قیام و ترویج کے مواقع حاصل ہو جاتے ہیں اور "ذریعہ" کا تحفظ مقصد کے تحفظ کا پہلا زینہ ہے۔
(۳) موجودہ مسلمان، جیسے بھی یہ ہیں، ان کی قوت اور بقا کے لئے ہر ممکن کوشش نہایت ضروری ہے اور اسلامی خدمت	اس لئے کہ غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے۔ انہی سے پاکستان کا تحفظ ممکن ہے اور پاکستان میں اسلامی نظامِ زندگی کی تجربہ گاہ بننے کے امکانات ہیں
(۴) ہم سب مسلمان ایک ہی قسم کی اجتماعی بیماریوں میں مبتلا ہیں اس لئے اگر مسلمان ہیں تو ہم سب ہیں اور اگر مسلمان نہیں تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں بجز	اس لئے کہ محض "دعوت" دینے سے آپ الگ اجتماعی زندگی بسر نہیں کر سکتے جس کے لئے جداگانہ مملکت کا ہونا نہایت ضروری ہے اور مسلمانوں سے

صحیح اسلام کی طرف دعوت دینے سے ہم میں سے کوئی شخص یا جماعت اپنے آپ کو باقی مسلمانوں سے الگ نہیں فرض کرسکتی ایسا کرنا اسلام سے دشمنی ہے۔

(۵) ہمیں بغیر گروہ بندی کے تحفظِ پاکستان کی کوششوں کے ساتھ ساتھ قوم میں صحیح قرآنی نظام کا تصور ابھارنا اور اس کا احساس بیدار کرتے چلے جانا چاہئے

الگ ہو کر آپ ان کی جمعیت میں انتشار پیدا کر سکتے ہیں جو تحفظِ پاکستان کے لئے سخت ضرر رساں ہے۔
اس لئے کہ تحزّب و تشیع (گروہ بندی) کو قرآن سنگین ترین جرم قرار دیتا ہے۔
یہ اُمّت انہی گروہ سازیوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی ہے اور آج بھی ہو رہی ہے۔
گروہ بندی نفرت سکھاتی ہے اور قرآن رحماءُ بینھم کی تعلیم دیتا ہے ۱۸/۲۹

(۶) اور جب یہ احساس عام اور یہ تصور ہمہ گیر ہو جائے تو آئینی طور پر وہ تبدیلی پیدا کرنی چاہیئے جس سے یہ تصور مملکت کا قانون بن جائے۔

اس لئے کہ زمانہ جمہور کی آواز سننے پر مجبور ہو رہا ہے۔ اگر ہم نے جمہور میں ان خیالات کو عام کر دیا تو پھر کوئی طاقت ان خیالات کو دبا نہیں سکے گی۔ اس وقت تک ہمارے عوام (جمہور) میں یہ احساس بالکل ناپید ہے۔ اس لئے اسلامی نظام کی آواز ایک پارٹی کی آواز ہے عوام کی آواز نہیں۔ اسے عوام کی آواز بنانا نہایت ضروری ہے۔

(۷) بعض دردمند دلوں کی بیتابی تمنا

(۷) اس لئے کہ جو تبدیلی ہمارے ہاں ہوئی

انہیں تابِ انتظار نہیں دیتی اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ انقلاب شبا شب ہو جائے۔ یہ حضرات جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور جذباتی تحریکیں انہیں بہت پسند آتی ہیں لیکن تغیرِ حالات، صبر طلب ہوتا ہے اور وقت چاہتا ہے۔ دنیا کا کوئی انقلاب بھی راتوں رات رونما نہیں ہوا؟ حتیٰ کہ اسلام کا انقلاب بھی نہیں۔ لہٰذا پاکستان میں مجوزہ انقلاب بھی وقت کا محتاج ہے۔

ہے، وہ محض دستاویزی تبدیلی ہے، قلب و نظر کی تبدیلی نہیں یہ تاریخ کے شاذ واقعات میں سے ہے کہ کسی قوم میں داخلی تبدیلی کے بغیر محض سیاسی طور پر خارجی تبدیلی واقع ہو گئی ہو، داخلی تبدیلی تدریجاً ہوگی۔ یہ مرحلہ صبر آزما ہے اور استقلال و استقامت چاہتا ہے لہٰذا، صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ

بانشۂ درویشی درساز و دما دم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

(۲) جھوٹی روایتیں

(جون ۱۹۵۱ء)

بعض لوگوں کو اس پر تعجب ہوا کرتا ہے کہ جو لوگ جھوٹی روایات وضع کیا کرتے تھے، وہ لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی موجودگی میں اس کی جرأت کس طرح کر لیتے تھے لیکن ان کے لئے یہ چیز وجہِ استعجاب نہیں رہے گی جب وہ دیکھیں

گے کہ لوگ آج بھی افترا پردازی اور بہتان تراشی میں کس طرح بکف چراغ داشتہ میدان میں آجاتے ہیں۔ طلوعِ اسلام ہر مہینے شائع ہوتا ہے اور سالہا سال سے شائع ہوتا چلا آرہا ہے۔ ہزارہا لوگ اسے ہر مہینے پڑھتے ہیں۔ اس کی کاپیاں ہر جگہ سے مل سکتی ہیں۔ سینکڑوں قارئین کے ہاں اس کی فائلیں تک بھی موجود ہیں۔ جو کچھ لکھتا ہے کھلے کھلے طور پر لکھتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے واضح انداز میں کہتا ہے۔ اس میں نہ رموز ہوتے ہیں نہ بواطن، نہ اس میں کسی سینہ بہ سینہ طریقۂ تعلیم و تعلّم کو دخل ہے۔ اس کے باوجود دیکھئے کہ کہنے والے اس کے متعلق کیا کہتے ہیں

طلوعِ اسلام کے خلاف

قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب نے لکھا ہے کہ طلوعِ اسلام کے متعلق اسلامی جماعت کے اخبار "کوثر" (لاہور) کی ۲۱ مئی کی اشاعت میں حسبِ ذیل سطور شائع ہوئی ہیں۔

دوسرے وہ لوگ جنہوں نے سرے سے سنّت کے وجود ہی کا انکار کر دیا، عہدِ حاضر میں طلوعِ اسلام کا ملحدانہ مکتبِ خیال اس گروہ کا ترجمان ہے۔ اس نے سرے ہی سے حدیث کا انکار کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک ایسے شخص کی حیثیت دے دی جس نے قرآنِ مجید کو خدا سے پاکر انسانوں کو دیدیا اور نہ پھر اس پر خود عمل کیا اور نہ دوسروں سے عمل کرایا اور جس طریق پر زندگی بسر کی اس کا کوئی حصّہ ایسا ہے جس کی پیروی اور اطاعت واجب ہو بلکہ اب جس کے جی میں جو آئے، قرآنِ مجید کے احکام کے معنی نکالے۔ یہاں تک کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی بھی کوئی صورت متعیّن نہیں۔ نمازیں خواہ تین ہوں یا ایک مجرّد دفتروں کی حاضری ہی کو نماز کا قائم مقام تصوّر کر لیا جائے۔ روزے بھی

چند ہیں یعنی زیادہ سے زیادہ تین وغیر ذلک من الخرافات۔ اسلامی زندگی کسی معین اور مقرر ضابطہ حیات کا نام نہیں ہے مسلمان جو کچھ کر لیں بس وہی اسلام ہے

ہم قارئین طلوعِ اسلام سے پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے آج تک طلوعِ اسلام میں کہیں بھی یہ لکھا دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے نہ قرآن پر خود عمل کیا نہ دوسروں سے عمل کرایا

چیلنج

جس کے جی میں آئے قرآن کے احکام کے معنی نکالے یہاں تک کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی کوئی صورت معین نہیں۔ یا یہ لکھا ہو کہ نمازیں خواہ تین ہوں، خواہ ایک یا مجرد دفتر کی حاضری ہی کو نماز کا قائم مقام تصور کر لیا جائے۔ یا کسی جگہ یہ لکھا ہو کہ روزے زیادہ سے زیادہ تین ہیں، یا یہ کہ اسلامی زندگی کسی معین اور مقرر ضابطہ حیات کا نام نہیں مسلمان جو کچھ کرلے بس وہی اسلام ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کتنا بڑا ہے یہ افترا جو وضع کیا گیا ہے اور کیسا سنگین ہے یہ بہتان جو تراشا گیا ہے۔ جس کی تائید میں طلوعِ اسلام کے فائلوں میں سے ایک لفظ بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اب ذرا سوچئے کہ آنے والا مؤرخ جب ہمارے دور کی تاریخ لکھنے بیٹھے اور اُس کے سامنے اخبار کوثر کا مذکورہ صدر شذرہ ہو تو اس کے بعد وہ طلوعِ اسلام کے مکتبِ خیال کے متعلق جو رائے بھی قائم کرے گا، ظاہر ہے۔ آنے والوں کے لئے اخبار "کوثر" کی مذکورہ شہادت ایک مستند روایت بن جائے گی، بالخصوص جب وہ اس روایت کے راویوں کے متعلق یہ بھی لکھا ہوا دیکھے گا کہ یہ لوگ اپنے آپ کو امت کے صالحین قرار دیتے تھے۔ اس لئے جرح اور تعدیل کے ہر معیار کے مطابق یہ راوی لامحالہ ثقہ قرار پائیں گے اور روایت بالکل صحیح اور معتبر۔

اب تو آپ کو اس پر تعجب نہیں ہوگا کہ جھوٹی روایتیں کس طرح وضع ہوا کرتی ہیں۔

مودودی صاحب کی سزا کے خلاف

(طلوعِ اسلام کا مطالبہ)

(جون ۱۹۵۳ء)

سورۂ انفال کی پینسٹھویں آیت میں ایک ایسی عظیم الشان حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ جوں جوں نگاہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، قوموں کی زندگی اور موت اور اُن کے عروج و زوال سے متعلق ایک بنیادی اصول کی عظمت و اہمیت ابھر کر سامنے چلی آتی ہے۔ اس آیت میں جماعتِ مومنین سے یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم میں بیس نفوس بھی ایسے نکل آئیں جو مستقل مزاج اور ثابت قدم رہیں تو وہ فریقِ مقابل کے دو سو آدمیوں پر غالب آجائیں گے اور اگر تم میں سو آدمی اس قسم کے نکل آئے تو وہ ہزار آدمیوں کو مغلوب کر لیں گے یعنی ساز و سامان کی برابری کے ساتھ یہ لوگ اپنے سے دس گناہ زیادہ جمعیت پر غالب رہیں گے یہ ایک بہت بڑی سبقت (ADVANTAGEOUS POSITION) ہے جو کسی قوم کو حاصل ہو جاتے۔ ایسی قوم ہر میدان سے فاتح و منصور لوٹے گی اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے سے دس گناہ زیادہ قوت پر غلبہ پالے گی۔ دنیا کی وہ کون سی قوم ہے جو یہ معلوم کرنا نہ چاہے گی کہ وہ راز کون سا ہے جس کے زور پر وہ فریقِ مقابل کی دس گناہ زیادہ جمعیت و قوت پر غالب آجایا کرے۔ قرآن نے اس راز کو پوشیدہ نہیں رکھا۔ اس لئے کہ وہ کتابِ مبین ہے یعنی کھلا کھلا ضابطۂ حیات اور تمام نوعِ انسانی کے لئے واضح راہنمائی (هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَٰتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ)[۲/۱۸۵] چنانچہ اس نے جہاں یہ بتایا کہ تم اپنے سے دس گنا جمعیت

پر غالب آسکتے ہو؟ نیز یہ بھی بتا دیا کہ اس قوت کا راز کیا ہوگا؟ اس نے کہا کہ تمہارے فریقِ مقابل کی دس گنا زیادہ جمعیت تمہارے ہاتھوں اس لئے شکست کھا جائیگی کہ:

بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۸/۶۵)

فہم و بصیرت

اس لئے کہ وہ لوگ فہم و بصیرت سے کام نہیں لیتے بعض اندھے جذبات کے جوش میں مخالفت پر اتر آتے ہیں یہ لوگ معاملات میں ٹھنڈے دل سے غور کر کے عقل و بصیرت اور معاملہ فہمی کی رو سے فیصلے نہیں کرتے بلکہ اندھا دھند جذبات کی رَو میں بہے چلے جاتے ہیں اس لئے ایسے لوگوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو، یہ ان لوگوں کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتے جو اپنے معاملات

جذبات پرستی

کا فیصلہ جذبات کے بجائے عقل و بصیرت کی رو سے کرتے ہوں آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کی رُو سے کسی قوم کی قوت اور کمزوری کا بنیادی معیار کیا ہے، یہ کہ وہ قوم اپنے معاملات کا فیصلہ فہم و بصیرت سے کرتی ہے یا جذبات کے ہیجان سے۔ اس کے بعد یہ سوچئے کہ مسلمانوں کا شمار اول الذکر گروہ (اربابِ فہم و فراست) میں ہو سکتا ہے یا ثانی الذکر گروہ میں جن کا ہر قدم جذبات کے سیلاب کے زور سے اٹھتا ہے اور جو آندھی کی طرح ابھر کر آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ آج دنیا میں مسلمانوں کی قوم سب سے زیادہ جذباتی واقع ہوئی ہے اور ستم بالائے ستم کہ انہیں اپنی اس شدتِ جذبات پر بڑا فخر و ناز ہے۔ وہ اپنے ان جذبات کو ایمان کی حرارت اور حق کی حمایت کا جوش قرار دے کر انہیں اپنا قومی امتیاز سمجھتے ہیں۔ عوام میں اس خیال کے عام کرنے اور ان کی آتشِ جذبات کو مشتعل رکھنے میں ان کے مفاد پرست رہنماؤں کا خاص ہاتھ ہوتا ہے۔ ان لیڈروں کا جن

میں مذہبی پیشواؤں کا قدم سب سے آگے ہوتا ہے) فائدہ اس میں ہوتا ہے کہ لوگ کبھی عقل و فہم سے کام نہ لیں اور ہمیشہ جذبات کے زور پر بلا سوچے سمجھے وہ کچھ کرتے جائیں جو کچھ وہ ان سے کرانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے قوم کو اس کا عادی بنا چھوڑا ہے کہ وہ ان کی ایک دھواں دھار تقریر، ایک آتشیں بیان، ایک فلک بوس نعرے پر عقل و ہوش سے بیگانے ہو جائیں اور اس دیوانگی میں وہ سب کچھ کر گذریں جس پر ان جذبات کے فرو ہونے کے بعد وہ خود ہی نادم و پشیمان ہوں جو لیڈر اپنے پیچھے اس قسم کے لوگوں کو لگا لئے اس سے سب ڈرتے ہیں حتیٰ کہ ان سے کمزور حکومت بھی خائف ہو جاتی ہے وہ اس دباؤ میں اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہتے ہیں اور عوام اس حماقت میں تباہ ہوتے رہتے ہیں۔ وہ بلا دریغ جانیں دیدیتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ان کے خون کی قیمت کون وصول کر رہا ہے۔

ہندوستان کی سیاست

آپ (باقی ممالکِ اسلامیہ کو چھوڑ کر) اگر صرف ہندوستان اور پاکستان کی گذشتہ پچیس تیس سال کی مختلف تاریخوں پر غور کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قوم کی اس روش نے (کہ ایک نعرۂ ہُو سے ان کے جذبات آگ کی طرح بھڑک اُٹھتے ہیں) ملک کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے علاوہ اُس مالی اور جانی نقصان کے جس کا اندازہ لگانا لگانا بھی مشکل ہے ایک بڑا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ قوم کے اعصاب اس قدر کمزور (فلہذا ذکی الحس) ہو چکے ہیں کہ اب کوئی شخص کسی ایسی بات کے سننے کی تاب نہیں رکھتا جو اس کے جذبات کے خلاف جاتی ہو، خواہ وہ بات کتنی ہی معقول اور عقل و دانش پر مبنی کیوں نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کی حالت ایسی ہو جائے تو اُس قوم کے پنپنے کی کون سی شکل باقی رہ جاتی ہے۔

طلوعِ اسلام کی دعوت

یہ ہے اس وقت ہمارے ملک کی عام حالت جس کے اندر طلوعِ اسلام یہ دعوت دیتا ہے کہ ہر معاملہ پر قرآن کی روشنی میں عقل و فکر سے غور کرو اور اس کا فیصلہ جذبات کی شعلہ فشانیوں کے بجائے فہم و فراست کی معتدل میزان کی رو سے کرو۔ بعض حضرات اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ عوام میں طلوعِ اسلام کی مقبولیت اتنی تیزی سے بڑھ کیوں نہیں رہی۔ اس کا جواب ظاہر ہے۔ جو دعوت عوام کو جذبات کی رَو میں بہ جانے کی بجائے عقل و فکر سے کام لینے کی تلقین کرتی ہوئی اسے عوام میں کس طرح مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے لیکن طلوعِ اسلام کے سامنے مقبولیت کا سوال ہی نہیں۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ قوم کسی نہ کسی طرح قرآن کی روشنی میں خود سوچنا شروع کر دے۔ وہ خود بھی اسی مسلک پر قائم ہے اور دوسروں کو بھی اسی پر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔

یہی ہے وہ مسلک جس کی رو سے وہ آج اُس نازک مسئلے پر دعوتِ غور و فکر دیتا ہے جس نے اِس وقت ملک کی فضا کو ایک شعلۂ جوّالہ میں تبدیل کر رکھا ہے ہم اپنے قارئین سے اتنی اپیل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کچھ وقت کے لئے جذبات کو الگ رکھ دیں اور ہماری گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ ہمارا مقصد نہ کسی کی طرفداری ہے نہ کسی کی مخالفت یہ مقصد صرف اتنا ہے کہ قوم کا سنجیدہ طبقہ اس نازک مسئلہ پر دانش و بصیرت سے غور کرے اور فہم و فراست سے اس کا حل سوچے تاکہ ملک ان تباہیوں سے بچ جائے جو جذبات کے سیلاب کا لازمی نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔

ایک دن یکایک خبر آگئی کہ لاہور کی فوجی عدالت نے عبدالستار نیازی صاحب کو موت کی سزا دے دی ہے اور اس کے بعد اس سے بھی زیادہ اچانک انداز سے

اس کا اعلان ہو گیا کہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو بھی سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔

مودودی صاحب کی سزا

ان اطلاعات سے ہمارے دل پر کیا گزری، اس کے بیان کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ اس دوسری خبر کے ایک ہی دن بعد یہ خبر کہ یہ سزائیں سزائے قید میں تبدیل کر دی گئی ہیں، ہمارے اضطرابِ جگر سوز کو قدرے سکون میں بدلنے کا موجب بن گئی۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ مودودی صاحب کے متعلق اس خبر سے ہمیں اس قدر اضطراب کیوں پیدا ہو گیا، کیونکہ ہم تو ان کی دعوت اور تحریک کے مسلسل مخالف چلے آرہے ہیں۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم آج بھی ان کی تحریک کی اسی طرح مخالفت کرتے ہیں جس طرح اس سے پہلے کرتے رہے ہیں۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ہم متعدد بار کہہ چکے ہیں) ہمارے نزدیک ان کی تحریک اسلام اور پاکستان دونوں کیلئے سخت خطرہ کا موجب ہے اس کے لئے ہم اپنے دلائل بارہا بیان کر چکے ہیں جن کے دہرانے کی اس وقت ضرورت نہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہم مودودی صاحب کو نہ دین کا عالم سمجھتے ہیں نہ کوئی مفکر۔ لیکن ہمارے دل میں انسانی زندگی کے لئے وہ احترام بدرجۂ غایت موجود ہے جس کی قرآن نے تعلیم دی ہے۔ انسانی زندگی کی یہ قدر و قیمت ہمارے نزدیک ہر قسم کی نسبتوں سے بلند ہے۔ قرآن کی رو سے انسان صرف انسان ہونے کی جہت سے واجب الاحترام ہے۔ اس کا اعلان یہ ہے کہ جس نے کسی ایک انسانی زندگی کو بھی ناحق تلف کر دیا تو اُس کا جرم اتنا بڑا ہے کہ گویا اس نے تمام نوعِ انسانی کو ہلاک کر دیا۔ لہٰذا یہ بختِ ازلی ہے وہ دل جو کسی انسانی زندگی کے ناحق تلف ہو جانے کے احساس سے ہمہ تن اضطراب نہ بن جائے اللہ کا احسان ہے

کہ اس نے طلوعِ اسلام کو یہ توفیق ارزانی فرمائی ہے کہ وہ احترامِ انسانیت کے اس بلند جذبہ کو مسلک کے اختلاف سے ملوّث نہ ہونے دے۔ الحمد للہ علیٰ ذلک۔

ہمارا اضطراب یہ تھا کہ اس امر کا یقین ہو جانا چاہیئے کہ یہ زندگیاں کہیں ناحق تلف تو نہیں ہو رہیں۔ اور جب یہ اعلان ہو گیا ان کی سزائے موت کو قید میں تبدیل کر دیا گیا ہے تو اس سے اتنا اطمینان ہو گیا کہ خیر اب اس کا امکان تو ہے کہ یہ معلوم کر لیا جائے کہ یہ فیصلہ حق پر مبنی ہے یا نہیں؟

قرآن جہاں انسانی زندگی کو اس قدر اہمیت دیتا ہے وہاں اس نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ ایک چیز انسانی زندگی سے بھی زیادہ اہم ہے اور وہ ہے عدل ناحق اتلافِ جان کے معنی یہ ہیں کہ وہ جان عدل کے مطابق نہیں لی گئی۔ اس عدل کی رُو سے قرآن نے جرمِ قتل کی سزا موت تجویز کی ہے۔ نیز اس کی رو سے نظامِ مملکت کے خلاف بغاوت کی سزا بھی قتل یا قید یا جلا وطنی ہے (۵/۳۳)۔ دنیا کی عام حکومتوں نے بھی قتل اور بغاوت کی یہی سزا تجویز کی ہے۔ بغاوت کی سزا کے متعلق مودودی صاحب اپنی کتاب "مرتد کی سزا" میں لکھتے ہیں۔

بغاوت کی سزا

> سوال صرف یہ ہے کہ جو ریاست کسی خطۂ زمین پر حاکمیت رکھتی ہو آیا وہ اپنے وجود کی حفاظت کے لئے ایسے افعال کو جرم قرار دینے کا حق رکھتی ہے یا نہیں جو اس کے نظام کو درہم برہم کرنے والے ہوں۔ اس پر اگر کوئی معترض ہو تو وہ ہمیں بتائے کہ دنیا میں کس ریاست نے یہ حق استعمال نہیں کیا۔ (ص ۵۷)

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

> یہ قوانین کسی جذباتی بنیاد پر مبنی نہیں ہیں۔ بلکہ اس اصول پر مبنی ہیں کہ قائم شدہ ریاست

جس کے قیام پر ایک خطۂ زمین یعنی سوسائٹی کے نظام کا قیام منحصر ہو، اپنے اجزائے ترکیبی کو انتشار سے بجبر روکنے اور اپنے نظام کو خرابی سے بچانے کے لئے طاقت کے استعمال کا حق رکھتی ہے۔ (صفحہ ۶۰)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

دنیا کے جس ملک کا قانون بھی آپ اٹھا کر دیکھیں گے، وہاں آپ کو یہی اصول کام کرتا نظر آئے گا کہ اسٹیٹ جن عناصر کے اجتماع سے تعمیر ہوتا ہے، ان کو وہ منتشر ہونے سے بزور روکتا ہے اور ہر اُس چیز کو طاقت سے دباتا ہے جو اس کے نظام کو درہم برہم کرنے کا رجحان رکھتی ہو۔ (صفحہ ۶۵)

بغاوت تو ایک طرف، وہ تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ:۔

ایک منظم سوسائٹی جو ریاست کی شکل اختیار کر چکی ہو، ایسے لوگوں کے لئے اپنے حدودِ عمل میں بمشکل ہی گنجائش نکال سکتی ہے جو بنیادی امور میں اس سے اختلاف رکھتے ہوں۔ (صفحہ ۴۹)

اور یہ بھی کہ:۔

جو شخص اس بنیاد کو تسلیم نہیں کرتا جس پر سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تنظیم رکھی گئی ہے اور اس سے کبھی آئندہ بھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ اسے قبول کر لے گا، ایسے شخص کے لئے مناسب یہ ہے کہ جب وہ اپنے لئے اس بنیاد کو ناقابلِ قبول پاتا ہے جس پر سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تعمیر ہوئی ہے، تو خود اس کے حدود سے نکل جائے، مگر جب وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے لئے دو ہی علاج ممکن ہیں۔ یا تو اسے اسٹیٹ میں تمام حقوقِ شہریت سے محروم کر کے زندہ رہنے دیا جائے یا پھر اس

کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے پہلی صورت فی الواقع دوسری صورت سے شدید تر سزا ہے
کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لَا یَمُوۡتُ فِیۡهَا وَلَا یَحۡیٰی کی حالت میں مبتلا رہے
اور اس صورت میں سوسائٹی کے لئے بھی وہ زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی
ذات سے ایک مُستقل فتنہ لوگوں کے درمیان پھیلتا رہے گا اور دوسرے صحیح و سالم
اعضاء میں بھی اس کے زہر کے سرایت کرنے کا اندیشہ ہوگا اس لئے بہتر یہی ہے
کہ اسے موت کی سزا دے کر اس کی اور سوسائٹی کی مصیبت کا بیک وقت خاتمہ
کر دیا جائے۔　　(ص ۵۰-۵۱)

ان تصریحات سے ہم صرف یہ بتانا چاہتے تھے کہ جہاں قرآن کی رو سے انسانی زندگی کی

اثباتِ جرم کا طریقِ کار

اس قدر اہمیت اور قیمت ہے وہاں ایسے جرائم بھی ہیں جن کی پاداش میں تبقاضائے عدل موت کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اگر یہ سزا عدل کی رو سے ہو گی تو اسے "قتلِ ناحق" نہیں کہا جائے گا لیکن اگر یہ عدل کے خلاف ہو گی تو یہ "قتلِ ناحق" قرار پائے گی۔ عام دنیاوی قوانین میں بھی انصاف اور ظلم کا یہی مفہوم ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جس قانون نے قتل اور بغاوت کی سزا موت (یا کسی جرم کی کوئی سزا) مقرر کی ہے اُسی قانون نے یہ بھی متعین کر دیا ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ کسی ملزم نے فی الواقع یہ جرم کیا ہے یا نہیں، کیا طریقِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ اس طریق کی تفاصیل کتنی ہی طویل اور مختلف کیوں نہ ہوں اس کے کم از کم اجزائے لاینفک حسبِ ذیل ہوں گے۔

(۱) قانون کی رُو سے قائم کردہ عدالت۔

(۲) عدالت کی طرف سے الزام کا تعین۔

(۳) ملزم کے لئے اپنی مدافعت کا پورا پورا موقع اور سہولت۔
(۴) بلا جبر و اکراہ شہادات۔
(۵) غیر مبہم فیصلہ —— اور
(۶) ماتحت عدالت کے فیصلہ کے خلاف اپیل کا حق۔

اگر کوئی فیصلہ ان شرائط و لوازم کے ساتھ صادر ہوتا ہے تو قانون کی رُو سے اس فیصلہ کو مبنی بر عدل کہہ دیا جائے گا۔ ایسے فیصلے کے نفاذ میں نہ کسی کی رعایت ہونی چاہیئے اور نہ ہی مجرم یا اس کے حامیوں کی طرف سے کوئی احتجاج۔ قرآن کا یہ فیصلہ ہے کہ قانون کے نفاذ اور سزا کے اجراء میں کوئی نرمی نہیں ہونی چاہیئے۔

عام عدالتوں کی صورت میں چونکہ مقدمات کی کارروائی کھلے طور پر ہوتی ہے۔ اس لئے یہ معلوم ہوتا رہتا ہے کہ جرم کے تعین اور فیصلہ میں مندرجہ بالا قانونی شرائط کو ملحوظ رکھا جا رہا ہے یا نہیں؛ لیکن لاہور میں مارشل لاء کی فوجی عدالت

مارشل لاء

نے جس انداز سے مختلف مقدمات میں فیصلوں کا اعلان کیا ہے ان سے پبلک کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ سزا کے فیصلوں تک پہنچنے کے لئے مندرجہ صدر قانونی تقاضوں کو پورا کیا گیا ہے یا نہیں! چونکہ ہمارے ملک کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ شہری آبادی کے ملزموں کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمات کی کارروائی ہوئی، اس لئے دلوں میں یہ شبہات پیدا ہونے لازمی تھے کہ نہ معلوم فوجی عدالت نے ملزموں کو اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے پورے مواقع دیئے ہیں یا نہیں اور کیا یہ مواقع اُسی نوعیت کے تھے جس نوعیت کے مواقع ملک کی عام عدالتوں میں ملتے ہیں یا ان کی نوعیت مختلف تھی۔

یہ تھی وہ وجہ جس کی بناء پر نیازی صاحب اور مودودی صاحب کی سزائے موت کی خبریں ہمارے لئے وجہ صد اضطراب بن گئیں اور صرف ہمارے لئے ہی نہیں بلکہ پورے ملک کے لئے ہمارے نزدیک ان فیصلوں کا اس طرح دفعتہً (ABRUPTLY) اعلان کرنا غلطی تھی۔ عام عدالتوں میں مقدمات کی کارروائی روز بروز لوگوں کے سامنے آتی جاتی ہے۔ استغاثہ اپنی شہادات اور دلائل پیش کرتا ہے۔ ملزم اپنی صفائی میں شہادات اور دلائل پیش کرتا ہے۔ الزام اور صفائی کے دونوں پہلو لوگوں کے سامنے آتے جاتے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ نفسیاتی طور پر اس کا فیصلہ سننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اس کے بعد سخت سے سخت سزا کا فیصلہ بھی ان کے لئے حیران کن اور اضطراب انگیز نہیں ہوتا۔ اضطراب انگیز ہونا تو ایک طرف بعض مقامات میں جرم کی سنگینی اور ملزم کی ثقاوت اس طرح نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے کہ پبلک خود پکار اٹھتی ہے کہ مجرم کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔

حکومت کی غلطی

لیکن اس کے برعکس ذرا اس صورت حال کو ملاحظہ کیجئے کہ ایک دن خبر ملی کہ مودودی صاحب کو گرفتار کر لیا گیا ہے دوسری خبر یہ آئی کہ انہیں قلعہ سے سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا ہے اور اس کے بعد ایک صبح دفعتہً یہ خبر آگئی کہ انہیں سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا ہے آپ سوچئے کہ کیا ملک بھر میں کوئی ایک شخص بھی ایسا ہو سکتا ہے جو اس قسم کی بھیانک خبر کو یوں دفعتہً سُنے اور اس کا دل ہمہ تن اضطراب نہ بن جائے۔ فوجی عدالت نے جب ان ملزمین (نیازی صاحب اور مودودی صاحب) کو انتہائی سزا دی ہے تو اس کے باور کرنے کے امکانات ہیں کہ ان سے ضرور کوئی نہ کوئی سنگین جرم سرزد ہوا ہوگا۔ یہ ماننے کو جی ہی

نہیں چاہتا کہ ان کا کوئی بھی جرم نہ ہو (یا کوئی خفیف سا جرم ہو) اور انہیں موت کی سزا دے دی جائے۔ اگر حکومت لوگوں کو اُن کے جرم اور مقدمہ کی کارروائی سے مُطلع کرتی تو ہو سکتا تھا کہ عوام حکومت کے اس اقدام کو حق بجانب کہتے ہوئے اس کی پوری تائید کرتے لیکن حکومت نے اس نفسیاتی تقاضے کو نظر انداز کر کے کتنی بڑی غلطی کی کہ ایک ثانیہ میں پورے کے پورے ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں کی نگاہوں میں ملزم یکسر معصوم قرار پا گئے اور حکومت جابر و ظالم نظر آنے لگ گئی۔ حکومت کی اس غلطی کے نتائج اس قدر دور رس ہیں کہ اس کا اندازہ اس وقت لگایا ہی نہیں جا سکتا۔

دوسری غلطی

پھر سزائے موت کے اعلان کے چھتیس گھنٹے بعد جب کہ ملک میں چاروں طرف اس کے خلاف ناراضگی کے جذبات ابھر چکے تھے، لاہور سے اعلان ہوا کہ اس سزا کو متبدل بہ سزائے قید کر دیا گیا ہے۔

اس اعلان میں بھی قطعاً یہ نہیں بتایا گیا کہ پہلے کس جُرم کی پاداش میں سزائے موت دی گئی تھی اور اب اسے کیوں بدلا گیا ہے۔ اس سے کچھ لوگ تو اس نتیجے پر پہنچے کہ سزائے موت کا فیصلہ یوں ہی اندھا دھند کر دیا گیا تھا اور اب لوگوں کے شور مچانے پر حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے، اس لئے اس فیصلے کو بدل دیا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ مودودی صاحب کا جُرم کوئی بھی نہیں لیکن حکومت نے اب چودہ سال کی سزائے قید کا اعلان اس لئے کیا ہے تاکہ گورنمنٹ کی سُبکی نہ ہو اور بعض لوگوں نے یہ کہا کہ دیکھا ہم نے ذرا سا دباؤ ڈالا اور حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ یہ لوگ اب اسی تصور کے ماتحت مودودی صاحب کی غیر مشروط

رہائی کے لئے مطالبہ کر رہے ہیں۔

حیرت ہے کہ یہ سب کچھ ہماری اس نئی حکومت[1] کے عہد میں ہوا جس سے ملک کو بڑی خوشگوار توقعات وابستہ ہیں۔ حکومت کو چاہیئے تھا کہ وہ مودودی صاحب (اور نیازی صاحب) کے جرائم کی تفصیلات کا اعلان کرتی۔ پھر یہ بتاتی کہ انہیں اپنی صفائی کا پورا پورا موقع دیا گیا تھا۔ ان کی مدافعت یہ تھی، جرم یوں ثابت ہوا تھا۔ قانون کی رو سے اس جرم کی سزا یہ ہے۔ لہٰذا اس سزا کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اس فیصلہ کے خلاف یوں اپیل ہو سکتی ہے وقس علیٰ ذٰلک۔ نہ صرف یہ کہ حکومت نے یہ کچھ اُس وقت نہیں کیا بلکہ اس باب میں آج تک بھی (جبکہ یہ سطور سپردِ قلم کی جا رہی ہیں) حکومت کی طرف سے ایک لفظ باہر نہیں آیا، حالانکہ مودودی صاحب کی سزا کے خلاف احتجاج کا سلسلہ جاری ہے۔

جماعتِ اسلامی کا طرزِ عمل

یہ تو ہوا حکومت کی طرف سے۔ اب دوسری طرف آیئے۔ جماعتِ اسلامی کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ صالحین کی جماعت ہے۔ ان کا ہر قدم خدا اور رسول کے حکم کے مطابق اٹھتا ہے۔ اس جماعت کے سامنے لاہور کی فوجی عدالت نے سیکڑوں مسلمانوں کو پکڑا۔ انہیں اسی طرح سے سزائیں دیں جس طرح بعد میں مودودی صاحب کو سزا دی۔ حتّٰی کہ مودودی صاحب سے پہلے نیازی صاحب کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ لیکن اس جماعت میں سے کسی نے اتنا بھی نہیں کہا کہ یہ طریقِ کار اسلامی آئین کے خلاف ہے۔ اس سے لوگوں

---

[1] مسٹر محمد علی (وزیرِ اعظم پاکستان) کی جدید کابینہ سے مراد ہے جو اواخر ۱۹۵۳ء میں قائم ہوئی تھی۔

کے ساتھ عدل نہیں ہوتا، ظلم ہوتا ہے لیکن جوں ہی ان کے اپنے امیر کے خلاف فیصلہ صادر ہوا، چاروں طرف سے شور مچا دیا گیا کہ فوجی عدالت کا یہ فیصلہ اسلام کے آئینِ عدل کے خلاف ہے۔ اس لئے مودودی صاحب کی سزا کو برطرف کر کے انہیں رہا کرنا چاہیئے۔ یعنی جب وہی کچھ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا تھا تو یہ سب لوگ خاموش بیٹھے تھے لیکن جب وہی کچھ خود اُن کے اپنے امیر کے ساتھ ہوا تو حکومت اور اس کی ساری کارروائی خلافِ اسلام قرار پا گئی۔ اب بھی ان کا مطالبہ یہ نہیں کہ مارشل لاء کے تمام قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ ان کا مطالبہ صرف اپنے امیر کی رہائی کا ہے۔ اس کی ایک قانونی صورت یہ ہو سکتی تھی کہ باقاعدہ رحم کی درخواست کی جاتی۔ مگر یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے، رحم کی درخواست پیش کرنے میں سب سے بڑا مانع خود مودودی صاحب کا یہ فیصلہ ہے کہ:-

> ایک اسلامی حکومت میں خلیفہ یا امیر کا یہ منصب نہیں کہ وہ مجرموں کو عدالت کی دی ہوئی سزا سے محض رحم کی بنا پر معاف کر دے۔ (دستوری تجاویز صفحہ ۱۸)

لہٰذا رحم کی درخواست کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہاں رائے عامہ کے مظاہرہ کے زور پر رہائی کا مطالبہ ہے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ ان کا مطالبہ یہ نہیں کہ یہ بتایا جائے کہ مودودی صاحب کا کیا جرم ہے اور اُنہیں اپنی مدافعت کا موقع دیا گیا تھا یا نہیں۔ یہ بھی مطالبہ نہیں کہ انکے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ مطالبہ یہ ہے کہ انہیں فوراً رہا کر دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ مودودی صاحب کا کوئی جرم ثابت ہو چکا ہو اور وہ اپنی بریت ثابت نہ کر سکے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے خلاف کوئی سنگین الزام ہو لیکن انہیں اپنی مدافعت کا پورا پورا موقع نہ مل سکا ہو۔ ان حالات میں مطالبہ یہ ہونا چاہیئے کہ

ان کے مقدمہ کی تفصیلات شائع کی جائیں اگر اس کے بعد دیکھا جائے کہ اس میں کوئی قانونی اسقام رہ گئے ہیں تو اس کی دوبارہ سماعت کی جائے نہ یہ مطالبہ کہ بلا تفریق اس امر کے کہ وہ مجرم ہیں یا نہیں ہیں انہیں بہرحال رہا کر دیا جائے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مودودی صاحب مجرم نہیں ہیں اور ان کے خلاف ظلم ہو رہا ہے یا انہیں مدافعت کا حق نہیں دیا گیا تو انہیں یہ حق دلانے کی تائید میں طلوع اسلام پیش پیش ہوگا۔

ایک بات البتہ ایسی ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس مطالبہ کی بنیاد اسلامی جماعت کے اس تصور پر ہے کہ موجودہ حکومت کو حق حاصل نہیں کہ وہ تخریبی قوتوں کے خلاف جبر کا استعمال کرے۔ آپ یہ دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب کے نزدیک ایک مملکت کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے تحفظ کے لئے جابرانہ قوت استعمال کر سکے اور جو اجزا اس کی تخریب پر آمادہ ہوں ان کی آزادی پر پابندیاں عائد کر دے لیکن مودودی صاحب نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا ہے کہ یہ حق ہر ایک مملکت کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

مودودی صاحب کا فیصلہ

> البتہ یہاں اس حقیقت کو پھر ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ جماعتی نظم کے لئے اس تدبیر کو صحیح قرار دینے کا مطلب یہ نہیں کہ ہر جماعتی نظم کے لئے اس تدبیر کا استعمال برحق ہے قطع نظر اس کے کہ وہ بجائے خود صالح ہو یا فاسد۔ یہ حق صرف اس جماعتی نظم کے لئے ہے جو اپنی ذات میں صالح ہو۔ رہا ایک فاسد نظام تو جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، اس کا وجود بجائے خود ایک ظلم ہے اور اگر وہ اپنے اجزا کو سمیٹے رکھنے کے لئے جابرانہ قوت استعمال کرے

تو یہ اس سے زیادہ بڑا ظلم ہوگا۔ (مرتد کی سزا صلا)

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

یہ قاعدہ اپنی جگہ عالمگیر مقبولیت رکھتا ہے کہ ریاست اور حاکمیت کی عین فطرت اس امر کی مقتضی ہے کہ اسے اپنے وجود اور اپنے نظام کی حفاظت کے لئے جبر اور قوت کے استعمال کا حق حاصل ہو۔ یہ حقِ ریاست من حیث الریاست کا ذاتی حق ہے اور اگر کوئی چیز اس حق کو باطل بنا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جو ریاست اس حق سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہو وہ آپ ہی باطل پر قائم ہوئی ہو۔ اس لئے کہ باطل کا وجود بجائے خود ایک جرم ہے اور اگر وہ اپنے قیام و بقا کے لئے طاقت سے کام لیتا ہے تو یہ شدید تر جرم ہو جاتا ہے۔

(صہ ۶۵-۶۶)

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہے کہ جماعتِ اسلامی کے نزدیک صرف ایک صالح نظام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خلاف بغاوت کی کوششوں کو قوت سے دبائے۔ فاسد نظام کو قوت استعمال کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ان حضرات کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ کوئی نظام صرف اُس وقت صالح ہو سکتا ہے جب اس کا آئین ان کی تعبیر کے مطابق شرعی ہو۔ چونکہ ابھی تک پاکستان کا نظام شرعی نہیں اس لئے جماعتِ اسلامی کے تصوّر کے مطابق موجودہ حکومت کا نظام فاسد ہے اور اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بغاوت کی کوششوں کو دبانے کے لئے قوت کا استعمال کرے۔ ہمارا خیال ہے کہ جماعت اسلامی کا یہ مطالبہ کہ مودودی صاحب کو فوراً رہا کر دیا جائے اسی بنیاد پر ہے کہ ان کے نزدیک موجودہ حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ تخریبی عناصر کے خلاف

قوت کا استعمال کرے۔ اگر ہمارا خیال غلط ہے تو جماعت اسلامی کو چاہیئے کہ وہ کھلے کھلے الفاظ میں اعلان کرے کہ ان کے نزدیک:۔

(۱) موجودہ حکومت کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ موجودہ نظام کے خلاف تخریبی قوتوں کو بجبر روک دے ـــــ اور

(۲) ان کا یہ مطالبہ کو مودودی صاحب کو فوراً رہا کر دیا جائے کس بنیاد پر اٹھایا گیا ہے؟

اس وقت بہرکیف صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف حکومت خاموش بیٹھی ہے اور لوگوں کو یہ نہیں بتاتی کہ مودودی صاحب کا جرم کیا ہے جس کی پاداش میں انہیں چودہ سال کی سزائے قید دی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی نگاہوں میں مودودی صاحب بے گناہ، لہٰذا مظلوم قرار پا رہے ہیں اور حکومت ظالم و جابر سمجھی جا رہی ہے۔ دوسری طرف اسلامی جماعت مودودی صاحب کی غیر مشروط رہائی کے محضر ناموں پر لوگوں سے دستخط لئے جا رہی ہے اور کسی کو کھلے کھلے الفاظ میں نہیں بتاتی کہ اس مطالبہ کی بالآخر اسلامی بنیاد کونسی ہے۔

لوگوں سے کہا یہ جاتا ہے کہ مودودی صاحب کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ ملک میں شریعت کا نظام نافذ کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور حکومت طرح طرح کے بہانوں سے انہیں ختم کر دینا چاہتی ہے۔ ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ کے پاس اس دعوے کی دلیل کیا ہے کہ مودودی صاحب کا کوئی اور جرم نہیں لیکن اس باب میں بھی حکومت کی خاموشی اسلامی جماعت کے اس مطالبہ کی تقویت کا موجب بنتی چلی جا رہی ہے۔

مؤیدین کا مسلک

اب دیکھئے اُن لوگوں کو جو اس مطالبہ میں اسلامی جماعت کے ہم نوا ہیں۔ ان میں سب سے پہلے خواجہ ناظم الدین صاحب نے بیان دیا کہ مودودی صاحب کو سزائے موت نہیں دی جانی چاہیے اور اس کی دلیل یہ پیش کی کہ مودودی صاحب ایک بہت بڑے عالمِ دین ہیں۔ ذرا اس دلیل کی معقولیت پر غور فرمائیے انہوں نے اس بات سے بحث ہی نہیں کی مودودی صاحب مجرم ہیں یا نہیں۔ انہوں نے صرف یہ کہا کہ وہ ایک بہت بڑے عالم ہیں اس لئے انہیں چھوڑ دیا جائے۔ یعنی اگر ایک عالم کسی کو قتل بھی کر دے تو اُسے کبھی سزائے موت نہیں دینی چاہیئے کیونکہ وہ بہت بڑا عالم ہے۔

انہی حمایت کرنے والوں میں کچھ حضرات ان اکتیس علماء میں سے بھی ہیں جنہوں نے نظامِ شریعت مدوّن فرما کر حکومت کے پاس بھیجا تھا انہوں نے بھی مطالبہ کیا ہے کہ چونکہ مودودی صاحب ایک بہت بڑی دینی شخصیت کے مالک ہیں اس لئے انہیں فوراً رہا کر دیا جائے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے اپنے مسَوّدۂ آئین میں اس کا مطالبہ کیا تھا کہ اور تو اور صدرِ مملکتِ پاکستان کو بھی قانون کی رُو سے کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہونی چاہیئے۔ قانون کی نگاہ میں چھوٹا اور بڑا سب یکساں ہونا چاہیئے۔ ان حضرات نے مارشل لاء کے سینکڑوں غریب سزا یافتہ لوگوں کے متعلق تو ایک لفظ تک نہیں کہا لیکن مودودی صاحب کی رہائی کا مطالبہ کر دیا کیونکہ وہ ایک نامور شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ ہے ان حضرات کا اسلام!

مودودی صاحب کی رہائی کا مطالبہ کراچی کے اٹھارہ مدیرانِ اخبارات و رسائل کی طرف سے بھی پیش ہوا ہے اس مطالبہ کی تمہید میں یہ لکھا ہے کہ:-

ہم باشندگانِ پاکستان اس واقعہ کو ایک حادثۂ فاجعہ قرار دیتے ہیں کہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ صاحب مودودی جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں ایک جیّد عالم ہیں اور ایک آئینی جماعت کے لیڈر ہیں، انہیں مارشل لا کے ماتحت گرفتار کرلیا گیا ہے اور فوجی عدالت نے ان پر مقدمہ چلایا اور انہیں سزائے موت دیدی جواب چودہ سال کی قید بامشقت کی سزا میں تبدیل کی گئی ہے۔

یعنی اگر لاہور کے سیکڑوں غریب آدمیوں کو جو کسی شہرت کے مالک نہیں تھے جو جاہل تھے، عالم نہیں تھے۔ جو کسی بڑی جماعت کے لیڈر نہیں تھے، مارشل لا کے تحت گرفتار کیا گیا اُن پر فوجی عدالت نے مقدمہ چلا کر انہیں سخت سزائیں دیں۔ تو ہمارے ان مُدیرانِ کرام کے نزدیک یہ سب کچھ کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں تھا۔ لیکن ایک بین الاقوامی شہرت کے مالک، بہت بڑے عالم اور ایک بڑی جماعت کے لیڈر کو اسی طرح گرفتار کرکے سزا دینا قیامتِ صغریٰ ہے۔

بہت بڑی شخصیت کے مالک

آپ غور کیجئے کہ ہم جذبات کی رَو میں بہہ کر کیا کچھ کہنے لگ جاتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو صبح و شام، اٹھتے بیٹھتے پکارتے رہتے ہیں کہ قانون کی نگاہ میں تمام افرادِ انسانیہ یکساں ہونے چاہئیں۔ غریب اور امیر، مشہور و مجہول اور لیڈر اور عامی میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن اب یہی حضرات ہیں کہ وہ مودودی صاحب کی رہائی کے لئے دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ وہ بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔ ایک متمدن معاشرہ اور سرزمینِ بے آئین میں فرق یہ ہوتا ہے کہ متمدن معاشرہ میں غریب اور امیر، عوام اور خواص قانون کی نگاہ میں یکساں ہوتے ہیں لیکن سرزمینِ بے آئین میں غریب

کو سزائیں بھگتنی پڑتی ہیں لیکن نامور شخصیتیں قانون کی گرفت سے باہر رہتی ہیں۔ یا تو اُن پر کوئی ہاتھ ہی نہیں ڈالتا اور اگر وہ کہیں ماخوذ ہو جاتے ہیں تو انہیں باہر سے دباؤ ڈال کر چھڑا لیا جاتا ہے یہ تھا وہ بنیادی فرق جس کی طرف رسول اللہ صلعم نے اُس وقت توجہ دلائی تھی جب ایک نامور قبیلے کی عورت نے چوری کی اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سفارش فرمائی کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ اس پر آپ نے سخت غصہ سے فرمایا کہ تم لوگ وہی کرنے لگے ہو جو اُن لوگوں میں ہوتا ہے جہاں قانون کا کوئی احترام نہیں ہوتا۔ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی کوئی جرم کرے تو میں اسے بھی پوری پوری سزا دوں گا۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا یہ مطالبہ کہ ایک شخص کو محض اُس لئے چھوڑ دیا جائے کہ وہ بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے (بالخصیص اس امر کے کہ اُس نے جرم کیا ہے یا نہیں؟) کسی سرزمین بے آئین کی روش ہے یا اُس ملک کا مسلک جس میں قانون کا احترام ہو۔

ان مدیران کرام کے علاوہ بعض علمائے مصر و شام (اور مفتی اعظم فلسطین) کی طرف سے بھی مطالبہ موصول ہوا ہے کہ مودودی صاحب کو فوراً رہا کر دیا جائے۔ انہوں نے بھی اس مطالبہ کے لئے کوئی دلیل نہیں دی، نہ شرعی نہ عام قانونی۔ مطالبہ کی بنیاد صرف اس پر ہے کہ مودودی صاحب بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔ یہاں بھی صرف جذبات سے کام لیا گیا ہے، دلیل و برہان کی رُو سے کچھ نہیں کہا گیا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ مودودی صاحب کی رہائی کے متعلق جو مطالبات اس وقت تک پیش ہوئے ہیں ان کی بنیاد صرف اتنی ہے کہ وہ ایک بڑی شخصیت کے مالک ہیں لیکن یہ دیکھئے کہ اس بارے میں خود مودودی صاحب کا کیا ارشاد ہے۔ وہ اپنی کتاب (مرتد کی سزا) میں اس امر پر بحث کرتے ہوئے کہ جو شخص کسی سوسائٹی یا اسٹیٹ میں تخریب

کا باعث بنتا ہے اُسے موت کی سزا دے دینی چاہیئے۔ لکھتے ہیں کہ:-

"اس کی انفرادی ہستی خواہ کتنی ہی قیمتی ہو مگر بہرحال وہ اتنی قیمتی نہیں ہو سکتی کہ سوسائٹی کے پورے نظام کی خرابی اُس کی خاطر گوارا کی جائے۔ (صفحہ ۵)

(۱)

غلط فہمیاں

بہرحال یہ ہے اِس وقت تک کی صورتِ حالات۔ ایک طرف گورنمنٹ بالکل خاموش بیٹھی ہے اور کچھ نہیں بتاتی کہ مودودی صاحب کا جرم کیا تھا جس کی پاداش میں انہیں موت کی سزا دی گئی تھی اور اس کے بعد اس سزا کو متبدل بہ سزائے قید کیا گیا۔ گورنمنٹ کی اس خموشی کی وجہ سے مشہور یہ کیا جا رہا ہے کہ مودودی صاحب کا اس کے سوا کوئی جرم نہیں ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی شریعت کے مطابق نظام چاہتے ہیں اور گورنمنٹ بہانے تلاش کر کے ان کا گلا گھونٹنا چاہتی ہے تاکہ اس آواز کا بلند کرنے والا کوئی نہ رہے۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی کے قیم محترم اخلاق حسین صاحب نے ایک بیان میں فرمایا ہے۔

اس بیان کے ذریعہ ہم اُن حالات کی وضاحت کر دینا مناسب سمجھتے ہیں جس کے نتیجے میں آج مولانا مودودی کو موت کی سزا دی جا رہی ہے۔ جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی پر جھنجھلاہٹ کا اصل سبب دستورِ اسلامی کا مطالبہ ہے جسے روکنے کے لئے کبھی مولانا پر جہادِ کشمیر کو نقصان پہنچانے کا الزام لگا کر انہیں قید و بند میں ڈالا گیا اور کبھی جماعت کا تعلق بعض غیر ملکی جماعتوں اور حکومتوں سے جوڑنے کی فکر کی گئی۔ ان حربوں میں ناکام ہو جانے کے بعد اب آخر میں قادیانی تحریک سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا گیا۔ (اخبار "مسلمان" کراچی ۱۷ مئی ۱۹۵۳ء)

یہ ہیں وہ خیالات جن کی وجہ سے عوام کی ہمدردیاں مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کے ساتھ بڑھتی جارہی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن اٹھارہ مدیرانِ اخبارات نے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، اپنے بیان میں لکھ دیا کہ مودودی صاحب کی سزا سے مسلمانانِ عالم مجبوراً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ:۔

پاکستان میں تجدیدِ اسلام اور اس کے حیات بخش اصولوں کی تنفیذ کی کوشش جرم ہیں۔ (ڈان ٹائمز آف کراچی مورخہ ۸ / مئی ۱۹۵۳ء)

ان حالات کی بناء پر جذبات کی یہ رو دن بدن تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ اس سے جن خطرناک نتائج کا اندیشہ ہو سکتا ہے، اُن کی صراحت کی ضرورت نہیں۔ جب یہ اور زیادہ بڑھ گئے تو دو صورتوں میں سے ایک بہرحال ناگزیر ہو گی۔ یا تو گورنمنٹ کو اس قسم کے مطالبات کو بجبر روکنا پڑے گا جس کا نتیجہ بہرحال بدامنی ہوگا اور یا گورنمنٹ کو اس دباؤ کے سامنے جھکنا پڑے گا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک سے قانون کا رہا سہا احترام بھی ختم ہو جائے گا اور یہ خیال ہر شخص کے دل میں تقویت پکڑ جائے گا کہ یہاں جو دباؤ ڈال سکے وہی میدان مار لیتا ہے۔

---(o)---

ہونا کیا چاہیئے؟

ہمارے نزدیک مسئلہ بڑا آسان اور صاف ہے بشرطیکہ اسے جذبات سے الگ ہٹ کر اور شخصیتوں اور جماعتوں کی مرعوبیت سے غیر متاثر رہ کر سوچا جائے۔ پنجاب کے گرفتار شدگان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں مارشل لاء کے نافذ ہونے سے پہلے عام شہری قانون کی رُو سے گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کے متعلق ہماری حکومت سے یہ درخواست ہے کہ ان کے

مقدمات پر (بالتخصیص ادنیٰ واعلیٰ) نظرِ ثانی کی جائے اور جو سادہ لوح مسلمان دوسروں کی انگیخت سے قانون شکنی کے مرتکب ہوئے تھے اُن کی سزاؤں پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔ جو لوگ مارشل لاء کے دوران میں گرفتار کئے گئے تھے اُن میں سے کچھ لوگ وہ ہوں گے جو خود مارشل لاء ہی کی کسی شق کی خلاف ورزی کے جرم میں ماخوذ ہوئے ہوں، مثلاً کرفیو کے اوقات میں گھر سے باہر نکل آنا یا صفائی وغیرہ کے سلسلے میں کسی جرم کا مرتکب ہو جانا۔ ان کی سزاؤں پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک کے لوگ اتنے تادیب یافتہ کہاں ہیں کہ وہ ایک ہی دن میں مارشل لاء جیسے سخت گیر قانون کے مقتضیات وعواقب سے واقف ہو جائیں۔ اس کے بعد تیسرا طبقہ اُن لوگوں کا رہ جاتا ہے جنہوں نے مارشل لاء سے پہلے یا مارشل لاء کے دوران میں ایسے جرائم کا ارتکاب کیا جو عام شہری قانون کی رُو سے بھی سنگین جرم قرار پاتے ہوں (مثلاً قتل یا بغاوت وغیرہ) ہمیں معلوم نہیں کہ ایسے مقدمات میں فوجی عدالتوں کا طریقِ کار کیا ہے اگر وہاں ملزم کو اپنی صفائی پیش کرنے کی اسی طرح سہولتیں ملتی ہیں جس طرح عام ملکی عدالتوں میں اور مقدمات کے فیصلے بھی اسی انداز سے ہوتے ہیں تو پھر اس باب میں کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں سوائے اس کے کہ اس امر کا اعلان کیا جائے کہ فلاں فلاں ملزم کے خلاف یہ الزام تھا اور اس طرح صفائی کا موقع دیا گیا اس کے بعد اس کا جرم ثابت ہوا اور اُسے قانون کے مطابق سزا دی گئی۔ اب اس سزا کے خلاف یوں اپیل ہو سکتی ہے یا اس طرح رحم کی درخواست گزرائی جا سکتی ہے اگر اس ضمن میں کوئی تفاصیل ایسی ہوں کہ جن کا اعلان کرنا مملکت کے مفاد کے خلاف ہو تو اس امر کی بھی تصریح کر دی جائے کہ یہ راز کی باتیں ہیں اِن کو افشا نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اگر توجی عدالت میں مقدمات فیصل کرنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ وہاں ملزم کو اپنی صفائی پیش کرنے کے پورے پورے مواقع میسّر نہیں تھے تو اس صورت میں ہم بزور درخواست کریں گے کہ ان مقدمات کی سماعت عام عدالتوں میں کی جائے۔

مساوات

سب سے آخری درخواست یہ ہے کہ حکومت جو کچھ بھی فیصلہ کرے، وہ امیر اور غریب چھوٹے اور بڑے، عالم اور جاہل، لیڈر اور عامی سب کے لئے یکساں ہو۔ اس معاملہ میں اضافی نسبتوں کی بناء پر ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی تفریق کرنا اُس فسادِ آدمیت کی بنیاد رکھنا ہے جو ہمیشہ تباہی اور بربادی کا موجب ہوا کرتا ہے۔ ہماری یہی درخواست حکومت سے ہے اور یہی درخواست اُن حضرات سے جو اِن ملزموں کے لئے ہمدردی کے جذبات اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ "ہر فرزندِ آدم" کے لئے یکساں عدل و انصاف کا مطالبہ ہونا چاہیے نہ کہ خاص خاص شخصیتوں کے لئے کسی امتیازی سلوک کا مطالبہ۔ خدا کی میزان میں ایک گھوسی کی زندگی، جس کا اس وقت کوئی نام تک نہیں جانتا اُتنی ہی زیادہ قیمتی ہے جتنی کسی بین الاقوامی شہرت رکھنے والے لیڈر کی یا کسی اور مملکت کے وزیرِ اعظم یا بادشاہ کی۔ اس لئے کہ

خونِ شہ رنگین تر از معمار نیست!

اور ایک درخواست حکومت سے یہ بھی ہے کہ جتنے لوگ اس تحریک میں مارے گئے یا قید و بند میں گرفتار ہیں ان کے پسماندگان یا متعلقین کی کفالت کا فوراً انتظام کیا جائے۔ اس لئے کہ اگر مجرم تھے تو وہ لوگ تھے اُن کے یتیم اور غریب بچوں اور بیویوں نے تو کوئی جرم نہیں کیا تھا جس کی پاداش میں انہیں فقر و فاقہ کی مسلسل سزا دی جائے۔ وہ بچے ہمارے اپنے بچے ہیں اور پاکستان کی بننے والی قوم انہیں سے

عبارت ہو گی۔

خدا کرے کہ ہماری ان گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور جو مشورے ہم نے پیش کئے ہیں انہیں جذبات کے شعلوں میں جلا دینے کے بجائے عقل و دانش کی میزان میں تولا جائے۔ اسی میں حکومت، ملک، قوم اور متعلقہ حضرات کی بہبودی اور خیر سگالی ہے۔

—— (•) ——

(۴) طلوعِ اسلام اور جماعت اسلامی

(اکتوبر ۱۹۵۳ء)

پنجاب سے ایک صاحب لکھتے ہیں:

"مجھ سے کافی احباب نے یہ شکایت کی ہے کہ طلوعِ اسلام نے جماعت اسلامی اور مودودی صاحب کے خلاف جو مہم چلا رکھی ہے اس کی وجہ سے وہ اپنا وقار اور مقبولیت کھو رہا ہے۔ یہ عام طبقے کی رائے ہے کہ ایسے نازک وقت میں طلوعِ اسلام کو اتنی سختی سے جماعتِ اسلامی کے خلاف قدم نہیں اٹھانا چاہیئے تھا جبکہ پنجاب میں مرزائیوں کے خلاف ایک مہم چلائی گئی۔ کافی اصحاب نے محض اس پالیسی سے تنگ آکر طلوعِ اسلام کا مطالعہ ترک کر دیا ہے۔

دوسرے طلوعِ اسلام نے قادیانیت کے خلاف کچھ بھی تو حصہ نہیں لیا۔ حالانکہ وہ ایک ایسی تحریک کا نقیب ہے جس کا اولین اور بڑا مقصد ہی ایسی جماعتوں کے خلاف ہے۔ اس نے پنجاب کے واقعات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

بلکہ الٹا مودودی صاحب کے خلاف اور تیزی سے لکھنا شروع کر دیا جس
سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت کے ایماء پر سب کچھ لکھا جا رہا ہے اِس
سے بھی طلوعِ اسلام کی تحریک کو دھکا پہنچ رہا ہے"۔

[اس اعتراض کے جواب میں پہلے ایک تمہید لکھی گئی تھی جسے اِس جگہ حذف
کر دیا جاتا ہے اِس کے بعد حسب ذیل سطور لکھی گئی تھیں :-]

طلوعِ اسلام کو جو قرآنی بصیرت عطا ہوتی ہے اس کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے
کہ مسلمانوں کو قرآن سے دور رکھنے کے لئے جو قوتیں مصروفِ عمل رہی ہیں (اور آج
بھی مصروفِ عمل ہیں) اُن میں ملائیت کا حصہ بہت بڑا نمایاں ہے۔ اس کے نزدیک
ملائیت قرآن اور مسلمان دونوں کی بدترین دشمن ہے اِس لئے طلوعِ اسلام ملائیت
کی مخالفت کو اپنی زندگی کا اوّلین فریضہ سمجھتا ہے۔ اس کا یقین ہے کہ شجرِ ملت
کبھی سرسبز و شاداب نہیں ہو سکتا جب تک اس کے اوپر سے اِس آکاس بیل کو
اتارا نہیں جائے گا۔

اس سلسلے کی اگلی کڑی یہ ہے کہ ہمارے نزدیک پاکستان میں ملائیت اپنی
سب سے زیادہ خطرناک شکل میں جماعتِ اسلامی کے پیکر میں پلٹے کو رہی ہے۔

جماعتِ اسلامی کے حربے

اس لئے کہ اس جماعت کے مقصد سیاسی ہیں
اور حربے ملائیت کے۔ ہم اس جماعت کو پاکستان
اور اسلام دونوں کی دشمن سمجھتے ہیں۔ پاکستان کی دشمن اس لئے کہ یہ لوگ تحریک
پاکستان کے دوران میں پاکستان کی سخت مخالفت کرتے رہے۔ اب پاکستان
کے ساتھ ان کی دلچسپی اتنی ہے کہ وہ زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔

اگر انہیں آج یقین ہو جائے کہ ان کا یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تو اس کے بعد انہیں اس کی قطعاً پرواہ نہیں ہوگی کہ پاکستان رہتا ہے یا جاتا ہے۔

اور اسلام کی دشمنی اس لئے کہ اگر یہاں زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ میں آگئی تو پھر یہاں قرآن کے نافذ العمل ہونے کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ مسلمانوں کی تیرہ سو سال کی تاریخ بتا رہی ہے کہ ملّا نے ہمیشہ مسلمان کو قرآن سے دور رکھا ہے، (اس لئے کہ قرآن آجانے سے ملّا باقی نہیں رہتا) نہ صرف قرآن سے بلکہ عقل و بصیرت سے بھی دور۔ اگر پاکستان میں قوت ملّا کے ہاتھ میں آگئی تو یہاں ظلم و استبداد کا وہی نقشہ قائم ہو جائے گا جو ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ میں شرعی احتساب (INQUISITION) کے ہاتھوں قائم ہوا تھا۔ ہم یہ کچھ محض قیاساً نہیں لکھ رہے، برہانِ دلیل و شہادت لکھ رہے ہیں۔ آپ مودودی صاحب کی کتاب "اسلام میں مرتد کی سزا" کا مطالعہ[1] کیجئے۔ آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ انہوں نے ابھی سے فتویٰ دے دیا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہر وہ مسلمان مرتد سمجھا جائے گا جس کے متعلق اربابِ شریعت "یہ فیصلہ کر دیں کہ اس کے عقائد" دینِ حقّہ" کے مطابق نہیں ہیں۔ اور اس چیز کو وہ پاکستان کے دستور میں شامل کرانا چاہتے ہیں کہ امورِ شرعی میں آخری فیصلہ "علمائے کرام" کے ہاتھ میں ہوگا۔ ذرا سوچئے کہ اس صورتِ حالات کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

اب ہمارا روئے سخن ان حضرات کی طرف ہے جو مندرجہ بالا نتائج سے متفق

---

[1] اس کا جواب طلوعِ اسلام کی طرف سے "قتلِ مرتد، غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت" کے نام سے شائع شدہ کتاب میں دیا گیا تھا۔

ہیں اور سب کچھ سوچ اور سمجھ لینے کے بعد طلوعِ اسلام کے رفقائے سفر ہیں۔ ہمیں ان حضرات کی رفاقت پر ناز ہے۔ ہم ان کے اخلاص کا احترام کرتے ہیں۔ ان کے ذوق قرآنی کی ہماری نگاہوں میں بڑی قدر ہے۔ ان کے مشورے ہمارے لئے چراغِ راہ اور ان کی نیک آرزوئیں ہمارے لئے زادِ سفر ہیں۔ ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ کیا ان کے نزدیک اتنے بڑے خطرے کے سدِ باب کے لئے جس کی تصریح اوپر کی جاچکی ہے، یہ کافی ہوگا کہ طلوعِ اسلام کبھی کبھار سرِ راہے جماعتِ اسلامی کی سرگرمیوں کا ذکر کر دیا کرے۔ جماعتِ اسلامی کے پروپیگنڈے کا یہ عالم ہے کہ بستی بستی، قریہ قریہ، گاؤں گاؤں ان کے مراکز موجود ہیں جن میں چلتے پھرتے مبلغ کام کرتے رہتے ہیں۔ متعدد جرائد اور رسائل ان کی آواز کو اطراف واکنافِ مملکت بلکہ بیرونِ ملک تک

خطرے کی اہمیت

پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان کا لٹریچر گلی گلی، محلہ محلہ فروخت ہوتا ہے۔ اس تمام شور و شغب کے مقابلے میں ایک طلوعِ اسلام کی خفیف سی آواز ہے جو لوگوں کو ان کے خطرات سے آگاہ کر کے قرآن کی طرف دعوت دیتی ہے۔ کیا ان حالات میں آپ سمجھتے ہیں کہ طلوعِ اسلام کی طرف سے جماعتِ اسلامی کی مسلسل "مخالفت" زیادتی" ہے؟ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے طلوعِ اسلام کے مسلک کے دس روزنامے بھی ملک میں شائع ہوں، تو کم ہیں۔ جو لوگ طلوعِ اسلام میں جماعتِ اسلامی کی مسلسل مخالفت کو زیادتی سمجھتے ہیں، انہوں نے درحقیقت اس خطرے کی اہمیت اور اس کی ہمہ گیریت کا صحیح صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ جنہیں اس کا صحیح صحیح اندازہ ہے اُن کا بیتابانہ اصرار ہے کہ طلوعِ اسلام کو جلد از جلد روزنامہ میں تبدیل کیا جائے اور اس کے لٹریچر کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔

باقی رہا یہ کہ طلوعِ اسلام کو اس جماعت کی اس زمانہ میں مخالفت نہیں کرنی چاہئے تھی جب وہ حوادثِ پنجاب کے عواقب میں ماخوذ ہے، تو یہ آواز ٹھیک ان سطحی جذبات کی ترجمان ہے جسے (EXPLOIT) کرنے کے لئے یہ لوگ اس قسم کے مواقع پیدا کرتے رہتے ہیں اور پھر ان خطرات میں دیدہ ودانستہ کود پڑتے ہیں۔ اس قسم کے حربے جذباتی قوموں میں بڑے کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ مفاد پرست سیاسئین جب یہ خدشہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے نقاب باریک ہو رہے ہیں اور ان کی مقبولیت

حوادثِ پنجاب

میں فرق آرہا ہے تو یہ اپنے پارٹی پروگرام کو کچھ وقت کے لئے ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور کوئی ایسی تحریک شروع کر دیتے ہیں جو عام لوگوں میں مشترک ہو اور ان کے جذبات بھڑک اٹھیں۔ ایک تو عوام کا حافظہ ویسے ہی کمزور ہوتا ہے، پھر جذبات کی رو میں رہا سہا احساس بھی بہہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ لوگ ان کی پچھلی تاریخ (PREVIOUS HISTORY) کو بھول جاتے ہیں اور ان کے "زندہ باد" کے نعرے لگانے لگ جاتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ اپنی لیڈرشپ کی گرتی ہوئی عمارت کو از سرِ نو قائم کر لیتے ہیں۔ اور اگر اس کے ساتھ حکومت کا جرم تدبیر بھی شامل ہو جائے تو پھر ان کے "ہیرو" بننے میں کوئی کسر ہی نہیں رہ جاتی۔

یہی کچھ گذشتہ دنوں حوادثِ پنجاب کے سلسلے میں ہوا ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان لوگوں کی بساط آرائیوں اور مہرہ بازیوں اور اربابِ حل وعقد کی عاقبت نااندیشیوں اور غلط کوشیوں سے ان کے اقتدار کے گرتے ہوئے گنبد پھر سے استوار ہو گئے۔ اسی کا اثر ہے جو طلوعِ اسلام سے کہا جاتا ہے کہ اسے ان دنوں جماعتِ

اسلامی کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے تھی (یعنی ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ویسے تو جماعتِ اسلامی کی مخالفت ضروری ہے لیکن چونکہ ان دنوں ان کے لیڈر گرفتار ہو چکے ہیں اس لئے اب ان کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے بلکہ کہنا یہ چاہیئے کہ یہ لوگ اسلام کے سچے خادم ملت کے مخلص بہی خواہ اور پاکستان کے جاں نثار سپاہی ہیں۔ اس لئے ملت کو چاہیئے کہ انہیں اپنا ہیرو سمجھے!

طلوعِ اسلام سے یہ نہیں ہو سکے گا کہ وہ زہر کو اس لئے تریاق کہدے کہ اس پر شکر چڑھا کر SUGAR COATED بنا دیا گیا ہے۔ اس مقام پر تو اس کی آواز کو اور بلند ہو جانا چاہیئے تاکہ جو سادہ لوح انسان اس زہر کو شکر سمجھ کر کھا جانے پر آمادہ ہوں انہیں اس ہلاکت سے بچا لیا جائے۔ قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ مخالفین سے عدل کیا جائے۔ اگر آپ نے دیکھنا ہو کہ اس باب میں طلوعِ اسلام نے کس طرح اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر مودودی صاحب اور دیگر گرفتارانِ حوادثِ پنجاب کے لئے عدل کا مطالبہ کیا تھا، تو مودودی صاحب کی سزا کے متعلق جو مضمون شائع ہوا ہے، اُسے پڑھیئے آپ کو نظر آجائے گا کہ اس زمانہ میں جبکہ ہنوز لوگوں کے دلوں سے مارشل لاء کے خوف کا بھوت اترا نہیں تھا طلوعِ اسلام نے کس بیباکی سے مطالبہ کیا تھا کہ

طلوعِ اسلام کا مطالبہ

اگر مودودی صاحب کو ان کی مدافعت کا پورا پورا موقع دیئے بغیر سزا دیدی گئی ہے تو ان کا مقدمہ کسی سول عدالت میں از سرِ نو دائر ہونا چاہیئے جس میں انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کی اطمینان بخش سہولتیں میسر ہوں۔ یہ آواز سب سے پہلے طلوعِ اسلام کی طرف سے اٹھی تھی۔ ایک مخالف کے لئے عدل طلبی کی اس سے بڑھ کر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

لیکن اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ طلوعِ اسلام اُس دعوت اور مسلک کی مخالفت (جو جماعتِ اسلامی کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے) اس لئے چھوڑ دے کہ اُس کے چند ایک لیڈر گرفتار ہو چکے ہیں تو ہم نہیں سمجھتے کہ آپ کا یہ مطالبہ کس طرح جائز اور معقول قرار پا سکے گا۔ طلوعِ اسلام جماعتِ اسلامی کے لیڈروں کا مخالف نہیں۔ وہ مخالف ہے اُس دعوت اور تحریک کا جسے لے کر وہ جماعت اٹھی ہے۔ اس لئے جب تک وہ دعوت اور تحریک باقی ہے طلوعِ اسلام کی طرف سے اس کی مخالفت جاری رہے گی۔ اگر جماعتِ اسلامی کے لیڈر اور کارکن اس دعوت اور مسلک کو چھوڑ دیں، تو طلوعِ اسلام سب سے پہلے آگے بڑھ کر انہیں سینے سے لگا لے گا۔ طلوعِ اسلام اُس تحریک کی مخالفت کس طرح چھوڑ دے جسے وہ اپنی بصیرت کے مطابق قرآن اور پاکستان دونوں کے لئے خطرناک سمجھتا ہو قرآن، طلوعِ اسلام کے لئے رگِ حیات ہے اور پاکستان سے اسے محبت اس لئے ہے کہ وہ اس خطۂ زمین پر قرآن کے نظامِ ربوبیت کو متشکل دیکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا جو فرد، جماعت یا تحریک، قرآن اور پاکستان کی مخالف ہو، اُس کی مخالفت طلوعِ اسلام کی زندگی کا مقصد ہے۔ اگر وہ اپنے اس مقصد میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ اپنے دعوے سے غداری برتتا ہے اور اگر اسے بالکل چھوڑ دیتا ہے تو پھر اس کی ہستی کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

آپ لکھتے ہیں کہ طلوعِ اسلام نے قادیانیت کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ آپ بھول چکے

قادیانیت اور طلوعِ اسلام

ہوں تو آپ کو یاد دلایا جائے کہ طلوعِ اسلام کی طرف سے "احمدیت اور اسلام" کا پمفلٹ اُس

زمانہ میں شائع ہوا تھا جب "آینٹی قادیانیت" کی تحریک کسی کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھی۔ اس پمفلٹ کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ قادیانیت کی تردید میں اس سے بہتر دلائل کہیں اور بھی آپ کو مل سکتے ہیں۔ اس کے دلائل کی محکمیت کا یہ عالم ہے کہ آج تک مرزائی جماعت کو جرأت نہیں ہو سکی کہ اس کا جواب لکھ سکے۔ (اور آپ دیکھئے گا کہ میرزائی تحریک کو جب بھی شکست ہو گی انہیں دلائل وشواہد سے ہو گی جو اس پمفلٹ میں مذکور ہیں۔ ملا کے پیش کردہ دلائل تو اُلٹے اس کی تقویت کا موجب بن رہے ہیں۔)

اب رہا یہ کہ ہم نے "آینٹی قادیانیت" تحریک کے متعلق کچھ نہیں لکھا سو اس کے لئے طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۵۳ء کا عنوان "باچشم نم" دیکھئے جس میں ہم نے اجمالی طور پر سب کچھ لکھ دیا تھا اور تفصیلی طور پر لکھنے کو اُس وقت پر اٹھا رکھا تھا جب فضا میں سکون اور جذبات میں آثار پیدا ہو جاتے ہم ایسے وقت کے انتظار میں تھے کہ پنجاب انکوائری کمیٹی کا تعین ہو گیا اور یہ سارا قصہ اُن کی تحقیقات کے احاطہ کے اندر آ گیا۔ اس کمیٹی کی حیثیت عدالت کی سی ہے اس لئے اب اس کیس کے متعلق کچھ لکھنا دائرۂ عدالت میں مداخلت کے مرادف سمجھا جائے گا۔ لہٰذا ہم مجبور ہیں ہم اس مقام پر اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں ، اگر ہم اس کے متعلق تفصیل سے لکھتے تو آپ کی یہ شکایت کہ طلوعِ اسلام مودودی صاحب کی مخالفت میں زیادتی کر رہا ہے اور بھی بڑھ جاتی۔ اس سارے قضیہ میں سب سے زیادہ اہمیت مودودی صاحب کے رسالہ "قادیانی مسئلہ" کو دی جاتی ہے۔ ہمارے نزدیک اس رسالہ کے دلائل

لہ اس کے علاوہ طلوعِ اسلام میں میرزائیت کے خلاف بہت سے مقالات شائع ہو چکے ہیں۔

اس قدر پوچ ہیں کہ ان کا تجزیہ کیا جائے تو وہ خود احمدیوں کے حق میں چلے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر (اس عدالتی مجبوری کی بنا پر جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے) طلوعِ اسلام نے اس رسالہ کا تجزیہ نہیں کیا تو یہ چیز مودودی صاحب اور ان کے ہم نواؤں کے حق میں ہی گئی ہے۔ مرزائیت کے مسئلہ کی نوعیت یہ ہے کہ اگر اسے خالص قرآن کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو مرزا غلام احمد کی نبوّت تو ایک طرف ان کا اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔ (اور طلوعِ اسلام کا مسلک ظاہر ہے کہ یہ ہر مسئلہ کو خالص قرآنی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے) لیکن اگر اس مسئلہ کا فیصلہ روایات کی رو سے کیا جائے تو کوئی اعتراض ایسا نہیں جس کا جواب مرزائیوں کی طرف سے نہ دیا جا سکے روایات کی رو سے قریب ساٹھ ستر برس سے مرزائیوں کے ساتھ مناظرے اور مباحثے ہو رہے ہیں لیکن یہ مسئلہ گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح اپنے مقام سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا۔ اگر اس مسئلہ پر خالص قرآن کی روشنی میں بحث کی جاتی تو سارا قصہ چند منٹ میں طے ہو جاتا لیکن ہمارے مُلّا قرآن خالص کو اس لئے سامنے نہیں لاتے کہ اس کی رو سے اگر مرزائیت ختم ہو جاتی ہے تو اس کے ساتھ ملائیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

طلوعِ اسلام اور حکومت

اب رہا یہ کہنا کہ طلوعِ اسلام کی طرف سے جماعتِ اسلامی کی مخالفت حکومت کے ایماء سے ہو رہی ہے تو اس جماعت کی طرف سے یہ حربہ بھی کوئی نیا حربہ نہیں ہے۔ یہی کچھ یہ لوگ طلوعِ اسلام کے متعلق ہندوستان میں کہا کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں اُن کا کہنا یہ تھا کہ طلوعِ اسلام تحریکِ پاکستان کی حمایت (فلہذا جماعتِ اسلامی کی مخالفت) حکومت کے ایماء سے کرتا ہے۔

یعنی اس کے کہنے کے مطابق ہندوستان میں انگریز اور ہندو (جن کی وہاں حکومت تھی) یہ چاہتے تھے کہ پاکستان قائم ہو جائے اور جو شخص پاکستان کی حمایت کرتا تھا وہ حکام پرست تھا حکومت کے اشارے سے آزاد وہ لوگ تھے جو پاکستان کی مخالفت کرتے تھے۔ یہی کچھ جماعتِ اسلامی والوں نے یہاں کہنا شروع کر رکھا ہے۔ احراریوں کی بھی یہی ٹیکنیک ہوا کرتی تھی کہ جوں ہی کسی نے ان کی مخالفت کی انہوں نے شور مچا دیا کہ یہ میرزائی ہے اور جب وہ بیچارا چیخا چلایا کہ مجھے میرزائیت سے کوئی واسطہ نہیں تو کہہ دیا کہ میرزائی نہیں تو میرزائی نواز ضرور ہے۔ یہی حالت جماعتِ اسلامی کی ہے۔ جو شخص ان کی مخالفت کرے، وہ حکومت کا ایجنٹ ہے۔

"سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں"

ہمارا مسلک

بہر حال، یہ ہے جماعتِ اسلامی کی تحریک دعوت سے متعلق طلوعِ اسلام کا مسلک اور یہ ہے کہ اس کا نصب العین حیات

ہم تمام قارئینِ طلوعِ اسلام سے درخواست کریں گے کہ وہ اس مسلک کا غائر نگاہ سے مطالعہ کریں اور اس کے بعد فیصلہ کریں کہ وہ طلوعِ اسلام کے رفیقِ سفر ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ ہم ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے نظامِ زندگی کی عمارت خالص قرآنی بنیادوں پر اٹھنی چاہیئے۔ جو فرد یا جماعت اس بنیادی تصور کا مخالف ہے ہم پوری شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کریں گے خواہ وہ کسی گوشے سے بھی متعلق ہو۔　جو حضرات طلوعِ اسلام کے اس مسلک سے متفق ہیں، اُن کی رفاقت طلوعِ اسلام کے لئے فخر و ناز کا موجب اور تقویت، و نصرت کا باعث ہے۔ ہم اُن کے مشوروں کے شکرگزار

اور اُن کی تجاویز کے قدر دان ہیں لیکن جو لوگ اس اصل سے متفق نہیں اور نہ ہی اپنے اندر تلاشِ حقیقت کی تڑپ رکھتے ہیں وہ ہمارے رفیق نہیں بن سکتے، نہ ہمیں اُن کی نگاہوں میں مقبولیت حاصل کرنے کی خواہش ہے نہ عزت پانے کی تمنا۔ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا[۴/۱۳۹]
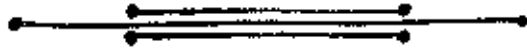
حرفِ آخر

گزشتہ صفحات میں جماعتِ اسلامی کے معتقدات وتصورات اور عزائم ومقاصد کے مختلف گوشے آپ کے سامنے آ گئے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان تمام کوششوں کا مقصد یہ ہے کہ یہ سطحی مذہبیت کے راستے عوام میں مقبول ہوتے جائیں اور اس طرح "خدا کی حکومت" کے مقدس نقاب میں اپنی ہوسِ اقتدار کو تسکین دے لیں، ان کی تضاد بیانیاں، جو آپ کے سامنے آ چکی ہیں، وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہیں کہ اور تو اور، مذہب کے معاملہ میں بھی یہ لوگ حسبِ موقع رنگ بدلنے سے نہیں ہچکچاتے۔

یہ کتاب مکمل ہو چکی تھی کہ ہمارے سامنے فساداتِ پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ آ گئی جس میں اس جماعت کے عزائم ومقاصد کو اچھی طرح بے نقاب کیا گیا ہے۔ عدم گنجائش مانع ہے کہ ہم اس رپورٹ کی تفصیلات پیش کر سکیں اس لئے ہم صرف چند اقتباسات پر اکتفاء کرتے ہیں۔ حکومتِ پنجاب کے ہوم سیکرٹری کے ایک خط میں لکھا ہے کہ

> جب دوسری جماعتوں، مثل جماعتِ اسلامی، اسلام لیگ اور شیعوں نے دیکھا کہ ختمِ نبوت کے سوال پر عوام کو اپنا ہم نوا بنانے میں احرار چپکے ہی چپکے ہم پر سبقت لے گئے ہیں، تو یہ بھی احمدیوں کی مخالفت میں ان کے ساتھ

مل گئے جماعتِ اسلامی نے اپنے آٹھ مطالبات میں ایک اور کا اضافہ کرلیا۔ (ص۱۱)
اس سوال کا ذکر کرتے ہوئے کہ فسادات میں حصہ لینے والی جماعتیں مرزائیوں کے متعلق مطالبات کو مذہبی مطالبات قرار دیتی تھیں، اس رپورٹ میں احرار اور جماعتِ اسلامی وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

> اگر ان مطالبات کی نوعیت مذہبی تھی اور مذہب ناقابلِ تغیّر و تبدّل ہے، تو یہ سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ آئیڈیالوجی جس کی بنیاد مذہب پر ہو کس طرح وقتاً فوقتاً اور موقع بہ موقع بدلتی رہتی ہے۔ (صفحہ ۱۵۸)

جماعتِ اسلامی کے متعلق اس رپورٹ میں جس آخری رائے کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے۔

> ہمارا خیال ہے کہ ہم ایسا سمجھنے میں جماعتِ اسلامی کی قلبی کیفیت کا صحیح صحیح مطالعہ کرسکے ہیں کہ اگرچہ یہ لوگ اس پروگرام میں یقین نہیں رکھتے تھے جو ڈائریکٹ ایکشن کی تنفیذ کے سلسلہ میں اختیار کیا گیا تھا انہیں اس کا ہر وقت خدشہ تھا کہ اگر انہوں نے اپنے خیالات کو ایمانداری اور صاف گوئی سے پبلک کے سامنے پیش کر دیا تو وہ ان میں نامقبول ہو جائیں گے۔ لہٰذا اپنی ذہنیت اور مسلک کے اعتبار سے یہ جماعت بھی کسی دوسری سیاسی شخصیت یا ادارہ سے مختلف نہیں تھی اور دوسروں کی طرح یہ بھی خائف تھے کہ ان سے کوئی ایسی چیز سرزد نہ ہونے پائے جس سے ان پر عوام کی طرف سے تنقید ہونے لگ جائے۔ (ص۲۵۳)

ہمارا خیال ہے کہ اس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔ اس جماعت کی ساری داستان ان چند الفاظ میں سمٹائی جاسکتی ہے کہ:-

حصولِ اقتدار کے لئے مذہب کی آڑ میں عوام کی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا۔

باقی رہا پاکستان، تو اس سے انہیں اتنی ہی دلچسپی ہے کہ اگر اس کی حکومت ان کے ہاتھ میں آسکتی ہے تو یہ باقی رہے اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو یہ جہنم میں جائے تاکہ یہ اس کے بعد لوگوں سے کہہ سکیں کہ ہم تو شروع ہی سے کہتے تھے کہ پاکستان بن ہی نہیں سکتا اور اگر بن گیا تو قائم نہیں رہ سکتا۔

خدا، اسلام اور پاکستان کو ان کی شر انگیزیوں اور ہوسناکیوں سے محفوظ رکھے۔